प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

# آنند لہر بحیثیت فکشن نگار

## مقالہ برائے:

## پی ایچ ڈی اُردو


مقالہ نگار:
**خالد محمود**
رجسٹریشن نمبر:18HUPH06

نگراں:
**ڈاکٹر عرشیہ جبین**
اسوسیٹ پروفیسر

UNIVERSITY OF HYDERABAD
हैदराबाद विश्वविद्यालय

شعبۂ اردو
اسکول آف ہیومانٹیز
یونی ورسٹی آف حیدر آباد، گچی باؤلی، حیدر آباد، تلنگانہ،500046


اگست 2023ء

# آنند لہر بحیثیت فکشن نگار

# فہرست ابواب


| | | |
|---|---|---|
| پیش لفظ | | ۳ |
| باب اول: | جموں کشمیر میں اردو فکشن کا اجمالی جائزہ | 5 |
| باب دوم: | آنند لہر حیات و خدمات | ۲۴ |
| باب سوم: | آنند لہر کی افسانہ نگاری | ۴۲ |
| باب چہارم: | آنند لہر کی ناول نگاری | ۱۴۸ |
| باب پنجم: | آنند لہر کی ڈراما نگاری | ۲۱۲ |
| اختتامیہ | | ۲۶۳ |
| کتابیات | | ۲۶۹ |

# پیش لفظ

جموں وکشمیر کا دورافتادہ ضلع پونچھ شروع ہی سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔اس سرزمین نے بڑے بڑے ادبا وشعرا کو جنم دیا ہے۔جن میں چراغ حسن حسرت ،ٹھاکر پونچھی، کرشن چندر، شیخ عبداللہ عرف پاپا میاں اور پرت پال سنگھ بیتاب جیسے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔آنند لہر کا تعلق بھی پونچھ کی اسی زرخیز سرزمین سے تھا۔ جہاں انہوں نے اپنے بچپن اور جوانی کے خوبصورت دن گزارے۔آنند لہر ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت ناول نگار،افسانہ نگار، ڈراما نگار، شاعر، سماجی کارکن اور مشہور ومعروف وکیل تھے۔اردو ادب سے انہیں گہرا شغف تھا۔اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود انہوں نے جس ذوق وشوق سے اردو ادب کی خدمات انجام دیں ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ان کی انہیں خدمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے ان کی فکشن نگاری پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کا ارادہ کیا۔اپنی نگراں، صدر شعبۂ اردو اور شعبہ کے دیگر اساتذہ کی منظوری کے بعد میرے مقالے کا عنوان ’’آنند لہر بحثیت فکشن نگار‘‘ طے پایا۔میں نے اپنی نگران کے مشورہ سے اپنے مقالے کو جملہ پانچ ابواب میں منقسم کیا ہے۔

باب اول ’’جموں وکشمیر میں اردو فکشن کا اجمالی جائزہ‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔جس میں جموں وکشمیر میں اردو فکشن کے آغاز وارتقا کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم ’’آنند لہر کی حیات و خدمات‘‘ کے عنوان سے ہے۔اس باب میں آنند لہر کے آباواجداد، ولادت، تعلیم و تربیت، ملازمت، شادی، اولاد، علمی و ادبی سرگرمیاں، ان کی تخلیقات اور انعامات و اعزازات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔

باب سوم ’’آنند لہر کی افسانہ نگاری‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔جس میں ان کے جملہ پانچ افسانوی مجموعوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔اس باب میں آنند لہر کے مختلف النوع موضوعات پر لکھے گئے افسانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے اور افسانے کے فنی لوازمات کے تناظر میں ان کے افسانوں کو پرکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

باب چہارم ’’آنند لہر کی ناول نگاری‘‘ کے عنوان کے تحت ہے۔اس باب میں آنند لہر کے جملہ پانچ ناولوں

کا احاطہ کیا گیا ہے۔جس میں اردو ناول کے فنی رموز کوملحوظ رکھتے ہوئے ان کے ناولوں کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔

باب پنجم ''آنند لہر کی ڈراما نگاری'' کے عنوان سے ہے۔اس باب میں ڈرامے کے فنی لوازمات کی روشنی میں آنند لہر کے ڈراموں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

آخر میں ''اختتامیہ'' کے عنوان سے مقالے کا مجموعی خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔اختتامیہ میں آنند لہر کی اردو فکشن میں خدمات کا اختصار سے جائزہ لیتے ہوئے فکشن کی مختلف اصناف میں ان کی خدمات اور ان کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی سعی کی گئی ہے۔مقالے کے آخر میں کتابیات کے عنوان سے ان کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے مقالہ تحریر کرتے دوران استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔

مقالے کا عنوان طے پانے سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میری نگران، اساتذہ، احباب اور افراد خانہ نے مختلف مرحل پر میری حوصلہ افزائی کی اور اپنے نیک مشوروں سے جا بجا مجھے نوازا۔جس کے لئے میں ان تمام کا شکریہ ادا کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں۔اس ضمن میں، میں سب سے پہلے اپنے خالق حقیقی کا شکر گزار ہوں کہ جس نے مجھے پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کا موقع عنایت فرمایا اور میرے لئے آسانیاں پیدا فرمائیں۔اس کے بعد میں اپنی نگراں ڈاکٹر عرشیہ جبین صاحبہ کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں جنہوں نے مقالے کا عنوان طے پانے سے لے کر مقالے کی تکمیل تک ہر موڑ پر میری رہنمائی فرمائی اور اپنے نیک مشوروں سے مجھے نوازا۔یقیناً ان کی رہنمائی اور مشوروں کے بنا اس مقالے کی تکمیل ناممکن تھی۔صدر شعبۂ اردو اور دیگر اساتذہ کا بھی صمیم قلب سے شکر گزار ہوں جنہوں نے وقتاً فوقتاً میری رہنمائی فرمائی اور اپنے نیک مشوروں سے نوازا۔اپنے جملہ احباب کا بھی شکر گزار ہوں جو ہمیشہ میری مدد کے لئے پیش پیش رہے۔اپنی والدہ ماجدہ کا بے حد ممنون ہوں جن کی نیک تمناؤں اور دعاؤں سے یہ سب ممکن ہو سکا۔میں اپنے بہن بھائیوں کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے ہر وقت میرا ساتھ دیا، میری مدد کی اور نیک دعاؤں سے نوازا۔اپنی اہلیہ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے ہر وقت میرا ساتھ دیا اور اس کام کو مکمل کرنے کے لئے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔

خالد محمود

ریسرچ اسکالر

یونیورسٹی آف حیدرآباد

جولائی ۲۰۲۳ء

# باب اول

# جموں و کشمیر میں اردو فکشن کا اجمالی جائزہ

# جموں وکشمیر میں اردو فکشن کا اجمالی جائزہ

جموں کشمیر میں اردو زبان وادب کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ڈوگرہ عہد سے قبل جموں وکشمیر میں فارسی زبان وادب کا چلن تھا۔۱۸۴۶ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے برطانیوی سامراج سے کشمیر کو خریدااوراس طرح جموں وکشمیر میں ایک نئی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ڈوگرہ حکمرانوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر دہلی اورلاہور کے ساتھ تعلقات قائم کئے۔اس کے علاوہ عام لوگ بھی تجارتی مقاصد سے ہندستان کی دیگر ریاستوں میں آنے جانے لگے۔جن میں دہلی، پنجاب اورلاہوروغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان ریاستوں میں چونکہ اردوزبان کا بول بالا تھالہذا جموں وکشمیر کے لوگوں کوان سے اردوسیکھنے کا موقع ملا۔جموں وکشمیر کی خوبصورتی کے چرچے شروع سے ہی پوری دنیا میں رہے ہیں۔سیروتفریح کے لئے سیاحوں کی آمدورفت کا سلسلہ بڑا قدیم ہے۔ان سیاحوں میں بعض کی بول چال کی زبان اردو تھی۔مقامی لوگوں کوان سے بھی اردوسیکھنے کا موقع ملا۔مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد ڈوگرہ سلطنت کی باگ ڈور مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سنبھالی۔رنبیر سنگھ کوعلم وفنون سے بہت لگاؤ تھا۔ان کے عہد میں اردوزبان کو پھلنے پھولنے کا خاص موقع ملا۔رنبیر سنگھ کے وزیراعظم دیوان کرپارام کوفارسی زبان پر بڑی دسترس حاصل تھی۔وہ کئی فارسی کتابوں کے مصنف تھے اوراردو زبان میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔دیوان کرپارام پہلا شخص تھا جس نے انتظامی صورتحال پراردو میں رپورٹیں مرتب کروائیں اوران کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔مہاراجہ رنبیر سنگھ کوعلم وادب سے خاس دلچسپی تھی۔انہوں نے جموں میں ایک دارالترجمہ قائم کیا۔جس میں سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شائع ہوئیں۔اس کے علاوہ فارسی اور سنسکرت کی کئی کتابوں کے ڈوگری، ہندی اور اردو میں تراجم بھی کئے گئے۔دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمہ کی گئی کتابوں کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا گیا۔جس سے عام لوگوں کی اردو کتابوں تک رسائی ممکن ہوسکی۔اس کے علاوہ رنبیر سنگھ نے بدیابلاس پریس کا قیام بھی عمل کے لایا۔جس کے زیراثر ریاست کا پہلا اخبار''بدیابلاس'' جاری ہوا۔یہ اخبار دیوناگری اوراردودونوں حروف میں شائع ہوتا تھا۔لہذااس اخبار کے ذریعے بھی جموں وکشمیر کے لوگوں کواردوزبان تک رسائی حاصل کرنے کا موقع میسر ہوا۔

اردو سے قبل چونکہ جموں وکشمیر میں فارسی زبان کا چلن تھا۔لہذا ریاست کے قلم کاروں نے اپنی ذہانت کا

ثبوت دیتے ہوئے اس زبان میں اعلیٰ ادب تخلیق کر کے اپنی صلاحیتوں کا بھر پور مظاہرہ کیا۔ جہاں تک اردو زبان و ادب کی بات ہے تو ہمارے قلم کاروں نے یہاں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے اعلیٰ فن پارے تخلیق کر کے اردو ادب میں ایک الگ مقام حاصل کیا۔ جموں کشمیر کے قلم کاروں نے اردو ادب کی لگ بھگ تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ میرا موضوع چونکہ اردو فکشن کے حوالے سے ہے۔ جموں کشمیر میں اردو فکشن کا زیادہ تر سرمایا افسانے کی شکل میں ملتا ہے۔ اردو افسانے کے ابتدائی نقوش ہمیں مولوی محمد دین فوق کے ہاں ملتے ہیں۔ جموں کشمیر میں اردو ادب کے بنیاد گزاروں میں فوق کا نام نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ محمد دین فوق ۱۸۷۷ء میں پیدا ہوئے۔ فوق ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت صحافی، مورخ، تذکرہ نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر اور سفر نامہ نگار تھے۔ فوق نے اگر چہ زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر سے باہر گزارا تاہم انہیں کشمیر سے گہرا لگاؤ تھا۔ جس کا اظہار انہوں نے اپنی تخلیقات میں کیا ہے۔ اردو افسانے کے ابتدائی نقوش ہمیں فوق کے ہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ محمد دین فوق نے کئی چھوٹے چھوٹے تاریخی اور نیم تاریخی قصے لکھے جنہیں ریاست میں اردو افسانے کے ابتدائی نقوش کہا جا سکتا ہے۔ ان کے بعد اس روایت کو پونچھ کے مایا ناز سپوت چراغ حسن حسرت نے آگے بڑھایا۔ چراغ حسن حسرت کا نام اردو ادب میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ ۱۹۰۴ء میں پونچھ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ جن میں تاریخ، صحافت، شاعری اور افسانہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''کیلے کا چھلکا'' ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

جموں کشمیر میں اردو افسانے کی تاریخ میں پریم ناتھ پردیسی کا نام سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ پریم ناتھ پردیسی کا تعلق کشمیری پنڈتوں کے خاندان سے تھا۔ پردیسی ۱۹۰۹ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔ جس کی وجہ سے مفلسی و ناداری اور کئی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد گھریلو ذمہ داریوں نے گھیر لیا جس کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ جس کا افسوس انہیں زندگی بھر رہا۔ شروع کے دن بڑے کسم پرسی کے عالم میں گزرے۔ اس کے بعد محکمہ کسٹم و ایکسائز میں ان کا تقرر ہوا۔ زندگی کے آخری دور میں ریڈیو اسٹیشن سرینگر میں پروگرام اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں انہیں معدے کا السر ہو گیا اور ۴۶ برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

پردیسی کو بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ شاعری سے ادبی زندگی کا آغاز کیا لیکن شاعری ان کی

طبعیت کوراس نہ آئی۔لہذا شاعری ترک کر کے نثر کی طرف رخ کیا اور رومانی کہانیاں لکھنے لگے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''شام وسحر'' کے نام سے شائع ہوا۔اس کے بعد پردیسی نے آہستہ آہستہ رومانوی رنگ ترک کر کے حقیقت پسندی کو اپنایا۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دنیا ہماری'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔یہ ان کی افسانہ نگاری کا دوسرا دور تھا جب وہ رومانیت ترک کر کے حقیقت پسندی کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔ان کہانیوں میں فن کی پختگی صاف دکھائی دیتی ہے۔موضوع اور ہئیت کے اعتبار سے یہ کہانیاں منفرد مقام رکھتی ہیں۔پردیسی نے اپنی کہانیوں میں عام انسان کی ترجمانی کی ہے۔انہوں نے مزدوروں،کسانوں،اور بے بسوں کے استحصال کو پیش کیا ہے۔ان کی کہانیوں کے تیسرے مجموعے کا نام ''بجھتے چراغ'' ہے۔جو ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔اس مجموعے میں شامل تمام تر افسانے فنی بالیدگی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔پردیسی کے افسانے ملک بھر کے ادبی حلقوں میں کافی مشہور ہوئے۔جموں وکشمیر میں اردو افسانہ نگاری کے باب میں ان کے افسانے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔پردیسی نے اپنی کہانیوں میں کشمیریوں کے درد وکرب کو بڑی شدت سے پیش کیا ہے۔اسی لئے انہیں کشمیر کا پریم چند بھی کہا جاتا ہے۔حامدی کاشمیری لکھتے ہیں۔

> ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پردیسی اردو کے ایک مقتدر اور اہم افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے کشمیر کے حوالے سے بالخصوص انسان کے جبلی وجود کی مرقع کاری کر کے اردو افسانے کو مربوط طریقے سے ایک نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔[1]

اس دور کے دیگر افسانہ نگاروں میں تیرتھ کاشمیری کا نام قابل ذکر ہے۔تیرتھ کاشمیری ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔۱۹۲۳ء میں ادبی زندگی کا آغاز کیا۔تیرتھ کاشمیری نے کئی افسانے لکھ کر اردو افسانہ نگاری کو فروغ دیا۔''چندراولی،اندھی ماں،تلاش حق اور پاگل کا خط ان کے مشہور افسانے ہیں۔تیرتھ کے افسانوں کی بھی ادبی حلقوں میں خوب پزیرائی ہوئی۔ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں۔

> ''تیرتھ اپنے افسانوں کے لئے مواد ہر گوشے سے حاصل کرتے ہیں اور اسے نئے نئے انداز واسلوب سے پیش کرتے ہیں۔تاریخ،دساتیر،عام زندگی اور اس کے اخلاقی پہلوؤں کے بارے

میں انہوں نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ ۲؎

اس دور کے دیگر لکھنے والوں میں رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر اور گنگا دھر دیہاتی کے نام قابل ذکر ہیں۔ رامانند ساگر ایک اچھے افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ناول نگار بھی تھے۔ ''اور انسان مرگیا'' ان کا مشہور ناول ہے۔ رامانند ساگر اگرچہ بعد میں جموں وکشمیر سے وابستہ نہ رہے لیکن ان کی ابتدائی کہانیوں میں کشمیر کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ کشمیری لال ذاکر نے کئی کہانیاں لکھ کر اردو افسانہ نگاری کے میدان میں اپنا الگ مقام بنایا۔

۱۹۴۷ء کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک نئی کھیپ ابھر کر سامنے آئی۔ اس کے بعد افسانے میں کئی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ افسانہ نگاروں کی فہرست میں ٹھاکر پونچھی اور موہن یاور کے نام کا اضافہ ہوا۔ ٹھاکر پونچھی کا تعلق پونچھ سے تھا۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں پونچھ کی زندگی کا عکس بھر دیا۔ ٹھاکر پونچھی اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ موہن یاور کا شمار بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ افسانہ کے فن پر انہیں مہارت حاصل تھی۔ کم لفظوں میں اپنی بات مکمل کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا۔ ''سیاہ تاج محل''، ''وسکی کی بوتل'' اور ''تیسری آنکھ'' ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد جموں کشمیر کی سیاست میں ایک نمایاں تبدیلی دیکھنے کو ملی۔ اس کا اثر ادبی زندگی پر بھی پڑا۔ اس کے پیش نظر کئی نئے فن کار میدان میں آئے۔ ان میں اختر محی الدین، دیپک کول، تیج بہادر بھان، وید راہی، علی محمد لون، سومناتھ زتشی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اختر محی الدین کشمیری زبان کے مشہور فن کار تھے لیکن انہوں نے شروع شروع میں اردو افسانے لکھے۔ ان کے افسانوں کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی کہانی ''پونڈ رچ'' بہت مشہور ہوئی۔ مختصر افسانہ کے ایک مقابلے میں یہ کہانی پہلے نمبر پر آئی تھی۔ اختر نے اپنے مشاہدے کی گہرائی اور منفرد اسلوب کی وجہ سے اپنا الگ مقام پیدا کیا تھا۔

اردو افسانہ کے میدان میں تیج بہادر بھان کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ تیج بہادر بھان انو مبر ۱۹۳۱ء کو سرینگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام پنڈت کاشی ناتھ تھا۔ جن کا شمار صاحب ثروت لوگوں میں ہوتا تھا۔ تیج بہادر الگ طبیعت کے انسان تھے۔ روایت سے بغاوت ان کی سرشت میں داخل تھی۔ ہر چیز میں بغاوت کرنا اپنا ایک الگ راستہ نکالنا ان کی طبیعت میں داخل تھا۔ ایف ایس سی تک تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے ٹیکنیکل انجنیئرنگ میں

ڈپلوما حاصل کیا۔اس کے بعد محکمہ آب کاری میں فورمین کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔لکھنے پڑنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ان کا لہجہ بڑا کرخت اور مشاہدہ گہرا تھا۔جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔تیج بہادر بھان نے اردو کی باضابطہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔جس کی وجہ سے ان کی تخلیقات میں املاوغیرہ کی غلطیاں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن پھر بھی ان کی کہانیو ں کو عام لوگو ں میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔شروع میں ''لال چنری'' اور ''سرمایہ دار کا خواب'' جیسی کہانیاں لکھیں۔جن میں فن کی پختگی نظر نہیں آتی تاہم اس کے بعد ان کے ہاں کہانی کا فن نکھر کر سامنے آیا۔ان کی کہانی ''وانکپن'' بڑی مشہور ہوئی اور اس پر انہیں انعام سے بھی نوزا گیا۔ان کے ہاں زیادہ تر نفسیاتی اور سماجی مسائل دیکھنے کو ملتے ہیں۔

دیپک کول کا شمار بھی ایک اچھے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔اگر چہ دیپک کول بعد میں ہندی کی طرف مائل ہو گئے تھے لیکن شروع شروع میں انہوں نے اردو میں لکھا۔اردو زبان پر انہیں کافی دسترس حاصل تھی۔ان کے ہاں ہندی اور اردو کی آمیزش نے اسلوب میں نکھار پیدا کیا ہے۔''شیڈرک کے نام ایک خط''،'' جب گدھ ڈوب گئے، بات کل رات کی، دائرے اور مرکز، تارسوت، بنسی نردوش کا، لون کا پاپی پجاری، سکھ کا ساحل اور بت شکن ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔

پشکر ناتھ ۱۹۳۲ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کرنے کے بعد جموں یونی ورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد اکاؤنٹینٹ جنرل کے دفتر میں ملازم ہو گئے۔جہاں مختلف عہدوں پر فائز ہونے کے بعد وہیں سے سبکدوش ہوئے۔بچپن سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔افسانہ نگاری سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔پشکر ناتھ نے 'دشت تمنا'' کے نام سے ایک ناول بھی لکھا ہے لیکن زیادہ تر ان کی طبیعت کو افسانہ راس آیا۔اس لئے افسانے کے میدان میں ہی انہوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھانے کی کوشش کی۔

جموں و کشمیر میں اردو افسانہ نگاروں کی فہرست میں پشکر ناتھ کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ان کے چار افسانوی مجموعے ''اندھیرے اجالے''،''دل کے باسی''،''عشق کا چاند'' اور ''کانچ کی دنیا'' زیورطبع سے آراستہ ہو کر ادبی دنیا میں مقبول ہوئے۔رومان نگار کی حیثیت سے ادبی زندگی کا آغاز کیا لیکن بعد میں کشمیر کی زندگی کے درد وکرب کو اپنے عمیق مشاہدے اور منفرد اسلوب کی مدد سے پیش کیا۔

جموں کشمیر میں اردو افسانہ کو فروغ دینے میں ایک بڑا نام نور شاہ کا ہے۔نور شاہ کی پیدائش ۹ جولائی ۱۹۳۶ء

میں ڈل گیٹ سرینگر میں ہوئی۔۲۲ سال کی عمر میں ''ملنی'' کے نام سے کہانی لکھ کر ادبی زندگی کا آغاز کیا۔نور شاہ کا شمار جموں وکشمیر کے نامور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔نور شاہ اگر چہ بنیادی طور پر شاعرانہ ذہن رکھتے تھے تاہم اپنے شاعرانہ اسلوب سے انہوں نے افسانے کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔افسانے کے فن پر انہیں دسترس حاصل ہے۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے لگتا ہے کہ وہ انسانی نفسیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔انہوں نے مختلف موضوعات پر کئی افسانے لکھ کر افسانہ کے باب میں اضافہ کیا ہے۔ان کے مشہور افسانوں میں ''بے گھاٹ کی ناؤ،من کا آنگن،ویرانے کے پھول،ایک رات کی ملکہ،پتھروں کی مہک،بے ثمر سچ،آسمان پھول اورلہو،اداس اداس اور گیلے پتھر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔نور شاہ ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ان کی کہانیاں فنی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہیں۔وہ اپنے عمیق مشاہدے اور منفرد اسلوب کے ساتھ اردو افسانے کو فروغ دے رہے ہیں۔

حامدی کاشمیری کا شمار جموں کشمیر کے بلند پایا قلم کاروں میں ہوتا ہے۔وہ بیک وقت افسانہ نگار،ناول نگار،ڈراما نگار،شاعر،سفر نامہ نگار،محقق،نقاد اور استاد بھی تھے۔حامدی ۱۹۳۲ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم مقامی اسکولوں سے مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں ایم اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۵۸ء میں ایم اے اردو کی ڈگری امتیازی حیثیت سے حاصل کی۔شروع میں ایس پی کالج میں لیکچرار کے عہدے پا فائز ہوئے۔۱۹۶۲ء میں کشمیر یونی ورسٹی میں ان کا تقرر ہوا۔حامدی کاشمیری نے ''جدید اردو نظم اور یورپی اثرات'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد کشمیر یونی ورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔حامدی کاشمیری کشمیر یونی ورسٹی میں شیخ الجامعہ کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ان کا اصل میدان اگر چہ شاعری اور تنقید تھا تاہم اردو فکشن کے میدان میں بھی انہوں نے اپنا لوہا منوایا ہے۔حامدی نے اپنی گراں قدر خدمات کی بدولت اردو ادب میں الگ مقام حاصل کیا ہے۔ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔وادی کے پھول،برف میں آگ،اور سراب ان کے افسانو ں کے مجموعے ہیں۔حامدی نے سیاسی وسماجی مسائل کو اپنے افسانوں میں اپنے شاعرانہ اسلوب میں پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر برج پریمی ایک معروف قلم کار تھے۔وہ ۱۹۳۵ء میں سرینگر میں پیدا ہوئے۔برج پریمی ایک منجھے ہوئے کہانی کار تھے۔۱۹۴۹ء میں انہوں نے اپنی پہلی کہانی ''آقا'' کے نام سے لکھی۔برج پریمی ایک مشہور محقق اور نقاد تھے۔انہوں نے ۱۹۷۶ء میں ''سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر کشمیر یونی

ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس مقالے کوادبی حلقوں میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔اردوادب کے تئیں ان کی خدمات کے پیش نظرانہیں کئی انعامات سے بھی نوازا گیا۔ہنسی کی موت ،سپنوں کی شام ،اور چلمن کے سایوں میں ان کے مشہورافسانے ہیں۔اس دور کے دیگر کہانی کاروں میں برج کتیال ،مخمور بدخشی ،ہری کرشن کول قابل ذکر ہیں۔

۱۹۶۵ء کے بعد لکھنے والوں میں عمر مجید،کشوری منچندہ ،وریندر پٹواری ،شمس الدین ،مالک رام آنند،لیش سروج،ڈی کے کنول،راجیش گوہر،کلدیپ رعنا،موتی لال کپور،جوتیشور اور شبنم قیوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کے بعد آنند لہر ،پروفیسر ظہورالدین ،کے ڈی مینی ،شفق سوپوری ،دیپک بدکی ،ڈاکٹر نصرت چودھری ،وغیرہ نے اس روایت کوفروغ دیا۔عصر حاضر میں بہت سارے قلم کاراس میدان میں اپنے جوہر دکھارہے ہیں جن میں نورشاہ ،شفق سوپوری ،مشتاق وانی ،خالد حسین ،ریاض توحیدی ،کے ڈی مینی ،دیپک بدکی ،وریندر پٹواری وغیرہ اس روایت کو فروغ دے رہے ہیں۔جس سے جموں کشمیر میں اردوافسانے کا مستقبل تابناک نظرآتا ہے۔

جموں کشمیر میں اردوناول کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔افسانے کی نسبت ناول کی تاریخ اتنی روشن نہیں ہے۔ریاست کے قلم کاروں نے ناول کی نسبت اردوافسانے پرزیادہ توجہ دی۔پنڈت سالگ رام سالک اور مولوی محمد دین فوق کا نام جموں کشمیر میں اردوفکشن کے آغاز میں بڑااہم رول ادا کرتے ہیں۔چنانچہ بیسویں صدی کے ابتدا میں سالگ رام سالک اور محمد دین فوق نے ناول کی طرف توجہ دی اور کچھ قصے لکھ کراس صنف کی بنیاد ڈالی۔سالگ رام سالک نے ''داستان جگت روپ'' اور ''تحفۂ سالک'' لکھ کراس صنف کی بنیاد ڈالی۔یہ تصانیف قطعی طور پر ناول کے فن پر کھری نہیں اترتی تاہم ناول کی کچھ خصوصیات ان میں مل جاتی ہیں۔اس لئے انہیں ناول کے ابتدائی نقوش کہا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر برج پریمی جموں کشمیر میں اردوناول کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''انیسویں صدی کے اواخراور بیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے ناول نگاری کی شروعات پنڈت سالگ رام سالک اور مولوی محمد دین فوق نے کی۔سالگرام سالک نے ''داستان جگت روپ'' اور تحفہ سالک'' تصنیف کر کے نثر کے اس شعبے کی طرف توجہ کی۔اگر چہ یہ تصانیف قطعی طور پر ناول کے زمرے میں شامل نہیں کی جاسکتیں۔لیکن

ان میں قصے کی مہک ہے۔''۳۲

مولوی محمد دین فوق کے ہاں اس سے بہتر کوششیں ملتی ہیں ۔فوق کی تصانیف ایک سو کے لگ بھگ ہیں۔انہوں نے کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے بھی لکھے ہیں۔جن میں سے بعض قصوں پر ناول کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔''اکبر''اور''انارکلی''ان کے دو تاریخی قصے ہیں جن کو ہم جموں وکشمیر میں اردو ناول کے ابتدائی نقوش کہہ سکتے ہیں۔فوق کا ناول انارکلی ایک دلچسپ ناول ہے۔جو ۱۹۰۰ء میں لاہور سے شائع ہوا۔یہ ایک تاریخی ناول ہے جس کا پلاٹ فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہے۔ اس کے علاوہ فوق کے اور ناول بھی منظر عام پر آئے جن میں ناکام ناصح ،مشفق ،غریب الدیار، نیم حکیم اور اکبر قابل ذکر ہیں۔اکبر ایک تاریخی ناول ہے۔جو ۱۹۰۹ء میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔یہ ریاست میں اردو ناول کا ابتدائی زمانہ تھا۔اس دور میں کوئی بھی قابل قدر ناول تخلیق نہ ہو سکا۔جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت جموں وکشمیر میں کسی بھی اخبار کی اشاعت نہیں ہو رہی تھی۔تخلیقات کی اشاعت کا کوئی معقول بندوبست نہ تھا۔جس کی وجہ سے لوگوں کے اندر لکھنے کا ماحول ابھی نہیں بنا تھا لیکن بعد میں جب جموں سے ہفت روزہ ''رنبیر'' کی اشاعت عمل میں آئی تو کئی قلم کاروں نے لکھنا شروع کیا۔دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ ناول کی طرف بھی توجہ مرکوز کی گئی۔قسط وار ناول چھپنا شروع ہوئے جس سے ناول نگاری کو فروغ ملا۔اس دور کے لکھنے والوں میں وشوا ناتھ درما، موہن لال مارواہ، شنبھو ناتھ ناظر اور پنڈت نند لال بے غرض کے نام قابل ذکر ہیں۔نند لال بے غرض کا ناول ''تازیانہ عبرت'' بہت مشہور ہوا۔

پریم ناتھ پردیسی نے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کی طرف بھی توجہ دی۔انہوں نے ایک ناول ''پوتی'' کے عنوان سے لکھا تھا۔جو انہوں نے اشاعت سے قبل لاہور کے ایک پریس میں بھیج دیا تھا۔یہ ناول قومی کتب خانہ لاہور کے زیر اہتمام شائع کیا گیا تھا۔لیکن ملک کی تقسیم کے دوران تلف ہو گیا۔اس دور کے اہم فکشن نگاروں میں رامانند ساگر کا نام قابل ذکر ہے۔رامانند ساگر کا ناول ''اور انسان مر گیا'' بڑا اہم ناول ہے۔جس کو ادبی دنیا میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر لکھا گیا یہ ناول ادبی حلقوں میں کافی عرصہ تک موضوع بحث رہا۔خواجہ احمد عباس اس ناول کے پیش لفظ میں رامانند ساگر کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

''یہ ہنگامی لٹریچر نہیں ایک کلاسیک ہے۔اس کے قلم سے نکلے ہوئے

الفاظ مرتی ہوئی انسانیت کی صدائے بازگشت ہے۔۔۔۔۔اس میں
آپ خوب پہچان لیں گے کہ انسانیت کی مرنے کے بعد شکل کیا ہوجاتی
ہے۔''[۱۴]

پریم ناتھ پردیسی کے بعد اردو ناول کو فروغ دینے میں نرسنگھ داس نرگس کا نام بھی قابل ذکر ہے۔نرگس ایک قابل قدر افسانہ نگار، ناول نگار اور صحافی تھے۔انہوں نے کئی ناول لکھے جن میں ''پاربتی'' اور ''نرملا'' مشہور ہوئے۔دیہات سے نرگس کو خاص رغبت تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں بھی دیہاتی زندگی کے مسائل کو مرکزیت حاصل ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد نئی نسل کے ناول نگاروں کی ایک کھیپ ابھر کر سامنے آئی۔جن میں کاشی ناتھ ترچھل، کشمیری لال ذاکر اور ٹھاکر پونچھی کے نام اہم ہیں۔یہ لوگ اگر چہ ۱۹۴۷ء سے قبل لکھ رہے تھے تاہم اس کے بعد انہوں نے اپنے فن کو مزید نکھارا اور کئی اہم ناول ان کے قلم سے نکلے۔کشمیر سے تعلق رکھنے والے کاشی ناتھ ترچھل نے ''گوری شنکر'' کے عنوان سے ایک ناول لکھا تھا۔جس کا شمار ریاست کے اہم ناولوں میں ہوتا ہے۔کاشی ناتھ ایک منجھے ہوئے ناول نگار تھے اور اردو ادب کی آبیاری بڑی دل لگی سے کر رہے تھے لیکن عین جوانی میں ان کا انتقال ہوگیا۔

کشمیری لال ذاکر نے ایک چھوٹا سا ناولٹ ''سیندور کی راکھ'' لکھ کر ناول نگاری کی شروعات کی۔اس کے بعد انہوں نے کئی ناول لکھے۔جن میں انگوٹھے کا نشان ،دھرتی سدا سہاگن ،کرماں والی لمحوں میں بکھری زندگی، جاتی ہوئی رت، خون پھر خون ہے، ڈوبتے سورج کی کتھا، چار میل لمبی سڑک اور میں اسے پہچانتی ہوں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کے کئی ناول کشمیر کے پس منظر میں ہیں۔ذاکر نے اچھوتے موضوعات کو چھوا ہے۔کشمیری لال ذاکر نے کئی کامیاب ناول یادگار چھوڑے ہیں۔

اسی دور کے اہم ناول نگار ٹھاکر پونچھی ہیں۔ٹھاکر پونچھی نے کئی کامیاب افسانے بھی لکھے ہیں لیکن ان کو شہرت اردو ناول نے بخشی۔ٹھاکر پونچھی کو ناول کے فن پر گہری دسترس حاصل تھی۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وادیاں اور ویرانے، رات کے گھونگٹ ،شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک، پیاسے بادل، یادوں کے کھنڈر، زلف کے سر ہونے تک، چاندنی کے سائے اور اب میں وہاں نہیں رہتا جیسے ناول تخلیق کر کے اردو ناول نگاری کے باب میں

اضافہ کیا ہے۔ٹھاکر پونچھی نے اپنے ناولوں میں ڈوگرہ طرز زندگی کی عمدہ عکاسی کی ہے۔اس کے علاوہ اخلاقی قدروں کی گراوٹ، نئی اور پرانی قدروں کے درمیان کشمکش اور سیاسی وسماجی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔عبدالقادر سروری اپنی کتاب ''کشمیر میں اردو'' میں ٹھاکر پونچھی کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''ٹھاکر کے افسانوں اور ناولوں میں بیانات کی دلچسپ تفصیلات اور اثر اس وجہ سے نمایاں ہے کہ وہ عموماً اپنی جانی بوجھی فضاؤں، شناسا ماحول اور جانے پہچانے اشخاص سے متعلق لکھتے ہیں۔ان کے مرقعوں میں حقیقت کی پوری جھلک بھی اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔پریم چند کے انداز فکر پر ٹھاکر کا اثر گہرا ہے۔''۵

ٹھاکر پونچھی کا شمار نہ صرف جموں وکشمیر بلکہ اردو ادب کے بلند پایہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔جموں کشمیر کے غیر مسلم ناول نگاروں میں ٹھاکر پونچھی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔۱۹۶۰ء کے بعد جموں وکشمیر میں افسانے کے ساتھ ساتھ ناول نگاری کی طرف خاص توجہ دی گئی۔اس دوران نئی نسل سے تعلق رکھنے والے کئی نوجوان قلم کار ابھر کر سامنے آئے۔جنھوں نے ترقی پسند ناول نگاروں کی روش سے ہٹ کر اپنے عہد کے تقاضوں کی ناولوں میں عکاسی کرنی شروع کی اور جذباتیت اور نعرہ بازی سے اجتناب کیا۔اس دور کے ناول نگاروں میں تیج بہادر بھان کا ذکر خاص طور پر کیا جاسکتا ہے۔تیج بہادر بھان کشمیری برہمن تھے۔وہ ۱۹۳۱ء میں حبہ کدل سرینگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔تیج بہادر بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے لیکن انہوں نے ایک اہم ناول لکھ کر اردو ناول نگاری کا بھی حق ادا کیا ہے۔''سیلاب اور قطرے'' ان کا مشہور ناول ہے۔جو جھیل ولر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں سنگھاڑے بیچنے والے ایک غریب خاندان کی روداد کو حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کشمیر کے خوبصورت مناظر کی بھی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔بھوشن لال بھوشن بھی اسی دور کے ناول نگار ہیں۔ان کے بارے میں زیادہ معلومات میسر نہیں ہے تاہم عبدالقادر سروری نے ''کشمیر میں اردو'' میں ان کے ایک ناول ''صرف پانچ ہزار'' کا ذکر کیا ہے۔اس ناول میں امیر اور غریب کی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔

اردو ناول نگاری کے میدان میں وجے سوری کا نام بھی قابل ذکر ہے۔وجے سوری ۱۹۴۲ء میں میر پور پاکستان میں پیدا ہوئے لیکن ۱۹۴۷ء میں ان کا خاندان ہجرت کر کے جموں میں سکونت پزیر ہوا۔وجے سوری نے

یہیں اپنی زندگی گزاری اور ۲۰۰۴ء میں جموں میں ہی ان کا انتقال ہوا۔انہوں نے افسانہ اور ناول دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔اگرچہ ان کی شہرت کا باعث ان کے افسانے بنے تاہم انہوں نے ''کاغذ کی ناؤ'' کے نام سے ایک ناول بھی لکھا ہے۔یہ ایک رومانی ناول ہے جس میں دو روحوں کی آپسی محبت اور سماج میں مذہب وجت ،ذات پات اور رنگ ونسل کی بنیاد پر ان کی محبت میں ناکامی ومحرومی کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔اسی دور کے ایک اور ناول نگار اوپی شرما ہیں۔ان کا اصل نام اوم پرکاش سارتھی شرما تھا۔اوم پرکاش افسانہ نگار، ناول نگار،شاعر اور مصور بھی تھے۔تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہوئے تھے جہاں محض پانچ سال گزارنے کے بعد ملازمت کو ترک کر دیا۔اس کے بعد جموں ریجنل ریسرچ لیبارٹری میں بطور مصور کام کرتے رہے۔اردو افسانہ سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔اوپی شرما کا ایک ہی ناول ہے جو''ترہیہ سمندری'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔اس ناول کا ہندی میں ''پرکاش کی اور'' کے نام سے ترجمہ ہوا ہے۔

پشکر ناتھ بنیادی طور پر افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔لیکن ان کا ناول ''دشت تمنا'' ناول کے معیار پر کھرا اترتا ہے۔اس ناول میں پشکر نے شعور کی رو کی تکنیک استعمال کی ہے۔ان کا مشاہدہ بہت وسیع تھا جس کا اندازہ ان کی کہانیوں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ان کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے برج پریمی لکھتے ہیں۔

> ''پشکر کا مشاہدہ عمیق ہے۔وہ فلسفہ نہیں بکھارتے اور نہ سیاست کے کرتب دکھاتے ہیں۔وہ روزمرہ کی زندگی سے اپنی کہانیوں کا مواد اخذ کرتے ہیں۔ان کو بیان پر قدرت حاصل ہے جس کی مدد سے انہوں نے خوب سے خوب تر لکھا ہے۔پشکر نے اپنے طویل تخلیقی سفر میں فارم کے کئی تجربے کیے ہیں۔کئی کہانیاں انہوں نے ناول کی تکنیک میں لکھی ہیں۔اور بعض میں داستانی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔''[۶]

غلام رسول سنتوش بنیادی طور پر مصور ہیں۔انہوں نے کشمیری اور اردو میں شاعری بھی کی ہے۔انہوں نے اردو میں چند افسانے تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ناول بھی لکھا ہے۔جس کا عنوان ''سمندر پیاسا ہے'' ہے۔جموں کشمیر میں اردو ناول کی روایت کو آگے بڑھانے میں علی محمد لون کا نام بھی قابل ذکر ہے۔افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ادبی دنیا میں خوب جانے جاتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ ایک اچھے ڈراما نگار بھی تھے۔افسانہ اور ڈراما

کے علاوہ انہوں نے ایک ناول بعنوان ''شاید ہے تیری آرزو'' لکھا ہے۔اس ناول میں لون نے دہلی کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔

مالک رام آنند کا تعلق جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ سے تھا۔مالک رام ۵ مئی ۱۹۳۹ء میں پونچھ میں پیدا ہوئے۔بچپن ہی سے ادب کے ساتھ دلچسپی تھی۔انہیں شاعری کا بے حد شوق تھا جس کی وجہ سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا۔بعد میں افسانہ اور ناول کی طرف متوجہ ہوئے۔مالک رام ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے جس کا عکس ان کی تخلیقات پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ان کے ناولوں میں حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ رومانیت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔مالک رام کو ناول کے فن پر دسترس حاصل تھی۔ان کا پہلا ناول ''نئے خدا'' کے عنوان سے ۱۹۵۸ء میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر ادبی دنیا میں مقبول ہوا۔اس کے علاوہ ان کے دیگر ناولوں میں ''دہکتے پھول،شبنم آنکھیں،صلیب اور دیوتا،اور اپنے وطن میں اجنبی قابل ذکر ہیں۔ان کا ایک ناولٹ ''نئے دن پرانے سال'' ہے۔مالک رام آنند ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے۔ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔جن میں پیار اور ترازو،عشق ہو گیا،عشق میں پھول نہیں،جانے وہ کیسے لوگ تھے،شہر کی خوشبو،اور تصویر کے پھول،بہت مشہور ہوئے۔مالک رام آنند کو اردو ناول نگاری کے فن پر کافی دسترس حاصل تھی۔ان کا شمار جموں وکشمیر کے بلند پایہ ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔

مالک رام آنند کے بعد جموں کشمیر میں اردو ناول نگاری کو فروغ دینے میں نور شاہ،غلام رسول سنتوش حامدی کاشمیری،کرن کاشمیری،ڈی کے کنول اور جان محمد آزاد کے نام قابل ذکر ہیں۔نور شاہ بنیادی طور پر اردو افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن انہوں نے کئی کامیاب ناول بھی لکھے ہیں۔ان کے ناولوں میں پائل کے زخم،نیلی جھیل کالے سائے،آدھی رات کا سورج،لمحے اور زنجیریں،قفس اداس ہے،اور آؤ سو جائیں،خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ نور شاہ نے ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ان کے ریڈیائی ڈراموں میں ''میرے دکھ کی دوا کرے کوئی،امراؤ جان اور میراں جی شامل ہیں۔

حامدی کاشمیری ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت افسانہ نگار،ناول نگار،ڈراما نگار،شاعر،محقق اور نقاد بھی تھے۔اگر چہ شاعری اور تنقید ان کا اصل میدان تھا تاہم انہوں نے اردو ناول کی طرف بھی توجہ مرکوز کی۔''پرچھائیوں کا شہر'' ان کا مشہور ناولٹ ہے۔

جموں کشمیر کے ناول نگاروں میں ایک اہم نام کرن کاشمیری کا بھی ہے۔کرن کاشمیری کا اصل نام دیوراج

چوپڑا تھا لیکن وہ کرن کاشمیری کے نام سے لکھتے تھے۔کرن ۱۹۴۳ء میں جموں میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم جموں سے حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونی ورسٹی سے بی اے کا امتحان پاس کیا۔کرن کاشمیری کو صحافت سے دلچسپی تھی۔انہوں نے اپنا ایک رسالہ ''سنگم'' کے نام سے نکالا تھا۔کرن کاشمیری پہلے محکمہ اطلاعات میں ملازم ہوئیلیکن اس پیشے کو جلدی ترک کر دیا اور اس کے بعد فوج میں بھرتی ہو گئے۔چند سال فوج میں اپنی ذمہداری نبھانے کے بعد آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ منسلک ہو گئے۔جہاں سے ۱۹۹۲ء میں سبکدوش ہوئے۔کرن کاشمیری کا انتقال ۲۰۰۷ء میں دہلی میں ہوا۔

کرن کاشمیری کو اردو ادب سے گہری دلچسپی تھی۔کئی افسانے لکھ کر اردو دنیا میں نام کمایا۔اس کے علاوہ انہوں نے دو ناول بھی یادگار چھوڑے ہیں۔ان کا پہلا ناول ''ڈابوں کے قافلے'' ہے۔دوسرا اور مشہور ناول ''رات اور زلف'' ہے۔یہ ناول ۱۹۸۲ء میں لکھا گیا اور ادبی دنیا میں بہت مشہور ہوا۔اس کی وجہ سے کرن کاشمیری کو بہت شہرت نصیب ہوئی۔افسانہ نگار اور ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ کرن کاشمیری ایک اچھے شاعر بھی تھے۔

عصر حاضر میں بہت سارے تخلیق کار اس میدان میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔جن میں شفق سوپوری، دیپک بدکی، عبدالغنی شیخ، پرویز مانوس، نیلوفر ناز نحوی، فاروق رینزو، رافعیہ رسول وغیرہ شامل ہیں۔شفق سوپوری کا نام اردو شاعری کے میدان میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے افسانہ اور ناول کے میدان میں بھی اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ان کا پہلا ناول ''نیلیما'' بہت مشہور ناول ہے۔ان کے دیگر ناولوں میں ''دریا ہے چشم گریہ ناک''''فائرنگ رینج'' اور ناولٹ ''موسیٰ'' شامل ہیں۔

دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ جموں کشمیر میں اردو ڈراما کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے۔جموں و کشمیر میں اردو ڈرامے کے ابتدائی نقوش بھانڈوں کے یہاں ملتے ہیں۔بھانڈ ایک مخصوص طبقے کے لوگ تھے جو گانے بجانے نقل اتارنے اور روپ بدلنے میں ماہر تھے۔وہ اپنے ہنر سے شادی بیاہ اور دیگر تہواروں پر لوگوں کو کھیل دکھا کر محظوظ کرتے تھے۔یہ لوگ بطور پیشہ یہ کام انجام دیتے تھے۔بڑے حاضر جواب ہوا کرتے تھے اور مکالموں کی ادائیگی پر انہیں خاص دسترس حاصل تھی۔بھانڈوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں۔

''بھانڈ بہروپ بدلنے میں بھی ماہر تھے اور بڑے حاضر جواب بھی تھے
۔ان کے خوبصورت لڑکے زنانہ کردار ادا کرتے تھے۔شاہی محفلوں

میں بھی یہ لوگ اپنے کرتب کا مظاہرہ کرتے تھے۔نقلوں کی ان محفلوں
کو ڈرامے کے زمرے میں شامل نہ کرتے ہوئے رد بھی نہیں کیا جا
سکتا۔ڈرامے کی تشکیل وتہذ ہب میں ان محفلوں اہم رول رہا ہے۔اس
سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ بھانڈ جو کشمیر الاصل تھے بہت پہلے سے
اس فن میں ماہر تھے۔ ے

بھانڈوں کی ان نقلوں کو ڈرامے کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا تاہم ڈرامے کی طرح بعض خصوصیات ان میں پائی جاتی تھیں ۔ بھانڈ جگہ جگہ گھوم کر لوگوں کو کھیل دکھاتے تھے اور تفریح کا سامان فراہم کرتے تھے۔مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں اس شعبہ میں خاص تبدیلی دیکھنے کو ملی۔مہاراجہ کے دور حکومت میں ریاست کے باہر سے راس لیلا کی کئی پارٹیاں ریاست میں آئیں۔جو شروع شروع میں مذہبی مقاصد کے پیش نظر قصے اور کہانیوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کرتے تھے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی رونما ہوئی اور سماجی مسائل بھی اس میں پیش کئے جانے لگے۔آہستہ آہستہ ڈراما لیلاؤں اور نیلاؤں کے اثر سے باہر آنے لگا۔یہ اس زمانے کی بات ہے جب پارسی تھیٹر کی بڑی دھوم دھام تھی۔آغا حشر کاشمیری، طالب بنارسی، ماسٹر رحمت علی اور احسن لکھنوی جیسے ڈراما نگار اردو ڈرامے کی افق پر چھائے ہوئے تھے۔اسی دور میں پہلے جموں شہر اور پھر سرینگر میں چند تھیٹر کمپنیاں آئیں۔جن کو ڈوگرہ مہاراجوں کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ریاست میں انگریزی، ہندی اور بنگالی کے ناٹک اردو میں پیش کئے گئے۔راس لیلا پارٹیوں نے جب جموں وکشمیر میں مختلف ڈرامے اسٹیج کئے تو ان کو دیکھ کر مقامی لوگوں کے اندر بھی جذبہ پیدا ہوا۔لہذا جموں وکشمیر کے کئی نوجوانوں نے بھی اس شعبے میں اپنی صلاحتوں کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔اردو ڈرامے کے سلسلے میں جموں کشمیر میں پہلی کوشش خطہ جموں میں ہوئی۔ جہاں محمد عمر و نور الٰہی نے اس طرف توجہ دی۔جن کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں۔

''جب راس لیلا پارٹیاں جموں اور سرینگر آکر ڈرامے اسٹیج کرنے لگیں
اور انہیں مقبولیت حاصل ہوئی تو ہمارے نوجوانوں نے بھی اس شعبے
میں اپنی صلاحتیں آزمانے کے مواقع تلاش کیے۔اس سلسلے، میں بنیادی
کوششیں جموں میں ہوئی جہاں محمد عمر نور الٰہی ساحبان کی جوڑی نے

اسٹیج اور ڈراما کے ساتھ اپنی بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ انہوں نے نہ صرف خود ناٹک لکھے بلکہ اردو زبان میں ڈراما کی پہلی تاریخ اور تنقید ناٹک ساگر کے عنوان سے لکھی جو ۱۹۲۴ء لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب آج تک اردو ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔۸

محمد عمر اور نورالٰہی کا نام نہ صرف جموں وکشمیر میں اردو ڈرامے کو فروغ دینے میں خاص اہمیت رکھتا ہے بلکہ اردو ڈرامے پران کا کام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔انہوں نے کئی ڈرامے تصنیف وتالیف کئے جن میں بعض دیگر زبانوں سے ماخوذ ہیں۔۱۹۳۳ء میں دینا ناتھ نے ''رکمنی ہرن'' کے نام سے ایک ڈراما لکھا جو اخبار ''مارتنڈ'' میں شائع ہوا لیکن اسٹیج نہ ہوسکا۔اس کے بعد خطہ جموں سے تعلق رکھنے والے جگدیش کنول، آذر عسکری اور عزیز کاش کے نام قابل ذکر ہیں۔جنہوں نے اس صنف کو فروغ دیا۔انہوں نے ''پردے کے پیچھے'' ''چار سو بیس'' اور ''نوشتۂ تقدیر'' جیسے ڈرامے لکھ کر اردو ڈراما نگاری کے باب میں اپنا نام درج کرایا۔

خطہ کشمیر میں گاؤ کدل کے مقام پر ایک اسٹیج قائم کیا گیا۔ جہاں ایک ڈراما کمپنی کا وجود عمل میں آیا۔اس کمپنی کے زیر اہتمام کئی ڈرامے اسٹیج ہوئے۔اس کمپنی میں زنانہ کردار ادا کرنے کے لئے بیرون ریاست سے کچھ اداکارائیں رکھی گئیں تھیں۔اردو ڈراما کو فروغ دینے میں یہ کمپنی نہایت اہم ثابت ہوئی تھی تاہم کچھ سیاسی اور سماجی مسائل اس کمپنی کی راہ میں رکاوٹ بنے جس سے یہ دیر تک اپنا وجود قائم نہ رکھ سکی۔تھیٹر کو جموں وکشمیر میں آگے بڑھانے میں اپٹا کا بڑا اہم رول رہا ہے۔مشہور اداکار بلراج ساہنی کی ایما پر اپٹا کی ایک شاخ یہاں بھی قائم کرنے کی کوشش کی گئی۔جس کے لئے پریم ناتھ پردیسی نے ایک ڈراما کشمیری میں لکھا۔یہ ڈراما سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ضبط کرلیا گیا تاہم اس سے اردو ڈرامے کو ایک تحریک ملی۔

۱۹۴۷ء میں جب ملک آزاد ہوا تو اس کے فوراً بعد فرقہ وارانہ فسادات پیدا ہوئے۔ملک کا بٹوارہ ہوا، ہر طرف بدامنی اور بے چینی کا موحول پیدا ہوا۔جس سے کشمیر بھی متاثر ہوا۔آزادی کے فوراً بعد کشمیر پر قبائلی حملے ہوئے۔ ہر طرف خوف اور دہشت کا ماحول بن گیا۔اسی دوران ریاست کے قلم کاروں نے عوام کو حوصلہ دینے کے لئے کلچرل فرنٹ کے نام سے ایک ثقافتی محاذ کو تشکیل دیا۔اس فرنٹ نے ڈرامے کو ایک نئی تحریک بخشی۔ باضابطہ طور پر

ڈرامے لکھے اور اسٹیج ہونے لگے۔ پہلی بار ڈراما ''کشمیر یہ ہے'' اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ یہ ڈراما اردو میں پیش کیا گیا۔ اس دوران بہت سے ڈرامے لکھے گئے۔ تھیٹر سے تعلق رکھنے والے ڈراما نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی، محمود ہاشمی، راج ہنس، دینا ناتھ نادم، علی محمد لون، قیصر قلندر، صلاالدین حمد، گردھاری دھر، موہن لال ایما وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ محمود ہاشمی نے کئی ڈرامے لکھے۔ اسی دوران ریڈیو کشمیر سرینگر کا وجود عمل میں آیا۔ کئی ڈرامے ریڈیو سے نشر کئے گئے۔ جموں اور سرینگر دونوں جگہوں پر ریڈیو کے قیام نے ڈرامے کی ترویج و ترقی میں اہم رول ادا کیا۔ کئی ڈرامے نشر کئے گئے۔ ریڈیو سے نشر کرنے کے لئے نئے نئے موضوعات پر نئی تکنیک کے ساتھ کئی ڈراما نگاروں نے ڈرامے تخلیق کیے۔ جن میں نمایاں نام اختر محی الدین، رام کمار ابرول، ٹھاکر پونچھی، سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، سکھ دیو سنگھ، وجے سمن، پشکر ناتھ، وجے سوری، جتندر شرما، وید راہی اور شبنم قیوم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس دور کے اہم ڈراموں میں جہاں گیر کی موت، سورگ کی کھوج، پرانے دیپ نئے اجالے، انگ مان، انسان جیت گیا، دھرتی اور ہم اور چکی کے پاٹ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز نے بھی اردو ڈرامے کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام کئی ڈراما کلب وجود میں آئے۔ جن کی اکیڈمی نے مالی امداد کی۔ جس سے کئی ڈراموں کو اسٹیج کرنے میں فنکاروں کی حوصلہ افزائی ہوئی اور ڈراما لکھنے والوں کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی اور ان کو اپنی صلاحتوں کو ابھارے کا مذید موقع ملا۔ خطہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے ڈراما نگاروں میں شکیل احمد، آفاق احمد، سوم ناتھ زتشی، بنسی نردوش، ہری کرشن کول، حامدی کاشمیری، اور فاروق مسعودی وغیرہ کے ڈرامے بہت مقبول ہوئے۔ علی محمد لون کا ڈراما ''گھروندے'' بہت مشہور رہا۔ اس کے علاوہ ان کے دو اور ڈرامے ''دیوانے کا خواب'' اور ''چٹان'' بہت عمدہ ڈرامے ہیں۔ بہت سارے ڈراما نگاروں نے عمدہ ڈرامے پیش کر کے اردو ڈراما نگاری کے باب میں اضافہ کیا۔ شائع شدہ ڈراموں کو وہ اہمیت نہ مل سکی جو اسٹیج ڈراموں کو حاصل ہوئی تاہم جموں کشمیر میں شائع شدہ ڈراموں کے ساتھ ساتھ دوسرے ڈرامے بھی پیش کئے گئے۔ جموں کشمیر میں شائع شدہ ڈراموں کی اچھی خاصی تعداد ہے اور عصر حاضر میں بھی ریڈیو کے لئے بعض قلم کار ڈرامے لکھ رہے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو جموں و کشمیر کے قلم کاروں نے اردو فکشن کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کر کے اردو ادب کو فروغ بخشا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو افسانہ لکھا جانے لگا۔ کئی افسانہ نگاروں

نے کامیاب افسانے لکھ کر جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی داغ بیل ڈالی۔اس کے بعد کئی افسانہ نگاروں نے اس صنف کو گلے لگایا اور ایسے افسانے تخلیق کیے جنھوں نے ریاست کے حصار سے نکل کر ملک بھر کے اردو حلقے میں داد وتحسین وصول کی۔اردو ناول پر اگر چہ افسانے کی نسبت بعد میں دھیان دیا گیا تاہم بہت جلد اس معیار کے ناول تخلیق کیے گئے جنھیں ادبی دنیا میں ہاتھوں ہاتھوں لیا گیا۔جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے بعض ناول نگاروں کے ناول ادبی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئے۔افسانہ اور ناول کے ساتھ ساتھ جموں وکشمیر کے تخلیق کاروں نے اردو ڈرامے کو بھی فروغ دینے میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا۔اسٹیج ڈراموں کی تعداد اگر چہ زیادہ نہیں ہے جس کی ایک وجہ اسٹیج کی عدم موجودگی بھی ہوسکتی ہے تاہم ریڈیائی ڈراموں کی اچھی خاصی تعداد مل جاتی ہے۔اس لئے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ جموں وکشمیر کے قلم کاروں نے افسانہ، ناول اور ڈراما تینوں اصناف میں گراں قدر خدمات انجام دے کر جموں وکشمیر کو ایک الگ مقام عطا کیا ہے۔عصر حاضر میں بھی بہت سارے قلم کار اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں جس سے جموں وکشمیر میں اردو افسانہ، ناول اور ڈرامے کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔

## حوالہ جات


۱ حامدی کاشمیری، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، ۲۰۱۰ ص۔ ۱۷۶

۲ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آ آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز سرینگر، ص۔۲۴۲

۳ ڈاکٹر برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشونما، رچنا پبلی کیشنز جموں، ص۔ ۴۰

۴ ایضاً، ص۔۴۳

۵ عبدالقادر سروری، کشمیر میں اردو، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آ آرٹ کلچر اینڈ لینگو یجز سرینگر، ص۔۲۳۱

۶ ڈاکٹر برج پریمی، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشونما، رچنا پبلی کیشنز جموں، ص۔ ۱۹۹

۷ ایضاً، ص۔۹۸

۸ ایضاً، ص۔۱۰۰

# باب دوم

# آنند لہر حیات و خدمات

# آنند لہر حیات و خدمات

## آباواجداد

آنند لہر کے آباواجداد کا تعلق جموں وکشمیر کے دور افتادہ سرحدی ضلع پونچھ سے تھا۔لہر کے آباؤاجداد پونچھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سیٹھیڑا میں آباد تھے۔ان کے والد بلراج آنند کا جنم اسی گاؤں میں ہوا تھا اور انہوں نے اپنی بنیادی تعلیم وہیں سے حاصل کی تھی۔۱۹۴۷ء میں جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو بلراج آنند کو حالات کے پیشِ نظر سٹھیڑا سے ہجرت کرنی پڑی۔کیونکہ یہ علاقہ دونوں ملکوں کو تقسیم کرنے والی لکیر کے بالکل قریب تھا۔سٹھیڑا سے ہجرت کرکے بلراج آنند نے پونچھ شہر کے ایک محلّہ سرائے میں سکونت اختیار کی۔جہاں ان کا خاندان چار پانچ دہائیوں تک آباد رہا۔بلراج آنند اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔جس کی وجہ سے انہیں اس وقت محکمہ مال میں گرداور کے عہدے پر فائز کیا گیا۔بلراج آنند کے تین بھائی تھے۔جن میں سے لالہ موہن راج محکمہ مال میں ملازم تھے۔جبکہ دوسرے دو ارجن دیو آنند اور ٹھیمو آنند کھیتی باڑی کے پیشے سے وابستہ تھے۔بلراج کی بیوی کا نام سمتری دیوی تھا جو ایک گھریلو عورت تھی۔آنند لہر کی تعلیم وتربیت میں ان کا کلیدی رول تھا۔

آنند لہر کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ان کے بڑے بھائی کا نام شورتن آنند تھا۔شورتن نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی تھی لیکن عالم شباب میں ۲۴ سال کی عمر میں دنیا کو الوداع کہہ گئے۔ان کے چھوٹے بھائی شتیل کمار آنند اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور محکمہ مال میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے۔جن کا انتقال ۲۰۱۰ میں ہوا۔آنند لہر کی بڑی بہن کا نام ریشمی نندہ ہے جو ایک تعلیم یافتہ خاتون ہیں اور ایک غیر سرکاری اسکول میں استانی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ان کی چھوٹی بہن کا نام ببلی تھا جو صرف ۲ سال کی عمر میں انتقال کر گئی تھی۔جس کا آنند لہر کو بہت صدمہ ہوا تھا۔لہر نے اپنے مشہور ناول "مجھ سے کہا ہوتا" کا انتساب بھی اپنی اسی بہن ببلی کے نام کیا ہے۔

## ولادت،تعلیم

آنند لہر کا اصل نام شیام سندر تھا۔آنند ان کی ذات تھی جبکہ لہر ان کا قلمی نام تھا۔ادبی دنیا میں آنند لہر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔آنند لہر کی پیدائش ۲ جولائی ۱۹۵۱ میں پونچھ کے محلّہ سرائے میں ہوئی۔جہاں انہوں نے اپنے

بچپن کے ایام گزارے اور وہیں سے ۱۹۵۶ء میں اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز بھی کیا۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول پونچھ سے بنیادی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مڈل اسکول پونچھ میں داخلہ لیا۔ جہاں سے آٹھویں جماعت تک کی تعلیم مکمل کی۔اس کے بعد گورنمنٹ ہائر اسکینڈری اسکول پونچھ سے سائنس کے مضامیں میں بارہویں جماعت کا امتحان امتیاز ی حیثیت سے پاس کیا۔تعلیم سے آنند لہر کو خاص دلچسپی تھی۔۱۹۷۲ء میں ڈگری کالج پونچھ سے بی۔ایس۔سی کی سند حاصل کی۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے کشمیر یونی ورسٹی کا رخ کیا۔جہاں سے انہوں نے ۱۹۷۵ میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ایل ایل بی کی ڈگری مکمل کرنے کے فوراً بعد انہوں نے جموں ہائی کورٹ میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور بہت جلد اس پیشے میں ماہر ہو گئے۔ان کا شمار ریاست کے مشہور و معروف وکلا میں ہونے لگا۔لہر کو اپنے پیشے سے گہری دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر انہیں دہلی سپریم کورٹ میں بھی بعض مقدمات کی پیروی کرنے کا موقع ملا۔لہر اپنے اس پیشے سے تا دیر جڑے رہے۔عمر کے آخری دو تین برس صحت ناساز ہونے کی وجہ سے پیشہ ترک کرنا پڑا تاہم جب تک زندہ رہے اپنی قابلیت اور حسن اخلاق کی بدولت اپنے رفقائے کار کی نظروں میں اعلیٰ مقام پر رہے۔آنند لہر اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی خدمات بڑے ذوق وشوق سے کر رہے تھے لیکن ۲۲ جون ۲۰۱۶ء کو آنند لہر سپریم کورٹ آف انڈیا میں ایک مقدمے کی سماعت کر رہے تھے کہ اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا۔جس کے تادم مرگ وہ اس بیماری میں مبتلا رہے اور طویل علالت کے بعد ۶ دسمبر ۲۰۱۸ء کو جموں میں ان کا انتقال ہوا۔

## شادی

آنند لہر کی شادی ۱۹۷۸ء میں ضلع پونچھ کی تحصیل مہنڈر کے گاؤں چھجلہ سے تعلق رکھنے والے ایک پڑھے لکھے اور معزز خاندان میں ہوئی۔ان کی بیوی کا نام نیلم آنند ہے۔جو ایک پڑھی لکھی باشعور خاتون ہیں۔نیلم آنند نے شروع شروع میں بنک میں ملازمت اختیار کی تھی اور کچھ عرصے تک اس فرض کو انہوں نے بخوبی نبھایا بھی تھا لیکن بعد ازاں گھریلو مصروفیات کی وجہ سے انہیں ملازمت ترک کرنی پڑی۔اس کے بعد وہ ایک گھریلو خاتون کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگیں۔نیلم آنند نے اپنے خاوند کی منشا پر ملازمت کو خیر آباد کہا۔نیلم آنند تعلیم یافتہ خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ ایک فرماں بردار بیوی اور ایک سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے ساتھ ساتھ اپنی اولاد کی خاطر خواہ تربیت کرنے میں بھی کامیاب ہوئیں۔فی الوقت وہ بخشی نگر جموں میں اپنے

بیٹے سدھارتھ آنند کے ساتھ سکونت پزیر ہیں۔

**اولاد**

اولاد میں آنند لہر کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ان کے بڑے بیٹے کا نام اکشے کمار آنند تھا۔اکشے کمار نے جموں یونی ورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری مکمل کرنے کے بعد جموں ہائی کورٹ میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا لیکن زندگی نے ساتھ نہ دیا اور ۱۸ جنوری ۲۰۱۱ء کو وہ دنیا فانی کو خیر آباد کہہ گئے۔آنند لہر کے چھوٹے بیٹے کا نام سدھارتھ آنند ہے وہ بھی جموں میں وکالت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔روہنی آنندان کی اکلوتی بیٹی ہے۔روہنی آنند نے جموں یونیورسٹی سے بی ایس سی کی ڈگری مکمل کی تھی۔اس کے بعد ۲۰۱۲ء میں ان کی شادی ہوگئی۔اس وقت وہ جموں میں سرکاری اسکول میں استانی کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔

**شخصیت**

شخصیت سے مراد کسی بھی شخص کے حسن سلوک ،حسن کردار اور حسن عمل سے ہے۔شخصیت سے مراد وہ خوبیاں ہیں جو انسان کے عمل سے ظاہر ہوتی ہیں۔شخصیت میں انسان کے عادات و اطوار، مزاج ،حسن اخلاق،خدوحال،خیالات ونظریات اور چال ڈھال شامل ہیں۔کسی بھی فن کار کی تخلیقات پر اس کی شخصیت کا عکس ضرور ہوتا ہے۔اس لئے اس کی تخلیقات کو سمجھنے کے لئے اس کی شخصیت سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔

آنند لہر ایک معروف فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور ومعروف وکیل اور سماجی کارکن تھے۔لہر خوش اخلاق ،ملنسار اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ہر کسی سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ان کے چہرے پر ہر وقت خوشی وشادمانی کے اثرات نمایاں رہتے تھے۔اسی لئے متین ایجاز نے ان کی شخصیت کے متعلق لکھا ہے کہ۔

''آنند لہر کے خلوص اور انسان دوستی کی داد نہ دینا بڑی زیادتی کی
بات ہوگی۔''[1]

آنند لہر سراپا انکسار اور شگفتہ مزاج شخصیت کے مالک تھے۔ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہونا ان کا شیوہ تھا۔نہایت شریف اور سادہ مزاج انسان تھے۔غربا و مساکین کی مدد کے لیے ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔مذہبی رسومات کی پابندی سے ادائیگی کرتے تھے۔ولی محمد اسیر کشتواڑی ان کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''عالیٰ ظرفی اور شرافت ان کے چہرے مہرے سے عیاں ہے۔ان کی

عظمت ان کی انتہائی ندامت اور عاجزی و انکساری میں چھپی ہوئی ہے۔غریب پروری، مذہبی رواداری، انسانی ہمدردی اور ادب دوستی کی اعلیٰ صفات ان کی شخصیت میں خوبصورت نکھار پیدا کرتی ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ سر بلند لوگ خاکروبوں سے بھی جھک کر سلام کیا کرتے ہیں لیکن جب فاضل دوست امین بنجارہ کے توسل سے لہر صاحب کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی عاجزی اور انکساری پا کر اس بات کی زندہ و جاوید مثال ان کی شخصیت میں دیکھی۔''۲

آنند لہر اعلیٰ کردار کے مالک تھے۔ہائی کورٹ کے نامور وکیل ہونے کے ناطے ان کی مصروفیات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔لیکن اس کے باوجود وہ ہر کسی سے ملنے کے لیے وقت نکالتے تھے اور خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔

## حلیہ

آنند لہر میانہ قد کے آدمی تھے۔گورا رنگ، گول چہرہ اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے۔داڑھی منڈواتے تھے۔سر پر گھنے بال تھے جو عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہو گئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ پیشانی کافی کشادہ نظر آتی تھی۔لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ سجائے رکھتے تھے۔چہرے پر متانت، سنجیدگی اور علمیت کے اثرات نمایاں رہتے تھے۔سادہ رہن سہن اور اعتدال پسند مزاج کے مالک تھے۔عشاق کشتواڑی ان کی شخصیت و حلیہ بیان کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

''آنند لہر ایک پر کشش شخصیت کے مالک ہیں۔پیشہ سے وکیل، طبیعت کے موم، شکل و صورت سے مجسم شرافت، پیکر حلیم و شاکر مگر قلم کاری میں مزاج و خیال منشی پریم چند، سعادت حسن منٹو اور راجندر سنگھ بیدی جیسا رکھتا ہے۔''۳

آنند لہر جموں و کشمیر کی ایک مشہور اور خوبصورت شخصیت تھی۔لباس میں زیادہ تر پینٹ کوٹ پہنتے تھے اور

سفاری سوٹ بھی ان کا پسندیدہ لباس تھا۔خوبصورت لباس کے شوقین تھے۔کھانے میں وہ زیادہ تر سادہ خوراک کا استعمال کرتے تھے۔شوگر زیادہ ہونے کی وجہ سے جسم تھوڑا موٹا ہو گیا تھا۔اس لیے زیادہ تر سادہ خوراک استعمال کرتے تھے۔دال،سبزی، چاول اور گندم کی روٹی ان کی پسندیدہ غذا تھی۔

## ادبی خدمات

آنند لہر کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ان کا تعلق چونکہ ایک ایسی سرزمین سے تھا جو ادبی لحاظ سے بہت زرخیز رہی ہے۔طالب علمی کے زمانے سے ہی اپنے ادبی جوہر دکھانے شروع کر لیے تھے۔زمانہ طالب علمی میں وہ کالج و یونیورسٹی میں ہونے والے مختلف مباحثوں کی نمائندگی کرتے رہے اور سیکریٹری کے فرائض بھی بخوبی انجام دیے۔کالج کی تعلیم کے دوران اپنی ادبی زندگی کا سفر شروع کیا۔ان کا پہلا افسانہ ''پتھر کے آنسو'' کے نام سے پہلی بار کالج میگزین میں شائع ہوا جس نے خوب داد و تحسین وصول کی۔اس کے بعد ان کا قلم تا حیات روانی سے چلتا رہا۔آنند لہر ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نگار،شاعر،سماجی کارکن اور مشہور و معروف وکیل بھی تھے۔لہر کو اردو ادب سے گہری دلچسپی تھی۔یہی وجہ ہے کہ اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود وہ ساری زندگی دیانتداری سے اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔

مختصر افسانہ لکھ کر اپنی ادبی زندگی کی شروعات کی۔اس کے بعد مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے انھوں نے اردو ڈرامے کا سہارا لیا۔انھوں نے مختلف موضوعات پر مختصر ریڈیائی ڈرامے لکھے۔جو دوردرشن کیندر جموں و سرینگر اور آکاش وانی سے پیش کیے گئے۔ان کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ''نروان'' کے نام سے ۱۹۸۸ء میں جے کے بک ہاؤس ویرمرگ جموں توی سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔اس طرح ان کی ادبی زندگی کی باقاعدہ شروعات ہوئی۔اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں ''تپسوی کون'' کے عنوان سے ان کا طویل ڈراما انیس آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔۷۹ صفحات پر مشتمل یہ ایک دلچسپ ڈرامہ ہے۔اس کے بعد آنند لہر کی شخصیت کو اس وقت چار چاند لگ گئے جب ۱۹۹۷ء میں ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ادبی حلقوں میں مشہور ہوا۔یہ ناول ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور آنند لہر کی ادبی شہرت کا باعث بنا۔اس سے قبل آنند لہر کے کئی افسانے ملک بھر کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے لیکن کتابی صورت میں ان کا یہ پہلا ایسا کارنامہ تھا جسے اردو ادب کے حلقے میں پذیرائی حاصل ہوئی۔آنند لہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اس پار'' ہے جو ۲۰۰۰ میں

سیمانت پرکاشن ۹۲۲ کوچہ روہیلا خاں، دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا۔اس افسانوی مجموعے میں لہر نے کل ۱۱۴افسانے شامل کئے ہیں۔جن میں مختلف سماجی مسائل کو اختصار کے ساتھ فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر افسانے کا اپنا مزاج اور الگ موضوع ہے۔لہر نے روایت سے قدرے ہٹ کر مختلف موضوعات کی عکاسی کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔زیرِنظر افسانوی مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے عشاق کشتواڑ لکھتے ہیں۔

''جہاں ایک طرف مصنف نے بلند پایا نثری تحریر کا ثبوت دیا ہے وہاں دوسری طرف روایت سے قدرے ہٹ کر افسانے میں مجموعی طور پر انسانی قدروں کی بازیابی، ہندو مسلم اتحاد، قومی یکجہتی، انسانی قدروں کے لیے جدوجہد، سماجی خلیوں کو استوار کرنے کا جتن، زندگی کے سدھار کی کاوش، سماجی تنقید، سیاسی جادوگری اور جنسی موضوعات کے خاموش تاروں پر مضراب پھیرنے کی صحت مند سعی بروئے کار لائی ہے۔''۴؎

اس کے بعد ۲۰۰۲ء میں آنند لہر کا دوسرا افسانوی مجموعہ بنام ''انحراف'' ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ دہلی سے شائع ہوا۔اس میں آنند لہر نے تجریدی اور علامتی افسانے پیش کیے ہیں۔جو روایتی افسانوں سے بالکل ہٹ کر ہیں۔زندگی کی قدروں اور مسائل سے جڑے ہوئے یہ افسانے مختصر ہوتے ہوئے بھی زندگی پر محیط ہیں۔انحراف میں شامل تمام تر افسانے تجریدی ہیں۔انور کمال حسینی اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''لفظوں کی جمع پونجی کے لحاظ سے افسانے مختصر ہیں لیکن معنویت کے لحاظ سے سمندر ہیں۔کم لفظوں میں بھرپور بات کہنا ان کا مزاج بھی ہے اور فن بھی۔انحراف کے سب ہی افسانے معنی خیز ہیں۔اور ان افسانوں میں اٹھائے گئے سوال ہی اپنا جواب ہیں۔اسی لیے مصنف نے انہیں تجریدی افسانے کہا ہے۔گویا انھوں نے ان میں ادبی تحریک جدیدیت کی پذیرائی کی ہے اور ان افسانوں کے دروبست کے مختصر جملوں میں حقائق کو آشکار کیا ہے۔''۵؎

۲۰۰۲ء ہی میں ان کا دوسرا ناول ''سرحدوں کے بیچ'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔جس میں سرحدوں کے وجود اور اس کے قرب وجوار میں رہنے والے لوگوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔اس کے بعد ۲۰۰۵ میں آنند لہر کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' کے نام سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل ۲۲ افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ ہر افسانہ موضوعاتی انفرادیت رکھتا ہے۔سیاسی، سماجی اور مذہبی مسائل کو مختصر لیکن خوبصورت پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔۲۰۰۵ء میں آنند لہر کا ایک دلچسپ ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' زیور طباعت سے آراستہ ہو کر ادبی حلقوں میں مشہور ہوا۔عراق کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول جنگ کے نتائج اور ہتھیاروں کی بربادی و تباہی کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔لہر نے علامتی انداز میں اس موضوع کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ظہور الدین لکھتے ہیں۔

> ''آنند لہر کے پاس قدرت کی دی ہوئی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔میری دعا ہے کہ اللہ انہیں اپنے فن کی طرف مزید توجہ دینے کی فرصت عطا کرے تا کہ ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات کہیں ہم سے ایک اچھے فنکار کو نہ چھین لیں۔آمین!!۔''[٦]

اس کے بعد آنند لہر نے اپنی ادبی خدمات کو جاری رکھتے ہوئے ریڈیائی ڈرامے لکھے۔۲۰۰۶ء میں ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ''سرحدیں'' چھپ کر منظر عام پر آیا۔جس میں تین مختصر ڈرامے شامل کیے گئے ہیں۔''یہی سچ ہے'' آنند لہر کا چوتھا ناول ہے۔جو ۲۰۰۸ء میں اردو بک سوسائٹی دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا۔اس ناول میں بے ایمانی، رشوت خوری اور استحصال جیسی سماجی برائیوں کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔۲۰۰۹ء میں لہر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کے نام سے اردو بک سوسائٹی ۹۲۲ کوچہ روہیلہ ،خان دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا۔جس میں کل ۳۴ افسانے شامل کیے گئے ہیں۔اشرف حسین نے اس مجموعے کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔اپنے ادبی کارناموں میں آنند لہر نے آزاد نظموں کا ایک مجموعہ بھی یادگار چھوڑا ہے۔جو ۲۰۰۹ء میں ''آندولن'' کے عنوان سے مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں سے شائع ہوا۔لیش شرما نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔اس میں آنند لہر نے زمانے کے بدلاؤ کو اور اس سے پیدا شدہ حالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بدلاؤ ایک قدرتی عمل ہے اور زمانہ قدیم سے ہوتا چلا آرہا ہے لیکن یہی بدلاؤ اگر ذاتی مفاد کا رخ اختیار کرلے تو مایوسی اور تباہی و بربادی کا ذریعہ بن جاتا

ہے۔جس کے نتیجے میں انسانی قدروں کا زوال ہوتا ہے۔اخلاقی قدریں پامال ہوجاتی ہیں۔اخوت، بھائی چارے اور محبت کی جگہ نفرتیں اور تفرقات جنم لیتے ہیں۔آندولن کا ذکر کرتے ہوئے لیش شرما لکھتے ہیں۔

''جب ماضی اور مستقبل کا آپس میں ٹکراؤ کا اندیشا پیدا ہوتا ہے تو زمانہ حال میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے۔اگر تھوڑی وسیع النظری سے دیکھا جائے تو اس ہلچل کے تہہ در تہہ بہت سے معنی نکلتے ہیں۔جیسے بدلاؤ ،پری ورتن، تحریک، انقلاب یا پھر آندولن۔''[۷]

لہر نے ان نظموں میں جموں شہر کے لوگوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کی سعی کی ہے اور لوگوں کو اپنے حقوق کی خاطر آواز بلند کرنے اور ناانصافیوں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا ہے۔لہر کی نظموں کا ذکر کرتے ہوئے لیش شرما آندولن کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

''یہ تخلیق، تخلیق کار کو ادیب ہی نہیں بلکہ ایک نامی ایڈوکیٹ (وکیل) ہونے کے ناطے جموں کے نصف صدی سے بھی زائد عرصے سے ناانصافی اور جبر و استبداد کی چکی میں پستے آرہے پڑھے لکھے بیکار نوجوانوں، ڈاکٹروں، انجینئروں، فیکٹری مزدوروں، آٹو رکشہ چلانے والوں، چھوٹے موٹے پرچون دکانداروں، کسانوں، کھیتوں کھلیانوں، فنکاروں اور ریڑھیوں پر سبزی اور پھل بیچنے والوں کے حق وحقوق کے خلاف آواز اٹھانے اور پیروی کرنے کی ہمت اور حوصلہ عطا کرتی ہے۔''[۸]

عوام کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف ہونے والے آندولن اور دھرنوں میں انہیں انصاف ملنے کے بجائے گولیاں نصیب ہوتی ہیں۔نوجوانوں کو موت کی آغوش سلایا جاتا ہے، ماؤں کی گودیں خالی ہوتی ہیں، عورتیں بیوہ ہوتی ہیں اور بچے یتیم۔جس کی عکاسی آنند لہر نے ایک نظم میں یوں کی ہے۔

''اور پھر اس آندولن میں مرنے والوں کے لیے
جنت کے دروازے کھلے ہیں

اور جسموں پر ہونے والے زخم
دیوتاؤں نے اندر سبھا کی اپسراؤں کے
آنچلوں کی کناریوں سے سلائے ہیں
اور پھر جنت میں مکتی کے دروازے ہی نہ کھلے ہیں
بلکہ وہ تو سیدھے بھگوان سے ملے ہیں۔''۹

اس کے علاوہ ان کی ایک اور نظم جس میں وعورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔سماج میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔کوئی بھی مذہب یا سماج خواتین کے حقوق تلفی کا درس نہیں دیتا۔لیکن بدقسمتی سے ہمارا سماج آج تک اس بات سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکا۔اس سماجی برائی کے خلاف ہمارے ادبا وشعرا نے وقتاً فوقتاً اپنی تخلیقات کے ذریعے صدا بلند کرنے کی کوششیں کی ہیں۔اسی سلسلے کی ایک کڑی لہر کی یہ نظم ہے ملاحظہ کیجیے۔

''جموں کی شریف مائیں اور معصوم بیٹیاں
جب گھروں کو چھوڑ کر اپنے ادھیکار
کے لیے
گلیوں میں نکلتی ہیں
تو آسمان پر اپسراوں کا ہجوم
ان کی کامیابی کی دعا کرتا ہے
اور ہر دیوتا دھرتی کی گھٹن کو ہوا کرتا ہے۔''۱۰

اس کے علاوہ جموں کے خوبصورت مقامات، وہاں کی تہذیب اور مذہبی مقامات کو بھی موضوع بنایا ہے۔زیادہ تر نظموں میں جموں شہر کے لوگوں کو مخاطب کیا ہے۔ان کے ساتھ ہونے والے ظلم و جبر کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شجاعت، زندہ دلی اور سخاوت کا بھی ذکر کیا ہے۔نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جموں کا عام آدمی دوسروں کے تئیں احساس، ہمدردی اور ایثار و قربانی کا جذبہ رکھتا ہے۔جس کی مثال اس نظمیں میں واضح طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔

''جموں کے آٹو والے
صرف روزگار کمانے کے لیے آٹو نہیں چلاتے
بلکہ اس آندولن میں
اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹ کر
بھوک اور پیاسوں کے لیے لنگر بھی
لگاتے ہیں۔''[۱۱]

آنند لہر ایک صاف ذہن انسان تھے۔ ذات پات اور مذہبی تفرقات سے انہیں سخت نفرت تھی۔ اپنے مذہب کے پکے اور دیگر مذاہب کے قدردان تھے۔ ان کی تخلیقات خواہ نثری ہوں یا شعری اتحاد، مساوات اور محبت و شانتی کا درس دیتی ہیں۔ اپنے مذہب کی جانکاری رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ دیگر مذاہب کی بھی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک نماز بھی اتنی ہی محترم تھی جتنی کہ پوجا اور اذان بھی محترم ہے اور مندر میں بجایا جانے والا شنکھ بھی۔ وہ تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والی بلند پایہ علمی و ادبی اور روحانی شخصیات کے قدردان تھے۔ یہ نظم دیکھیں جس میں مسلمانوں اور خاص کر مسلمانوں کی بڑی بڑی روحانی شخصیات کے قد کا انہوں نے اعتراف کیا ہے۔

''جموں کے سچے مسلمان
جن کی شناخت
سائیں میاں میر سے ہے
خواجہ غریب نواز سے ہے
نظام الدین اولیاء سے ہے
جن کی اذانوں سے بگڑتے کام سنورتے ہیں
اور روحانیت کی خوشبو کے پھول بکھرتے ہیں۔''[۱۲]

اس مجموعے میں شامل تمام نظمیں میں ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مزدوروں، مظلوم عورتوں، دوکانداروں، ڈاکٹروں، ڈرائیورں وغیرہ کے ساتھ ہونے والی ناانصافی، ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ جموں کے لوگوں کی زندہ دلی، بھائی چارے اور وطن پرستی کے جذبے پر

بھی نظمیں کہی گئی ہیں۔ایک ایسی ہی نظم جس میں ان کا خوب الوطنی کا جذبہ ابھر کر سامنے آتا ہے ملاحظہ ہو۔

جموں کے تاجر صرف چیزوں کا لین دین
نہیں کرتے
بلکہ قربانی اور محبت کے سوداگر بھی ہیں
مفت بیچتے ہیں اپنا سر وطن کے لیے
کانٹوں کی چبھن سہتے ہیں چمن کے لئے
اور پھر زہر کے بدلے امرت کا سودا بھی
کرتے ہیں
صرف پھول نہیں چنتے چمن پرستی کا
دعوی بھی کرتے ہیں۔''۱۳؎

لہر نے جموں کے ایک خوبصورت مذہبی مقام''امرناتھ'' کی خوبصورتی کو بھی اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔جہاں ملک بھر سے لوگ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لیے جاتے ہیں۔جو بعض اوقات ریاست کے نامساعد حالات کا شکار بھی ہوتے ہیں۔جموں وکشمیر میں پچھلی کئی دہائیوں سے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔جن کی وجہ سے ریاست بھر کے لوگوں کے ساتھ ساتھ بعض اوقات بیرون ریاست سے آئے ہوئے سیاح لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔اس ضمن میں آنند لہر کی ایک نظم کا یہ بند ملاحظہ کیجئے۔

''شوتمہاری یاترہ کبھی قبول نہ کریں گے
اگر تم شہیدوں کو سجدہ کرکے نہ آؤ گے
اور شو بھی تم سے ناراض رہیں گے
اگر اس شہادت کی کہانی بچوں کو
نہ سناؤ گے۔''۱۴؎

آنند لہر نے قومی یکجہتی، سرحدوں کا خاتمہ، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، سیاسی ظلم و جبر، رشوت خوری اور استحصال جیسے موضوعات کو بھی اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔تمام تر نظمیں ظلم اور جبر کے خلاف ایک واضح احتجاج بلند کرنے کی

صورت میں کہی گئی ہیں۔ جو لوگوں کو اپنے حقوق کی حصولیابی کے لیے صدا بلند کرنے پر اکساتی ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی بے ثباتی اور آپسی تفرقات کی بنا پر آپسی نفرت کو ختم کرنے کا بھی درس دیا ہے۔ ضلع پونچھ ان کا آبائی وطن تھا جہاں سے ہجرت کر کے وہ جموں آباد ہوئے تھے۔ اپنے مادر وطن سے لہر کو بے پناہ محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں پونچھ سے اپنی رغبت وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ایک نظم میں پونچھ کی خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کے لوگوں کی خوش اخلاقی اور احساس و ہمدردی کو بھی بیان کیا ہے۔

مختصر یہ کہ آنند لہر بنیادی طور پر ایک فکشن نگار تھے اور اسی میدان میں انہیں شہرت بھی نصیب ہوئی۔ اگر چہ اردو ادب میں ان کی مقبولیت کا ذریعہ افسانہ اور ناول ہی بنے تاہم انہوں نے ڈرامے اور آزاد نظمیں کہہ کر اس میدان میں خدمات انجام دی ہیں۔ شاعری میں انہیں کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہو سکا بہر حال مختلف سماجی مسائل کو عوام تک پہنچانے کے لیے انہوں نے شاعری کا سہارا بھی لیا ہے۔

''آندولن'' کے بعد آنند لہر نے ''نامدیو'' کے عنوان سے اپنا پانچواں اور آخری ناول لکھ کر اردو ادب میں اضافہ کیا۔ ''نامدیو'' ۲۰۱۲ء میں روشن پبلیکیشنز نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ اس میں لہر نے مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' آنند لہر کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے اور اردو ادب کو یہ ان کی زندگی کا آخری تحفہ ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ ۲۰۱۵ء میں روشن پرنٹرس نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں مختلف موضوعات پر ۳۸ مختصر افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ لہر کا قلم بڑی روانی سے اردو ادب کی خدمات انجام دے رہا تھا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور یہ سلسلہ یہیں تک محدود رہ گیا۔

## آنند لہر کی تصانیف کے انتسابات

آنند لہر بلند پایا فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور وکیل اور رحم دل، خوش اخلاق اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سماج میں بسنے والے ہر شخص کا درد بنا مذہب وملت محسوس کرتے تھے۔ رشتوں کا تقدس ان کے دل میں برقرار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ بعض تخلیقات کے انتسابات انہوں نے موضوع کے اعتبار سے کیے ہیں جبکہ بعض کا اپنے چاہنے والوں اور اپنے عزیزوں کے نام کیا ہے۔

''نروان'' آنند لہر کی پہلی مطبوعہ تصنیف ہے جو کہ مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس کا انتساب انہوں نے اپنے والد مرحوم شری بلراج آنند کے نام کیا ہے جو کچھ اس طرح ہے۔

''والد مرحوم شری بلراج آنند کے نام جو مجھے ہمیشہ یاد آتے ہیں۔''

ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کا انتساب کشمیر کی لڑائی میں شہید ہونے والے شہیدوں کے نام کیا ہے نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک سیاسی جنگ ہے جس میں ہزاروں بے گناہ لوگوں کا قتل عام ہو رہا ہے اور کسی کو سکیورٹی فورسز اور کسی کو اگرواد کا نام دیا جا رہا ہے جبکہ انسان، انسان ہے۔ انتساب ملاحظہ کیجئے۔

''کشمیر کی لڑائی میں شہید ہونے والے ان لوگوں کے نام جنہیں سکیورٹی فورسز کے سپاہی ہیں یا اگرواد کہا گیا حالانکہ وہ بھی رشتوں ناطوں سلسلوں اور تعلقات میں بندھے تھے اور گھروں کے دروازے ان کے انتظار میں بھی کھلے تھے۔''

''سرحد کے اس پار'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جس کا انتساب اپنے ہم جماعت رفقا کے نام یوں کیا ہے۔

''اپنے ہم جماعتوں کے نام جو مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔''

افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' کا انتساب انہوں نے اپنے مادر وطن (پونچھ) کے ان پڑوسیوں کے نام کیا ہے جن کے ساتھ ان کا بچپن گزرا تھا۔

''محلّہ سرائے پونچھ کے ان پڑوسیوں کے نام جن کی محبت آج بھی میرے ساتھ ہے۔''

تیسرے ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کا انتساب انہوں نے اپنی چھوٹی بہن ببلی کے نام کیا ہے جو صرف دو سال تک زندہ رہی تھی۔

''اپنی چھوٹی بہن ببلی کے نام جو صرف دو برس جی سکی۔''

ریڈیائی ڈراموں کے مجموعے ''سرحدیں'' کا انتساب لہرنے پونچھ کے ان اساتذہ کے نام کیا ہے جن سے انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔

''پونچھ کے ان اساتذہ کرام کے نام جو گلیوں میں بچوں کو علم ریاضی سکھاتے ہیں۔''

''یہی سچ ہے'' ان کا چوتھا ناول ہے جس کا انتساب انہوں نے ان لوگوں کے نام کیا ہے جو ان کی ادبی اور سماجی خدمات کو تسلیم کرتے تھے اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

''ان لوگوں کی نذر جنہیں شاید میں اپنے قد سے زیادہ نظر آتا ہوں۔''

چوتھے افسانوی مجموعے ''بٹوارہ'' کا انتساب لہر نے اپنے رفقائے کار کی نظر کیا ہے۔لہر پیشے سے وکیل تھے۔جموں ہائی کورٹ میں وکالت کے فرائض انجام دیتے رہے۔جموں بار ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہے۔انہیں اپنے ہم پیشہ وکلا سے بے حد محبت تھی۔جس کے پیش نظر انہوں نے اس افسانوی مجموعے کا انتساب ان وکیلوں کے نام کیا ہے۔

''جموں بار ایسوسی ایشن کے نو آموز وکیلوں کے نام جو صرف میری
عزت ہی نہیں کرتے بلکہ مجھ سے از حد محبت بھی کرتے ہیں۔''

آخری ناول ''نامدیو'' کا انتساب انہوں نے اپنے ان چاہنے والوں کے نام کیا ہے جو ان کی زندگی میں کسی وجہ سے باقی نہ رہ سکے لیکن ان کی یادیں ان کے دل میں ہمیشہ رہیں۔

''ان لوگوں کے نام جنہیں میں بھولنا چاہتا ہوں۔''

# انعامات واعزازات

آنند لہر کے ادبی کارناموں ااوران کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مختلف اداروں نے انہیں انعامات و اعزازات سے بھی نوازا ہے۔جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱ راجستھان اردو اکادمی ایوارڈ۔۱۹۹۷ء

۲ اتر پردیش اردو اکادمی انعام۔۱۹۹۷ء

۳ امریکن بائیوگرافی کل انسٹیٹیوٹ کا مین آف داایئر ایوارڈ۔۱۹۹۷ء

۴ میرا اکیڈمی لکھنؤ انعام۔۱۹۹۷ء

۵ پراچین کلا کیندر چندی گڑھ انعام۔۱۹۹۷ء

۶ جموں وکشمیر اردوفورم انعام۔۱۹۹۷ء

۷ جموں یونیورسٹی پروفیشنل اردو کورس اعزاز۔۲۰۰۰ء

۸ نمی ڈوگری سنستھا انعام۔۲۰۰۱ء

۹ ادیان اکیڈمی اوڑیسہ اعزاز۔۲۰۰۱ء

۱۰ افسانوی مجموعہ ’’سرحد کے اس پار‘‘ پراتر پردیش اردو اکیڈمی ایوارڈ۔۲۰۰۳ء

۱۱ لالہ جگت نرائن جلندر انعام۔۲۰۰۵ء

۱۲ صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے افسانوی مجموعہ بٹوارہ پر۵۰۰۰۰ روپے کا انعام ۲۰۰۸ء میں دیا گیا۔

۱۳ ڈراموں کے مجموعہ سرحدیں پراتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ۔۲۰۰۶ء

۱۴ انتر راشٹریہ سمان

۱۵ جموں کشمیر رائٹرز فورم اعزاز۔۲۰۱۰ء

۱۶ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ،اردو ڈیپارٹمنٹ اعزاز۔

۱۷ ساہتیہ رتن ایوارڈ، سچیتنا دیوبند یوپی

۱۸ مہاراجہ پرتاب سنگھ ایوارڈ تحریک بقائے اردو

۱۹ حیات اللہ انصاری ایوارڈ

۲۰ ہندوستانی ادبی کلچر بنارس۔۲۰۱۳ء

۲۱ بہار اردو اکیڈمی ایوارڈ

اس کے علاوہ مختلف رسائل وجرائد میں ان پر خصوصی نمبر نکالے گئے اور مقالے بھی لکھے گئے۔ممبئی سے نکلنے والے ماہنامہ ''شاعر'' اور دھنباد سے سہ ماہی ''رنگ'' نے گوشے شائع کیئے۔ دلی سے شائع ہونے والے ''عصری آگہی'' اور ''تحریک ادب بنارس'' نے بھی گوشے شائع کئے۔''آب جو'' کشتواڑ سے آنندلہر نمبر نکلا۔''اسباق'' پونے اور ''شاندار'' جوکہ اعظم گڑھ سے نکلتا ہے میں بھی گوشے مرتب ہوئے۔آنندلہر کی مختلف تخلیقات پر بعض ریڈیو چینل سے سیریل نشر کیے گئے۔جن میں افسانہ ''بٹوارہ'' پر دوردرشن کے کشمیر چینل سے پانچ اپی سوڈ کا سیریل تقسیم کے عنوان سے بنایا گیا اور نشر کیا گیا۔

ان کے مشہور ناول ''اگلی عید سے پہلے'' پر بھی ۵ اپی سوڈ کا سیریل دوردرشن کے کشمیر چینل سے نشر کیا گیا۔دوردرشن کیندر جموں وسرینگر سے افسانوں کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا۔آکاش وانی سے افسانہ ''برف اب بھی سفید ہے'' پر ڈرامہ نشر کیا گیا۔آل انڈیا ریڈیو کے اردو چینل پر کہانیاں نشر کی گئیں۔

آنندلہر جموں کشمیر انجمن ترقی اردو ہند کے صدر بھی رہے۔اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی اور کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے اردو کے فروغ کے لیے بنائی گئی مختلف کمیٹیوں کے رکن بھی رہے اور کئی ادبی تنظیموں کے سرپرست کی حیثیت سے بھی اردو ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔

ان کی ادبی تخلیقات پر جموں یونی ورسٹی اور چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی میں ایم فل کے مقالے بھی لکھے جا چکے ہیں۔جموں یونی ورسٹی میں افسانوی مجموعے ''انحراف'' اور ''بٹوارہ'' اور ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' پر ایم فل کا مقالہ تحریر کیا ہے۔جبکہ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ سے ایک طالب علم نے افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اس پار'' پر ایم فل کا مقالہ لکھا ہے۔

## حوالہ جات۔


۱ فدا کشتواڑی، آنند لہر شخصیت اور فن، اردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی، کشتواڑ۔ص۔۸۴

۲ ایضاً،ص۔۱۷

۳ ایضاً،ص۔۱۷

۴ ایضاً،ص۔۵

۵ آنند لہر، مجھ سے کہا ہوتا، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۵،ص۔۹

۶ آنند لہر، آندولن، مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں ۲۰۰۹،ص۔۴

۷ ایضاً۔ص۔۷

۸ ایضاً۔ص۔۳۲

۹ ایضاً۔ص۔۱۴

۱۰ ایضاً۔ص۔۱۸

۱۱ ایضاً۔ص۔۲۰

۱۲ ایضاً۔ص۔۲۵

۱۳ ایضاً،ص۔۳۶

# باب سوم

# آنند لہر کی افسانہ نگاری

# آنند لہر کی افسانہ نگاری

آنند لہر کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔انہوں نے اپنے بچپن کے ایام جموں وکشمیر کے دورافتادہ ضلع پونچھ میں گزارے۔پونچھ کی زمین ادبی لحاظ سے کافی زرخیز رہی ہے۔یہی وجہ ہے کہ لہر کو بچپن ہی سے ادبی محفلوں میں شرکت کرنے کا موقع مل گیا۔جس سے اردو ادب کے تئیں ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔آنند لہر نے طالب علمی کے زمانے سے ہی مختلف محفلوں میں شرکت کرنی شروع کر دی تھی۔اسکول اور کالج میں ہونے والے مختلف پروگراموں میں حصہ لیتے رہے اور سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دیے۔ادبی زندگی کا آغاز بھی طالب علمی کے زمانے میں کیا۔جب وہ گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ میں زیر تعلیم تھے۔مختصر افسانے سے ادبی زندگی کا آغاز کیا۔طالب علمی کے زمانے میں افسانہ ''پتھر کے آنسو'' لکھ کر ۱۹۷۲ء میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔جو پہلی بار گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ کے میگزین میں شائع ہوا۔ان کی اس کوشش کو کافی سراہا گیا جس سے ان کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی اور ادب کے تئیں دلچسپی مزید بڑھ گئی۔اس کے بعد وقتاً فوقتاً ان کے افسانے مختلف اخبارات ورسائل کی رونق بننے لگے اور یہ سلسلہ تاحیات جاری رہا۔اگر چہ ان کے افسانے کتابی صورت میں بہت بعد میں ادبی دنیا میں متعارف ہوئے تاہم ملک کے بیشتر ادبی رسائل میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔آنند لہر نے ۱۹۷۲ء میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔انہوں نے مختلف سماجی مسائل کو پیش کرنے کے لئے حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے روایتی افسانے لکھنے شروع کیے۔جن میں انہوں نے حقیقی زندگی سے جڑے مسائل کی عمدہ عکاسی کی ہے۔لہر پیشے سے وکیل تھے اس لئے تجزیاتی ذہن اور مدلل طریقۂ اظہار رکھتے تھے۔آنند لہر کو فکشن سے گہری دلچسپی تھی۔ڈاکٹر مشتاق صدف لکھتے ہیں۔

> ''آنند لہر عہد حاضر کے ایک حساس تخلیق کار اور زندہ دل انسان ہیں فکشن ان کی زندگی بھی ہے اور عبادت بھی۔وہ ہر بار فکشن کی نئی جہتوں کو آشکار کرتے ہیں۔''[۱]

ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ’’سرحد کے اس پار‘‘ ۲۰۰۱ء میں منصۂ شہود پر نمودار ہوا۔ جس میں ۱۱۴ افسانے شامل ہیں۔ جو مختلف سیاسی وسماجی مسائل کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان افسانوں میں فسادات، ذات پات، انسانی خودغرضی و لالچ، ازدواجی زندگی کے مسائل، عورتوں کا استحصال اور کئی سماجی روایات و رسومات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اس افسانوی مجموعے میں آنند لہر نے حقیقت پسندی اختیار کرتے ہوئے عصری صداقتوں کو تخلیقی فنکاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بعض افسانوں میں جدیدیت کے زیر اثر علامتوں کا استعمال بھی کیا ہے۔ لہر نے روزمرہ کی زندگی کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ وہ شہری زندگی کے ساتھ ساتھ دیہاتی زندگی کے رسم ورواج، رہن سہن اور دیگر مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ افسانوں کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنے گردوپیش کی ہر چیز پر ان کی گہری نظر تھی۔ جس کی عکاسی انہوں نے بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔

آنند لہر نے جب افسانہ نگاری کا آغاز کیا تو اس وقت جدیدیت کا دور دورہ تھا۔ افسانہ نگار روایت سے بغاوت کرتے ہوئے جدیدیت کی بھول بھلیوں میں گم تھے۔ تجریدی اور علامتی افسانوں پر زیادہ زور دیا جارہا تھا۔ لہر نے شروعاتی دور میں روایت کی پاسداری کرتے ہوئے افسانے لکھے۔ جن میں مختلف سماجی مسائل کو سیدھی سادی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ اس دوران علامتی اور تجریدی افسانے لکھنے کا زیادہ دور دورہ تھا۔ ایسے میں حالات کے پیش نظر آنند لہر نے بھی علامتی اور تجریدی افسانے لکھے تاہم انہوں نے اپنے آپ کو کسی خاص تحریک یا رجحان تک محدود نہیں رہنے دیا۔ ان کے ہاں علامتی افسانے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اور تجریدی بھی۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کے اثرات بھی ان کے ہاں نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ وہ کسی ایک تحریک یا رجحان سے جڑے ہوئے افسانہ نگار نہیں تھے۔ ان کے بارے میں شرون کمار ورما لکھتے ہیں۔

> ’’وہ کسی ازم یا تحریک سے جڑا کہانی کار تو نہیں ہے اور یہ اس کے فن میں بہتری ہے۔ لیکن افسانے کی روایت، جمالیاتی حس اور فنی باریکیوں سے رشتہ استوار کیے ہے۔ وہ ان معنوں میں ترقی پسند ہے کہ انسان کا بھلا چاہتا ہے۔ اس کے لیے نعرہ نہیں لگاتا، قاری کو زندگی کی کڑواہٹوں، صعوبتوں اور مشکلوں سے آگاہ کرتا چلتا ہے۔ اور اسے ان حالات کو بدلنے اور سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ کسی نہ کسی

جگہ منشی پریم چند کی روایت سے جڑا رہتا ہے اور یہ تقلید نہ ہو کر پاسداری ہے۔''۲؎

آنند لہر نے اپنے آپ کو کبھی کسی تحریک سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ''انحراف'' کے عنوان سے ۲۰۰۲ء میں ادبی دنیا میں متعارف ہوا۔اس مجموعے میں کل ۳۳ افسانے شامل ہیں۔جن میں انسانی نفسیات،ٹوٹتے بکھرتے رشتے، وجودی کشمکش، طبقاتی کشمکش، فکروعبادت کے ارتقائی منازل وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔''انحراف'' تجریدی افسانوں کا مجموعہ ہے۔جس میں شامل تمام ترا فسانے تجریدی ہیں۔۱۹۵۵ء کے بعد اردوادب میں جدیدیت کا دور شروع ہوا تو ادیبوں نے کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش کی۔اس دور میں کئی مغربی رجحانات جنہیں مغربی ادب میں جگہ مل چکی تھی انہیں اردو فنکاروں نے بھی برتنے کی کوشش کی۔اس دور میں جو رجحانات اُردوادب میں آئے ان میں علامت نگاری، پیکریت، اظہاریت اور سرریلزم وغیرہ کے ساتھ ساتھ تجریدی رجحان اہم تھا۔اگرچہ تجریدیت کے نقوش ہمیں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور ممتاز شیری وغیرہ کے ہاں مل جاتے ہیں لیکن اس رجحان کو باضابطہ صورت آزادی کے بعد نئی نسل کے کچھ افسانہ نگاروں نے دی۔۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والے مشہور افسانوی مجموعے''انگارے'' میں بھی ہمیں کہیں نہ کہیں علامتی اور تجریدی افسانے کے نقوش ملتے ہیں۔یہ دراصل روایتی افسانے کے خلاف پہلا قدم تھا۔اردوادب میں مکمل طور پر تجریدی افسانے کا آغاز ۱۹۶۰ء کے بعد ہوتا ہے تاہم اس سے قبل اس کے نقوش مل جاتے ہیں۔آزادی کے بعد لکھنے والوں میں بلراج مین را، دیوندر راسر، سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج کومل، انتظار حسین، احمد ہمیش، انور عظیم اور قمر احسن کے نام قابل ذکر ہیں۔ہندوستان کے طول وعرض سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے تجریدی اور علامتی افسانہ لکھنے شروع کیے۔ایسے میں جموں وکشمیر کے قلم کار بھی ان رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔انہوں نے علامتوں کا برمحل استعمال اپنے افسانوں میں کرنا شروع کیا۔اصل میں جموں وکشمیر کے افسانہ نگاروں کے لیے علامتوں کا استعمال رجحانات وتحریکات کی پیروی کے علاوہ حالات کی مجبوری کا بھی ضامن ہے۔پچھلی کئی دہائیوں سے جموں وکشمیر کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔جن کا کھلے عام اظہار قلم کاروں کے لئے خطرہ بھی ہوسکتا تھا۔جس کے پیش نظر انہوں نے مختلف حالات وواقعات کو پیش کرنے کے لئے علامت نگاری کا استعمال کیا۔

جموں وکشمیر میں علامتی افسانے تو لکھے گئے لیکن جہاں تک تجریدی افسانے کا سوال ہے تو اس ضمن میں آنند لہر پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر جموں وکشمیر میں تجریدیت کا آغاز کیا۔ان کے افسانوی مجموعے ''انحراف'' کا پورا وجود تجریدیت پر منحصر ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں بغیر پلاٹ اور کردار کے ایک خواب آور کیفیت کو ابھارا ہے۔ان کے دوسرے افسانوی مجموعے ''انحراف'' پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نصرت چودھری لکھتی ہیں۔

> ''آنند لہر کے یہاں زیادہ تر اینٹی اور تجریدی کہانی ملتی ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں بغیر پلاٹ اور کرداروں کے خواب آور کیفیت کو ابھارا ہے۔نئے افسانوں میں جہاں موضوعاتی سطح پر زندگی کی بے معنویت، معاشی ناہمواری، طبقاتی تضادات، بے چینی، تنفر، مادیت اور میکانکی عمل کا احساس ملتا ہے وہیں افسانے کے فن میں کئی تجربے بھی ہوئے ہیں۔نئے افسانے میں کہانی پن، پلاٹ اور کرداروں سے قطع نظر اینٹی پلاٹ اور اینٹی کہانی کی جھلک ملتی ہے۔نئے تجریدی افسانے کی تکنیک اور ہیئت روایتی افسانوں سے قدرے مختلف ہے۔آنند لہر کے یہاں زیادہ تر یہی نیا انداز کارفرما ہے۔''۳

زیر بحث افسانوی مجموعے کے تمام تر افسانے بلکہ آنند لہر کے تمام تر افسانے بہت مختصر ہیں۔اختصار کی بنا پر اگر ان افسانوں کو افسانچہ کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ان کے بیشتر افسانے ایک یا ڈیڑھ صفحے پر محیط ہیں۔بہت مختصر وقت میں قاری ان کے افسانوں کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ان کے افسانے مختصر ہیں لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی زندگی پر محیط ہیں۔لہر چونکہ پیشے سے وکیل تھے اس لیے تجزیاتی ذہن رکھتے تھے اور مدلل طریقۂ اظہار پر قدرت رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ بہت کم لفظوں میں مکمل بات کہنے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا۔انور کمال حسینی انحراف کے دیباچے میں ان کی افسانہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''لفظوں کی جمع پونجی کے لحاظ سے افسانے مختصر ہیں لیکن معنویت کے لحاظ سے سمندر ہیں۔کم لفظوں میں بھرپور بات کہنا ان کا مزاج بھی ہے

اورفن بھی۔انحراف کے سب ہی افسانے معنی خیز ہیں اوران افسانوں
میں اٹھائے گئے سوال ہی اپنا جواب ہیں اسی لیے مصنف نے انہیں
تجریدی افسانے کہاہے۔''۴

افسانوی مجموعے''انحراف''میں آنندلہر نے علامتوں اوراستعاروں کا بھرپوراستعمال کیاہے۔انحراف کے ہرافسانے پرجدیدیت کی چھاپ نظرآتی ہے۔افسانوں میں جن علامتوں اوراستعاروں کاعام طورپراستعمال کیاگیا ہےان میں سورج، چاند، کرنیں، ہوا، چہرے، لکیر، طوطا، لفظ، سفر، سڑک، سانپ، انصاف، مجمع باز اورزخم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔آنندلہر نے علامتی کرداروں کا استعمال بھی کیا ہے۔جیسے آواز، الف، ب، ج، س وغیرہ۔لہر کے افسانے علامتی ضرور ہیں لیکن ان میں زندگی کی تلخیوں کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے۔اینٹی پلاٹ، اینٹی کردار اورعلامتوں واستعاروں کے استعمال نے انہیں مشکل ضرور بنادیا ہے۔جس کی وجہ سے یہ کہانیاں عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔اسی لئے انورکمال حسینی نے ان کےافسانوں کےمتعلق لکھاہے کہ۔

''آنندلہر کے یہ افسانے Abstract ضرور ہیں لیکن زندگی کی تلخیاں
ان میں موجود ہیں۔یہ افسانے عام قاری کے لئے نہیں ہیں۔کیونکہ
پہیلیوں میں کہی بات ان ہی کے دل کولگتی ہے جوزندگی سے جھوجھتے ہیں
اورزندگی کے اتارچڑھاؤ کوسمجھنا چاہتے ہیں۔بحیثیت مجموعی''انحراف''
ایک منفردپیشکش ہے۔''۵

''انحراف'' کے بعد ۲۰۰۵ء میں ان کا تیسرا افسانوی مجموعہ''کورٹ مارشل'' کے نام سے منظرعام پر آیا۔اس مجموعے میں کل ۲۲افسانے شامل کیے گئے ہیں۔افسانے پڑھ کراندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔موضوعات میں تنوع کی ان کے یہاں کمی نہیں ہے۔مختلف موضوعات کوفنی ہنرمندی سے پیش کیاہے۔''کورٹ مارشل'' کےافسانوں سےلگتاہے کہ افسانہ نگارجدیدیت کے حصارسےنکل کر حقیقت پسندی کے میدان میں قدم رکھ چکے تھے۔اس سے قبل ان کے افسانوی مجموعے''انحراف'' پرجدیدیت کی گہری چھاپ نظرآتی ہے۔جبکہ''کورٹ مارشل''میں شامل افسانے حقیقت پسندی کے عکاس ہیں۔''کورٹ مارشل'' پرتبصرہ کرتے ہوئے دیپک بُدکی لکھتے ہیں۔

۲۰۰۵ء میں موصوف کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' کے نام سے شائع ہوا۔جس کا مطالعہ کرنے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ نگار جدیدیت کو خیر باد کہہ کر دوبارہ حقیقت پسندی کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔''۶؎

تمام افسانے موضوعاتی جدت کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔آنند لہر نے رشوت خوری، بے ایمانی، دہشت گردی، ہجرت، قدرتی مناظر، عشق ومحبت میں مایوسی وناکامی اور سرحدوں کے دردوکرب جیسے مسائل کو پیش کیا ہے۔۲۰۰۹ء میں موصوف کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' کے نام سے شائع ہوا۔جس میں مختلف النوع موضوعات پر۳۴ مختصر افسانے شامل ہیں۔افسانوں میں زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔آنند لہر ایک حساس افسانہ نگار تھے۔انہوں نے نفرتوں کے ماحول میں انسانی قدروں کی گراوٹ کا نوحہ بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔زیر بحث افسانوی مجموعے میں زیادہ تر افسانے بٹوارہ، سرحدی زندگی اور اخلاقی قدروں کی گراوٹ پر لکھے گئے ہیں۔اس کے علاوہ زندگی کی بعض تلخ سچائیوں کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔''بٹوارہ'' میں شامل افسانوں کے مطالعے سے آنند لہر کی فکر، احساس اور فن افسانہ نگاری پر دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔اس مجموعے کا دیباچہ اشرف حسین نے لکھا ہے۔جس میں آنند لہر کی افسانہ نگاری کا اعتراف کرتے ہوئے وہ یوں رقمطراز ہیں۔

''ان افسانوں کے مطالعے سے آنند لہر کی فکر کا علم ہوتا ہے کہ ان کے اندر کتنا احساس شدت سے موجود ہے۔جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر صفحہ کو رنگین بنا رہا ہے۔زندگی کے یہ نشیب وفراز، بدلتے وقت اور حالات، جذباتی بے کیفی، بے رحم ماحول کی سنگینی اور خود غرضی کے تلاطم میں آنند لہر کا یہ افسانوی مجموعہ عہد جدید کے فلسفۂ حیات کو مؤثر کیفیات سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہے۔''۷؎

افسانوی مجموعہ ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' ۲۰۱۵ء میں منصۂ شہود پر آیا۔یہ ان کا آخری افسانوی مجموعہ ہے۔لہر اردو افسانے کی خدمات بخوبی انجام دے رہے تھے اور ان کے افسانے ملک کے رسائل وجرائد میں تواتر سے شائع ہو کر ادبی دنیا میں دادوتحسین وصول کر رہے تھے لیکن ۲۰۱۶ء کے بعد صحت نے ان کا ساتھ نہ دیا اور وہ بیماری

میں مبتلا ہو گئے ۔جس کی وجہ سے ان کا طویل ادبی سلسلہ مزید جاری نہ رہ سکا۔زیرنظر افسانوی مجموعے میں ۱۳۸فسانے شامل کیے گئے ہیں۔سب سے زیادہ افسانے اسی مجموعے میں شامل ہیں۔ ہرافسانہ اپنے انفرادیت رکھتا ہے۔لہر کے افسانے زندگی کی قاشیں ہیں۔ان کے افسانوں میں انسان کی شکست خوردہ زندگی کی تصویریں صاف دیکھی جاسکتی ہیں۔لہر نے سیاسی اور سماجی نظام کی کمزوریوں اور عصری صداقتوں کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں میں مختلف موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔حقیقت نگاری ان کا اصل مقصد ہے۔وہ امن و سکون، اخوت و بھائی چارے،سماجی برابری اور آپسی اتحاد کے قائل تھے۔لہر جیو اور جینے دو کے فلسفے کے دلدادہ تھے۔انہیں مسائل کو انہوں نے فنکارانہ چابکدستی سے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔زیرنظر افسانوی مجموعے کا ذکر کرتے ہوئے گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

> ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے''ان کا پانچواں افسانوی مجموعہ ہے۔جس میں ہرافسانہ اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ان کے فکشن میں خودغرضی اور انسانی استحصال کی بات ہو یا محبت کے درمیان خلیج کا معاملہ، انسانی امیدوں اور آرزوؤں کی بات ہو یا اخلاقی اور تہذیبی قدروں کا زوال، ہرتصویر ہمیں غور کرنے کی دعوت دیتی ہے۔''[۸]

## افسانوں کے موضوعات

آنندلہر نے اپنے افسانوں میں سماج سے جڑے مختلف مسائل کو پیش کیا ہے۔ان کے ہاں موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔لہر اپنے گردوپیش کے ماحول اور زندگی سے بخوبی واقف تھے۔ان کے افسانوں میں مختلف موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔آنندلہر ایک صاف ذہن انسان تھے۔انہوں نے سماج میں ہورہے حالات وواقعات کا بڑی گہرائی سے مشاہدہ کر کے انہیں اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اپنے افسانوں کے موضوعات کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

> ''میرے افسانوں کے موضوعات عام طور سے سماجی اور سیاسی ہوتے ہیں۔جو دیکھتا ہوں وہی لکھتا ہوں۔سماج میں ہورہی برائیوں پر سے غفلت کا پردہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔۔۔۔اور سماج میں شریف

الشکال صفت بھیڑیا انسانوں کے منہ پر سے کالا پردہ اٹھانے کی کوشش
کرتا ہوں۔"۹

لہر نے اپنے افسانوں میں آفاقی نوعیت کے کئی موضوعات کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔افسانوں کے موضوعات جتنے اہم ہیں انہیں اتنے ہی مؤثر اور سیدھے سادے انداز میں پیش کیا ہے۔جب ہم ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے انہوں نے مختلف موضوعات کو پیش کیا ہے۔جن میں سرحدوں کا دردو کرب،ملکوں کی آپسی رنجشیں،نسلی امتیازات،مشترکہ تہذیب کا بکھراؤ،انسانی رشتوں کا تقدس اور ان کی بے حرمتی،طاقت کا بے جا استعمال،غریبوں کا استحصال،انسانی کم ظرفی،خودغرضی،ماحولیاتی کثافت،رشوت خوری،مفلسی و ناداری،اخلاقی قدروں کی گراوٹ،مذہبی تفرقات،سماج میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافیاں،عشق ومحبت اور ازدواجی زندگی،طبقاتی کشمکش،سیاسی بدحالی،عدلیہ نظام کی خامیاں اور بے جوڑ شادی جیسے مسائل کو فن کارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔مختلف موضوعات کے تحت لکھے گئے افسانوں کا تجزیہ راقم الحروف نے یوں کیا ہے۔

## سرحدیں

۱۹۴۷ء میں ہندوستان صدیوں کی غلامی کے بعد غیروں کے چنگل سے آزاد ہوا تو ہر طرف خوشی وشادمانی کی لہر دوڑ گئی۔لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تقسیم ملک کے سانحہ نے لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔سیاست نے ملک کے دو ٹکڑے کر دئے۔جس کے نتیجے میں مارکاٹ اور دھنگے فساد ہوئے۔بٹوارے نے جو زخم دونوں ملکوں کے معصوم لوگوں کو دئے ان کا منظرنامہ آج برسوں بعد بھی اگر دیکھنے،سننے یا پڑھنے میں آئے تو دل دہل جاتا ہے۔تقسیم ہند کے سانحہ نے ہزاروں لوگوں کو بے گھر کر دیا۔کئی بے گناہوں کا قتل عام ہوا،معصوموں کی عزتیں لوٹی گئیں،ماؤں کی گودیں خالی ہوگئیں۔بٹوارہ صرف وقتی قتل وغارت،ظلم وجبر اور لوٹ کھسوٹ تک محدود نہ رہا بلکہ اس نے دوملکوں کو تقسیم کر کے ان کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی خلا پیدا کر دی۔خونی رشتے بکھر گئے،لوگ اپنوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔سرحدوں کا کھیل کھیلنے والوں نے دونوں ملکوں کے لوگوں کی آرزوؤں،امنگوں،خواہشات اور ضروریات کو مدنظر نہ رکھتے ہوئے سرحدیں متعین کر دیں۔جو آس پاس بسنے والوں کے لئے عذاب بن گئیں۔تقسیم ملک کا یہ المناک سانحہ شاعروں اور ادیبوں کے لیے ایک اہم موضوع بنا۔جس پر ہمارے بے شمار شاعروں اور ادیبوں نے بہت کچھ لکھا۔ان قلم کاروں میں ایک نام آنندلہر کا بھی ہے۔آنندلہر نے سرحدوں پر بہت کچھ لکھا

ہے۔جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ آنند لہر نے جموں وکشمیر کے دور دراز سرحدی ضلع پونچھ میں جنم لیا جہاں برسوں سے گولی اور بارود کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ان کے آباواجداد سرحد کے بالکل قریب رہتے تھے۔اس لئے آنند لہر نے سرحدی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا۔ایسی صورتحال میں کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ جب کوئی حساس دل ادیب ایسے ماحول میں آنکھیں کھولے اور وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ جہاں ہر وقت گولی اور بارودں کی آوازیں سنائی دیں اور معصوموں کا قتل عام ہوتا ہو۔ایسی صورتحال میں ایک ادیب کے ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال در آتا ہے کہ آخراس کی وجہ کیا ہے۔آئے روز گولیاں کیوں چلتی ہیں بارود کی آوازیں کیوں سنائی دیتی ہیں۔انسانوں کی لاشیں کیوں اٹھائی جاتی ہیں۔اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس درد وکرب کا نتیجہ سرحدیں ہیں۔جن کی دفاع کے لیے یہ سب کیا جاتا ہے۔

آنند لہر سرحدوں کے بالکل خلاف تھے۔وہ سرحدوں کا خاتمہ چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں اس موضوع کو مرکزیت حاصل ہے۔وہ اپنی بیشتر تخلیقات میں سرحدوں کی مذمت کرتے ہوئے اور ان کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ان کے چند افسانے جن میں سرحدیں اور ان سے پیدا شدہ مسائل کو پیش کیا گیا ہے کا اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

افسانہ ”سرحد کے اس پار“ ان کے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل ہے۔گوپی اور روشن افسانے کے مرکزی کردار ہیں۔جو سرحد کے آر پار ایک دوسرے کے آمنے سامنے رہتے ہیں۔اچانک ان کی نظریں ایک دوسرے سے ملتی ہیں اور انہیں پیار ہوجاتا ہے۔گوپی اور روشن سرحد پار کر کے ایک دوسرے سے ملنے کا سلسلہ شروع کرتے ہیں لیکن سرحد ان کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔یہاں افسانہ نگار یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر سرحد دودلوں کو آپس میں پیار کرنے سے نہیں روک سکتی تو ان کو ملنے سے کیوں روکتی ہے۔اگر دونوں ملکوں کے لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے پیار ومحبت ہے، دونوں ملکوں کے لوگوں کا درد وکرب ایک جیسا ہے،خوشی وغمی ایک جیسی ہے،آب و ہوا ایک جیسی ہے تو پھر درمیان میں سرحد قائم کر کے ان کی آرزؤں، امنگوں اور خواہشات کو کیوں ختم کیا جاتا ہے۔دراصل وہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ سرحد دو ملکوں کے درمیان نفرت پیدا کرنے کا نام ہے۔روشن اور گوپی کی آپسی محبت کے ذریعے افسانہ نگار نے دونوں ملکوں کے عوام کی باہمی محبت کو اجاگر کرنے اور سرحد کو ان کے درمیان خلا اور نفرت پیدا کرنے کا ذریعہ بتایا ہے۔جس کا ذکر کرتے ہوئے وہ افسانے میں یوں رقم طراز ہیں۔

''ایک دن دونوں ملے تو گوپی نے روشن سے پوچھا ''کس کس سرحد کو
پار کرے کوئی! فرقوں کی سرحد، مذہبوں کی سرحد، قوموں کی سرحد، لوگ
ان سرحدوں کو مٹا کیوں نہیں دیتے؟''
گوپی بولی ''یہی تو بدقسمتی ہے۔ لوگ سرحدوں کو بدلتے ہیں، انہیں ختم
نہیں کرتے۔ وہ جھگڑتے ہیں، خون بہاتے ہیں، مگر پھر ایک نئی سرحد
قائم کر لیتے ہیں۔''۱۰

گوپی اور روشن ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ ایک دن اچانک گوپی کی ماں کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے جس کا پتہ کرنے کے لئے روشن سرحد پار کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی دوران وہ گرفتار ہو جاتا ہے۔ سرحد پار کرنے کے جرم میں اسے قید کیا جاتا ہے اور طرح طرح کی سزائیں دی جاتی ہیں۔ جب اسے سرحد پار کرنے کا راز بتانے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ دونوں طرف انسان ہیں، بھوک ہے، سیلاب ہے، موت ہے، آگ اور بیماریاں ہیں۔ سپاہی کو اس کا بے باک جواب ناگوار گزرتا ہے اور اسے عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں اسے اپنی صفائی میں کچھ کہنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ تب وہ بتاتا ہے کہ سرحدیں دراصل سیاست کا کھیل کھیلنے والوں نے صرف دونوں ملکوں کے عوام کے لئے متعین کی ہوئی ہیں۔ جو صرف بے گناہ لوگوں کے لئے پابندی عائد کرنے کا نام ہے۔ بلیڈروں، چوروں، اچکوں اور ظلم کرنے والوں کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ جس کی منظر کشی آنند لہر نے افسانے میں یوں کی ہے۔

رات بھر مار کھانے کے بعد بے ہوش ہو گیا۔ صبح جب اسے ہوش آیا تو
اس نے دیکھا کہ وہ ایک فوجی عدالت میں کھڑا ہے اور ایک آفیسر اسے
پوچھ رہا ہے: تمہیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟
''کہنا نہیں، پوچھنا ہے۔'' روشن نڈر ہو کر بولا۔
''پوچھو۔''
''جب دونوں ملکوں کے لیڈر ملتے ہیں، فوجی ملتے ہیں، چور ملتے ہیں
اسمگلر ملتے ہیں، جج ملتے ہیں، کھلاڑی ملتے ہیں تو عام لوگ کیوں نہیں مل

سکتے ؟''۱۱

دراصل افسانہ نگار یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے ہاں لوگوں کے مسائل ایک جیسے ہیں۔ان مسائل کوحل کرنے کے لئے حکومت کوکام کرنا چاہیے۔اس کے بجائے وہ سرحدیں متعین کرنے اوران کی دفاع کرنے میں مصروف ہیں۔ نیز یہ کہ سرحدیں قائم ہونے کے باوجوددونوں ملکوں کے درمیان غلط کام انجام دیے جارہے ہیں اور سرحدوں کی پاداش میں تمام تر جرائم انجام دیے جارہے ہیں۔سرحدیں ان پر پابندی عائد کرنے میں بالکل ناکام ہیں۔سرحدیں صرف ان لوگوں کومحصورومجبور کرنے کے لیے قائم کی گئی ہیں جن کی لیڈروں اور بڑے لوگوں کے لیے کوئی اہمیت نہیں۔سرحدوں کا وجودصرف سیاسی مفاد کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

اس موضوع پرایک اورافسانہ''بٹوارہ'' ہے۔جو چوتھے افسانوی مجموعے''بٹوارہ'' میں شامل ہے۔اس میں آنندلہر نے ایک گاؤں کوموضوع بنایا ہے۔جوعلامتی انداز میں متحدہ ہندوستان کی پیروی کرتا ہے۔گاؤں کے لوگ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں اورآپسی بھائی چارہ کی عمدہ مثال قائم کرتے ہیں۔پرامن زندگی گزارر ہے ہوتے ہیں لیکن اچانک ایک دن معمولی بات پران کے درمیان اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔معمولی بات آہستہ آہستہ عروج پکڑنا شروع ہوجاتی ہے اورنفرتوں کی ہواؤں کو چلنے کا موقع مل جاتا ہے۔لوگوں کے درمیان نفرت بڑھنا شروع ہوجاتی ہے۔جس کوآنندلہر نے یوں بیان کیا ہے۔

> ''بات کوئی زیادہ بڑی نہیں تھی مگر بڑی ہوگئی۔ایک لڑکے کا گیند مٹکی سے
> ٹکرا گیا۔مٹکی نہ ٹوٹی اورنہ ہی گیند کوکوئی نقصان ہوا مگر نفرت کی ہوا کوتیز
> چلنے کا موقع مل گیا۔''۱۲

معمولی بات پرلوگوں کے درمیان نفرت پیدا ہوگئی اوروہ دوطبقوں میں بٹ گئے۔انہوں نے ایک دوسرے پرحملہ کرنا اور ماروفساد شروع کرلیا۔گاؤں کے دانشوروں نے انہیں سمجھایا کہ ایسا نہ کرو۔ایسا کرنے سے گاؤں دوحصوں میں بٹ سکتا ہے۔لیکن جولوگ اس نفرت اورفساد کے انجام سے ناآشنا تھے انہوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور بالآخرایک دن گاؤں دوحصوں میں بٹ گیا۔لوگ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے ،ضروریات کا سامان بٹ گیا۔گاؤں کے بٹوارے کے بعدلوگوں کومحسوس ہوا کہ سرحد قائم ہونے سے وہ بہت کچھ کھو چکے ہیں۔ بہت سارے قدرتی وسائل جوقوم کے لوگوں کا مشترکہ اثاثہ تھا اب سرحدوں میں مقید ہو چکا ہے۔سرحد کے ایک طرف جس چیز کی

بہتات ہے دوسری طرف اس کا قحط ہے۔لیکن سرحد کی وجہ سے لوگ انہیں سا جھا نہیں کر سکتے۔جس کی منظر کشی افسانے میں لہر نے یوں کی ہے۔

''اس وقت کافی باتوں کا ہمیں علم نہیں ہوا۔میرے کھیت سوکھے ہیں اور ساتھ میں دریا کا پانی بہتا ہے۔'' راج دین نے کہا۔

''سرحد کے اس پار سیلاب آتا ہے اور فصل تباہ ہوتی ہے اور سرحد کے اس پار سوکھا پڑتا ہے اور فصل تباہ ہوتی ہے۔اور بھوک دونوں طرف کے لوگوں کو برابر گتی ہے۔'' ۱۳؎

دراصل اس افسانے میں آنند لہر نے ہندستان کے بٹوارے کی عکاسی کی ہے۔متحدہ ہندستان ایک بہت بڑا ملک تھا جو مشترکہ تہذیب کا دلدادہ تھا۔جہاں مختلف مذاہب کے لوگ بھائی چارے کو قائم رکھے ہوئے امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے اور کسی بھی صورت میں اس کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔لیکن سیاست کا کھیل کھیلنے والے کچھ مفاد پرست لوگوں نے ہندستان کی صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب کو اپنے ذاتی مفاد کے لئے ختم کر دیا۔معمولی بدگمانیوں کی وجہ سے اور کچھ لوگوں کے ذاتی مفاد کی خاطر مشترکہ تہذیب کا گہوارہ اور امن و بھائی چارے کا پیکر ایک مضبوط ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔جس کی تقسیم سے لوگوں کے دل مجروح ہونے کے ساتھ ساتھ قدرتی وسائل بھی بٹ گئے۔دراصل عوام بٹوارے کے حق میں نہیں تھے۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب فناہ ہو،خونی رشتے بکھریں اور انہیں ایک دوسرے سے جدا کر کے ان کے درمیان ایک نہ ختم ہونے والی لکیر کھینچ دی جائے۔لیکن کچھ مفاد پرست لوگ ایسے تھے جن کی نادانی کی وجہ سے بٹوارے کا کھیل کھیلا گیا۔جس کے دیرپا اثرات ثابت ہوئے اور بعض لوگوں کو اس بات کا احساس وقت گنوانے کے بعد ہوا۔جس کو افسانہ نگار نے یوں پیش کیا ہے۔

''یہ راج دین اس وقت بٹوارے کے حق میں بڑے نعرے لگا رہا تھا ۔کیا اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے بیٹے نے بیمار ہونا ہے اور فقیر چند کی دوائی ضروری ہے۔'' ۱۴؎

افسانہ ''یہ سرحدیں'' بھی اسی موضوع پر محیط ہے۔اس میں بھی سرحد اور اس کی وجہ سے لوگوں کو درپیش مشکلات کو پیش کیا گیا ہے۔آنند لہر نے بیانیہ انداز میں راجہ نامی ایک سپاہی کی زندگی کو پیش کرنے کی سعی کی

ہے۔راجہ جوایک ایماندار اور سچا انسان ہے اور تمام مذاہب کا احترام کرتا ہے۔اس کی نظر میں عورت کا مقام بڑا عظیم ہے اور وہ عورتوں کی بڑی عزت کرتا ہے۔راجہ فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے اور اسے سرحد پر تعینات کیا جاتا ہے۔ جہاں وہ دیانتداری سے اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ایک دن اچانک سرحد کی دوسری طرف ایک عورت کا بلاتکار ہوتا ہے اور اس کی چیخ و پکار سن کر راجہ سرحد پار کر کے اس کی عزت بچانے کے لئے چلا جاتا ہے۔راجہ چونکہ عورت کی بڑی عزت کرتا تھا اور اس کی نظر میں عورت کا مقام سرحد سے کئی گناہ بلند تھا اس لئے وہ سرحد کی پرواہ کئے بغیر اس کی عصمت بچانے کے لیے سرحد کے دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ عورت کی عزت بچانے میں تو کامیاب ہوتا ہے لیکن اسی دوران اسے دوسرے ملک کے سپاہی گرفتار کر لیتے ہیں اور اسے جاسوسی کا الزام لگا کر جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔جس کی منظر کشی افسانہ نگار نے یوں کی ہے۔

’’اس نے ایک سپاہی سے پوچھا

’’میرا جرم۔۔۔؟‘‘

’’تم نے سرحد پار کی ہے۔‘‘

’’مگر میں نے تو ایسا ایک عورت کی عزت بچانے کے لئے کیا ہے۔‘‘

’’مگر وہ تو دوسرے ملک کی ہے۔‘‘ ۱۵؎

راجہ پہ سرحد کراس کرنے کا الزام لگ جاتا ہے۔اور اسے جاسوسی کے الزام میں پانچ سال کی قید با مشقت ہو جاتی ہے۔جبکہ اپنے ملک کے لوگ بھی اسے غدار سمجھتے ہیں کہ وہ دوسرے ملک کی عورت کی عزت بچانے کے لئے نہیں بلکہ اس کے ساتھ ناجائز تعلقات کی وجہ سے گیا ہے۔سب کو معلوم تھا کہ وہ بے گناہ ہے لیکن سرحد کے سانپ نے سب کو سونگھ لیا تھا جس کی وجہ سے کوئی بھی اسے بے گناہ کہنے کو تیار نہ تھا۔کیونکہ سرحد کا وجود ہی ظلم و جبر، بے ایمانی اور قتل و غارت کی وجہ سے قائم ہے۔اور سرحد کا وجود قائم رکھنے کے لئے یہ چیزیں ضروری ہیں۔ جب تک سرحدیں ختم نہ ہوں، یہ مصائب و آلام ختم نہیں ہو سکتے۔تمام بدکاری اور مصیبتوں کی جڑ سرحدیں ہیں۔اس لئے افسانہ نگار کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کے خاتمے کے لئے سرحدوں کا خاتمہ ضروری ہے۔افسانے کے آخر میں افسانہ نگار کا نقطۂ نظر واضح طور پر سامنے آتا ہے۔افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔جس پر آنند لہر نے افسانے کا اختتام کیا ہے۔

’’سب کو معلوم تھا کہ وہ بے گناہ ہے مگر کوئی بھی شخص یہ بات ماننے کے

لیے تیار نہیں تھا۔وہ سمجھ گیا کہ جب تک یہ سرحدیں قائم ہیں، انسانی رشتوں کی موت ہوتی رہے گی۔اور دنیا میں کوئی چیز محفوظ نہیں ہے۔یہاں تک کہ انسانی جسم بھی محفوظ نہیں ہے۔لہذا جنگ انسانوں کے خلاف نہیں بلکہ سرحدوں کے خلاف ہونی چاہئے اور لڑائی ملک کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ عورت کی عزت بچانے کے لئے ہونی چاہئے۔‘‘۱۶

سرحدیں نفرت، جرائم اور کشیدگی کی جڑیں ہیں۔ بلاشبہ یہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے لیکن آنند لہر نے اپنی فنی صلاحیتوں کے پیش نظر سرحدوں کے آس پاس رہنے والے لوگوں کے مسائل کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

## خواتین کے مسائل

عورت کا سماج میں ایک الگ مقام ہے۔آج کے دور میں جہاں عورتوں کو مرد کے مساوی حقوق دیے جانے اور ہر میدان میں ان کے شانہ بشانہ کھڑا کرنے کی باتیں کی جارہی ہیں۔وہیں ایسے بہت سارے مسائل ہیں جن میں عورت کا مقام قابل رحم ہے۔سماج میں عورتوں کے حقوق پامال کیے جارہے ہیں، ان کی عصمت دری ہورہی ہے۔بلاشبہ کوئی بھی مذہب عورت کے استحصال کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی کوئی ملکی قانون اس کے ساتھ ناانصافی کا درس دیتا ہے۔لیکن پھر بھی نہ مسائد حالات اور بعض سماجی برائیوں کی وجہ سے آئے روز یہ سلسلہ بڑھتا ہی جارہا ہے۔ان مسائل کو اپنی تخلیقات کے ذریعے جن قلم کاروں نے پیش کیا ہے ان میں ایک نام آنند لہر کا بھی ہے۔لہر نے سماج میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو بروئے کار لانے کی سعی ہے۔اس ضمن میں ان کا ایک افسانہ’’پھول والی‘‘ پیش کیا جاسکتا ہے۔جس میں کنول نامی ایک حسین لڑکی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔جو بہت خوبصورت ہے لیکن انتہائی غریب ہے۔کنول پھول بیچ کر اپنا گزارا کرتی ہے۔اور اس کا خوبصورت جسم لوگوں کی ہوس بری نظروں کا شکار ہوتا ہے۔ہر کوئی اس کی مفلسی اور بے بسی کا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔جس کی تصویر کشی کرتے ہوئے افسانہ نگار لکھتے ہیں۔

’’لگتا تو یہ بھی ہے کہ لڑکیاں پھول ہی نہیں بلکہ اپنی جوانی کے حسین لمحے بیچ رہی ہوں اور خریدنے والے عمر کے عوض آرزوئیں خرید رہے

ہوں۔''۱۷

اسی دوران گلاب نام کا ایک خوبصورت نوجوان بھی اس سے پھول خریدتا ہے۔کچھ روز یہ سلسلہ چلتا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔گلاب کنول کو بے انتہا چاہنے لگتا ہے۔وہ ہر روز اس سے پھول خرید کر مندر میں چڑھانا شروع کر دیتا ہے۔اسی دوران نرگس نامی ایک خوبصورت لڑکی اسے چاہنے لگتی ہے اور اس سے اپنی محبت کا اظہار بھی کرتی ہے لیکن گلاب صرف کنول کو چاہتا ہے۔وہ کنول سے پھول خریدتا ہے یہاں تک کہ پھول خریدنے کے لئے اپنا سب کچھ کھو دیتا ہے،اپنا خون تک بیچ دیتا ہے۔لڑکیاں سخت سنگھ نام کے ایک شخص سے پھول خرید کر بیچتی تھیں۔جو دولت مند تھا لیکن بہت بدضمیر اور سخت۔کچھ عرصہ بعد وہ قیمت لئے بغیر کنول کو پھول دینا شروع کر دیتا ہے تاکہ وہ اس کی مقروض ہو کر اس کے عوض اس سے شادی کرنے پر مجبور ہو۔بالآخر سخت سنگھ کنول سے شادی کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور یوں خوبصورت کنول اور گلاب،سخت سنگھ کے نوکیلے ناخنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔جس کی منظر کشی افسانہ نگار نے یوں کی ہے۔

> ''سخت سنگھ کنول کو اپنی خوبصورت کار میں بٹھا کر لے گیا اور اسے رشتوں کی زنجیر میں باندھ دیا۔کنول اب بھی پھول بیچنے کار میں آتی ہے اور سخت سنگھ کی تیسری مگر خوبصورت بیوی کے طور پر جانی جاتی ہے۔''۱۸

دراصل افسانے میں فنکار کا مقصود یہ ہے کہ ہمارے سماج میں مفلسی اور غربت کی وجہ سے خوبصورت اور نو عمر لڑکیاں بدصورت،معمر اور بدضمیر لوگوں سے دولت کی لالچ میں شادی کر لیتی ہیں۔جبکہ خوش اخلاق،خوبصورت اور محبت میں ایثار و قربانی کا جذبہ رکھنے والے نوعمر لڑکے غربت و مفلسی کی وجہ سے اپنی محبت کھو جاتے ہیں۔نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ غریبوں کی پھول جیسی حسین اور نازک بچیاں مجبور ہو کر سرمایہ داروں کے ہاتھوں بک جاتی ہیں۔

افسانہ ''تندور'' ایک مختصر لیکن خوبصورت افسانہ ہے۔اس میں ان عورتوں کا ذکر ہوا ہے جو اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہیں۔افسانہ نگار نے جسم فروش عورتوں کو موضوع بنا کر سماج میں بسنے والے ان لوگوں کے چہروں سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے جو عورتوں کو جسم بیچنے پر مجبور کرتے ہیں اور ان کے جسم کو اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں۔دراصل عورت کے ساتھ یہ سلسلہ صدیوں پرانا چلا آ رہا ہے۔مرد اپنی غریبی چھپانے کے لیے

عورتوں کو فروخت کرتے ہیں۔ مذہبی اور سیاسی رہنما بھی اس مرض سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔عورت کو سماج میں دیوی، ماں، بہن اور بیوی جیسے خوبصورت ناموں سے پکارا ضرور جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا بلاتکار بھی کیا جاتا ہے۔جس کی منظرکشی آنند لہر نے افسانے میں یوں کی ہے۔

> ''یگوں سے تمہارا سودا ہو رہا ہے۔تم بک رہی ہو، نیلام ہو رہی ہو،تم کہتی ہو تمہاری عمر سترہ برس کی ہے۔صدیاں گزر گئی ہیں ماں بہن ہو کر بھی دیوی ہو کر بھی تمہارا بدن چاٹ کی طرح بک رہا ہے۔لوگ تمہارے گیارہ برس کے بدن کو ساٹھ برس کی ہوس کے ترازو میں تول رہے ہیں،کبھی تمہارا باپ تمہیں بیچتا ہے،کبھی بھائی،کبھی خاوند اور ایسا تو کئی یگوں سے ہو رہا ہے۔''۱۹

افسانہ نگار نے سماجی نظام پر طنز کرتے ہوئے سماج کو ان عورتوں کی بے بسی کا مجرم قرار دیا ہے۔ نیز یہ کہا ہے کہ انسان اتنی ترقی کر گیا ہے کہ وہ سورج اور چاند پر کمندیں ڈال رہا ہے لیکن بدقسمتی سے آج تک ان بے سہارا اور مجبور عورتوں کے لئے کوئی ایسی تدبیر نہیں سوچ سکا جو غربت و بے بسی کی وجہ سے اپنا جسم بیچتی ہیں۔جن کی منظرکشی کرتے ہوئے لہر افسانے میں لکھتے ہیں۔

> ''انسان کی عمر دھرتی پر ہزاروں برس کی ہوگی اور پھر اس کے بعد آپ کی عمر بھی مگر عجیب بات ہے کہ اس کا باپ ایک گھر نہ بنا سکا۔انسان چاند پر چلا گیا اور اب مریخ کی تلاش میں ہے۔ یہ انسان ہی ہے جس نے سمندروں کو موڑا، پہاڑوں کا جگر چاک کیا۔ یہ انسان ہی تھا جو خدا کا پیغام دھرتی پر لایا یہ انسان ہی ہے جو یگوں سے بے گھر ہے اور آج بھی اپنا گھر بنانے کے لیے اپنی بیٹی کو بیچتا ہے۔''۲۰

آنند لہر نے اس مقام کو تندور سے تعبیر کیا ہے جہاں عورتوں کے جسم بکتے ہیں،جسم کا سودا ہوتا ہے۔ جہاں خوبصورت جسم اپنی بے بسی و ناداری کی وجہ سے جلتے ہیں، درندوں کا شکار ہوتے ہیں۔افسانہ نگار نے ایک ۱۷ برس کی نوعمر حسین لڑکی کو مرکز بنا کر سماج کے اس غلیظ دھندے کو اجاگر کیا ہے۔اور وہ کوٹھا جہاں جسموں کا سودا ہوتا ہے تندور

کی مانند قرار دیا ہے۔ جس میں ہزاروں جسم فناہ ہوتے ہیں۔ جس کی منظر کشی آنند لہر نے بڑے خوبصورت انداز میں یوں کی ہے۔

"کیونکہ برسوں سے یہ تندور دہک رہا ہے۔ جس میں یہ جسم جل رہے ہیں۔ جوانیاں پھونکی جا رہی ہیں، وہ بدن جن پر غزلیں کہی جاتی ہیں، شاعری کی جاتی ہے، مصور جن کی تصویر بناتے ہیں ان کا مقدر یہی تندور ہے۔" ۲۱

یہ وہ تندور ہے جس کو جلائے رکھنے میں سماج کے وہ بڑے بڑے لوگ ملوث بھی ہیں اور ان میں جلتے ہوئے بدنوں کی بے چارگی کا ماتم بھی کرتے ہیں۔ جس سے انسان کا دوغلہ پن ظاہر ہوتا ہے۔

افسانہ "جسم بستی" ایک یتیم لڑکی ثریا کی کہانی ہے۔ جس کا باپ بچپن میں مر جاتا ہے اور اس کا چچا اس کے باپ کی موت کے بعد اس کی جائیداد حاصل کرنے کے لئے اسے ایک ہزار روپیہ میں بیچ دیتا ہے۔ وہ اسے آوارہ اور بدچلن قرار دے کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ دراصل یہ سلسلہ زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے کہ عورت اپنی بے بسی اور لاچاری کی وجہ سے سماج میں ظلم وعتاب کی شکار ہوتی رہی ہے۔ ہر مذہب اور ہر ملک کے لوگ اس بدکاری میں شامل ہیں۔ ہر زبان میں عورت کو بیچنے اور خریدنے کے طریقے موجود ہیں۔ اور یہ ایک نا ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ بے رحم سماج کے ہاتھوں معصوم بچیوں کی عصمت دری کا سلسلہ صدیوں پرانا چلا آ رہا ہے جو ہنوز جاری ہے۔ عورتیں کہیں اپنی بے بسی اور غربت کی وجہ سے چکلوں کی رونقیں بنتی ہیں اور کہیں معمر مردوں کے ساتھ شادی کے بندھن میں بندھ کر ان کی ہوس کا شکار۔ کئی بار ماں باپ مجبور ہو کر اپنی کمسن وحسین لڑکیوں کو روٹی کے ٹکڑوں کے لئے عمر رسیدہ لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ جس کی تصویر کشی آنند لہر نے یوں بھی ہے۔

"چھوٹی چھوٹی معصوم لڑکیاں چند سکوں کے عوض بڑے بڑے عمر رسیدہ لوگوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ کئی نوجوان لڑکیاں محض روٹی کے عوض ہوس پرستوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔ کہیں بیماریوں کے علاج کے لیے تو کہیں کھیت چھڑانے کے لئے حوالے سے صدیوں سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔" ۲۲

چاچا کے ہاتھوں بکنے والی کمسن ثریا بڑی ہو کر ایک چکلے کی رونق بنتی ہے۔ جو اپنی خوبصورتی کی وجہ سے ہر کسی کے لئے جاذب نظر بنتی ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی ہوس کا شکار ہوتی ہے۔ ایک عرصے کے بعد ثریا کے دل میں اس پیشے کے خلاف بغاوت کرنے کا عزم پیدا ہوتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس کی طرح ہر لڑکی اسی طرح ہوس کا شکار ہوتی ہے۔ ثریا مصمم ارادہ کر لیتی ہے کہ وہ اس سسٹم کے خلاف آواز بلند کرے گی تا کہ سماج کی ہر لڑکی کو اس سے نجات دلا سکے۔ جس کے لئے ثریا الیکشن لڑنا چاہتی ہے تا کہ ممبر اسمبلی بن کر اسمبلی میں عورتوں کے حق میں آواز بلند کر سکے۔ الیکشن کا وقت آتا ہے، تمام سیاسی جماعتیں چہ مگوئیاں شروع کرتی ہیں۔ بالآخر کوئی بھی جماعت اس لئے ثریا کے خلاف کوئی امیدوار کھڑا نہیں کر سکتی کیونکہ انہیں خوف ہوتا ہے کہ ثریا کے خلاف بغاوت کرنے سے ان کا پردہ فاش ہو جائے گا۔ لیڈر لوگ چکلے پر جاتے تھے اور جسموں کا سودا کرتے تھے۔ جس سے انہیں ڈر تھا کہ کہیں ثریا ان کا وہ راز نہ آشکار کر دے۔ اس لیے وہ مجبوراً ثریا کے حق میں بولنے لگتے ہیں۔ افسانہ نگار بڑے خوبصورت انداز میں اس منظر کو یوں پیش کرتے ہیں۔

> ''انہیں ڈر تھا کہ ثریا جب ان کے خلاف بولے گی تو وہ تمام بھید کھول دے گی۔ جو آج تک پردے میں ہیں۔ اس کے الفاظ ان دیواروں میں سوراخ پیدا کریں گے جن کے اندر ان کی وہ خواہشیں رہتی ہیں جنہوں نے رشتوں کے لباس پہنے ہوئے ہیں۔'' ۲۳؎

ثریا الیکشن میں کامیاب ہو جاتی ہے اور وہ اعلان کرتی ہے کہ وہ عورتوں کو سماج میں ایک الگ مقام دلائے گی، انہیں جسم کے کاروبار سے نجات دلائے گی۔ لیکن اسی دوران اس کے خوابوں کے ساتھ ایک بار پھر کھلواڑ ہوتا ہے۔ جب مختلف سیاسی جماعتوں سے تعلق رکھنے والے اپنی اپنی اکثریت کے لیے اسے خریدنے کے لئے اسے پیسوں کی لالچ دیتے ہیں۔ تب اسے لگا تا ہے کہ عورت سماج میں جس جگہ جس مقام پر ہو اس کے ساتھ ناانصافیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

مختصر یہ کہ افسانہ نگار نے مختلف سماجی صورتحال کو بظاہر لا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سیاسی اور سماجی نظام اس قسم کا ہے کہ اس میں عورت کو ہر مقام پر ذلت اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ ناانصافیوں کا سلسلہ زندگی کے ہر محاذ پر جاری ہے۔

افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' میں شامل افسانہ ''چند لمحے'' بھی اسی موضوع کی عکاسی کرتا ہے۔اس افسانے میں بھی سماج میں عورت کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو دکھایا گیا ہے۔آشا اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو ایک سلیقہ مند، باشعور، فرماں بردار اور بااخلاق خاتون کا کردار ہے۔آشا کی جب شادی ہوتی ہے تو وہ اپنے اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے سسرال میں خوب عزت کماتی ہے۔سسرال والے اس سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور وہ بھی ان کا حد درجہ خیال رکھتی ہے۔ان کی خاطر خواہ تواضع اور عزت کرتی ہے۔آشا کے کردار کی تصویر کشی کرتے ہوئے آنند لہر یوں رقم طراز ہیں۔

> ''آشا بہت خوبصورت ہے۔لگتا ہے گھر کی آتما ہے۔دیور، ساس، سسر اس کے گرد گھومتے ہیں۔گھر کی دیواروں کے اندر لگتا ہے اس کا ہی نام بسا ہے۔سب کوئی آشا، آشا کرتے ہیں۔کوئی برتن جب ٹوٹتا ہے تو لگتا ہے کہ آشا کو بلا رہا ہے۔''۲۴

آشا نہ صرف اپنے گھر میں بلکہ پورے محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ہر کوئی اسے پیار کرتا ہے۔اس کا پتی کرشن فوج میں سپاہی بن جاتا ہے۔شادی کے صرف دو ماہ بعد سرحدوں پر جنگ ہوتی ہے جس میں کرشن مارا جاتا ہے اور نئی نویلی دلہن آشا بیوہ ہو جاتی ہے۔آشا کرشن سے بے حد پیار کرتی تھی۔اس کی موت کے بعد وہ ماری ماری پھرتی ہے۔اس دوران کرشن کا دوست سکھرام ریٹائر ہو کر گھر آتا ہے۔وہ کرشن کا دوست اور پڑوسی بھی تھا۔کرشن کی موت پر اسے آشا کے گھر آنے جانے اور اس سے ہمدردی دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔سکھرام موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آشا کے گھر آنا جانا شروع کر لیتا ہے اور کرشن کی خوب تعریفیں کرتا ہے۔جو کرشن کے ماں باپ کو بہت پسند آتی ہے۔سکھرام کا آنا جانا عام ہو جاتا ہے۔ایک دن اتفاق سے آشا کے گھر والے ایک میلے میں جاتے ہیں اور آشا گھر پر اکیلی رہ جاتی ہے۔سکھرام موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے آشا کے گھر میں داخل ہوتا ہے اور زبردستی اس کی عزت تار تار کر دیتا ہے۔جس سے آشا کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ہر کوئی اسے نفرت سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔آشا جو گھر محلے میں بہت مقبول تھی، ہر ایک کی نگاہ میں باعزت اور پیار و محبت کا پیکر تھی۔یکدم اپنا وقار، اپنی عزت کھو جاتی ہے۔جبکہ سکھرام پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔آشا جس کو گھر اور سماج میں پیار و محبت اور عزت سے لوگ مختلف القاب سے پکارتے تھے اس کے بعد نفرت سے برے برے ناموں سے پکارنا شروع کر دیتے

ہیں۔جس کی تصویر کشی کرتے ہوئے افسانہ نگار لکھتے ہیں۔

> ’’اس کے بعد سب اسے آشا کے بجائے آشرا کے نام سے پکارتے ہیں۔اگر برتن دھو رہی ہو تو اور اس کے آگے رکھ دیتے ہیں۔کہیں جاتے ہیں تو اسے ساتھ نہیں لے جاتے۔مائیں اپنے بچوں کو اس سے ملنے نہیں دیتی ہیں۔محلے کے لوگ اس کی طرف نفرت سے دیکھتے ہیں۔‘‘ ۲۵

آنند لہر نے زیرِ نظر افسانے میں سماج کی کھلی حقیقت کو بیان کیا ہے۔یہ ہمارے سماج میں عام ہو گیا ہے کہ غلطی کوئی کرتا ہے اور اس کی سزا کوئی بھگتا ہے۔بالخصوص عورتوں کے ساتھ یہ معاملہ صدیوں سے ہوتا چلا رہا ہے کہ اگر سماج کے درندہ صفت لوگ اس کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی عزت نیلام کر دیں تو بھی الزام اسی کے سر جاتا ہے۔یہاں افسانہ نگار نے ان لوگوں کے چہروں سے بھی پردہ ہٹایا ہے جو دوستی کا لبادہ اوڑھ کر بھیڑیوں کا کام کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ان معصوم اور مجبور عورتوں کی کہانی بھی بیان کی ہے جو دراصل بے گناہ ہوتی ہیں لیکن حالات اور سماج کی کج روی کی وجہ سے اپنا وقار کھو جاتی ہیں۔

اسی مجموعے میں شامل ایک اور افسانہ ’’گوتم بدھ سڑک‘‘ بھی اسی موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔جس میں آنند لہر نے گوتم بدھ سڑک کو محور بنا کر سماج میں ہونے والے غلط کاموں کی نقاب کشائی کی ہے۔آنند لہر نے اس افسانے میں مربوط پلاٹ کے ساتھ سماج کے کئی پہلوؤں کو بڑی خوبصورتی سے سمیٹ دیا ہے۔یہ افسانہ جہاں جسم فروش عورتوں کی داستان بیان کرتا ہے وہیں پولیس اہلکاروں کی رشوت خوری، لیڈروں کی ہوس، دلالوں کی دلالی اور ہوس کے پجاریوں کی بے غیرتی کا احاطہ بھی کرتا ہے۔نغمہ اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے جسم کا دھندہ کرتی ہے۔اس کا واسطہ سماج کے ہر طبقے سے پڑتا ہے۔ہر طبقے کے لوگ اپنی ہوس مٹانے کے لیے اس کے پاس آتے ہیں۔ایک عام رکشہ ڈرائیور سے لے کر بڑے بڑے سیاسی لیڈروں تک تمام لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔افسانہ نگار نے بڑی ہنر مندی سے نغمہ کے کردار کی مدد سے ان تمام لوگوں کے چہروں سے پردہ ہٹانے کی سعی کی ہے۔

دراصل جسموں کے بیوپار میں سماج کا ہر طبقہ کسی نہ کسی صورت میں ملوث ہے۔کوئی جسم فروشی کے اڈوں پر

بدکاری کرتا ہے تو کوئی اپنے ماتحتوں کے جسم کو ہوس کا شکار بناتا ہے۔کوئی کسی کی مجبوری کا سہارہ لے کر یہ کام انجام دیتا ہے۔غرض کہ ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں یہ بدکاری موجود ہے۔کوئی بدکاری کو انجام دینے کے لیے اپنے عہدے کا سہارا لیتا ہے تو کوئی مال و دولت کا۔انہیں چیزوں کی تصویر کشی انہوں نے افسانہ گوتم بدھ سڑک میں کی ہے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''صاحب ہمارا کام کم ہوگیا ہے کیونکہ چھوٹے آفیسروں کے گھروں میں بڑے آفیسروں کا آنا جانا ہے ترقی کے لئے اور تبادلوں کے لئے اور چھوٹے آفیسروں کے گھروں میں ان سے چھوٹے آفیسروں کا۔سب جگہوں پر ایسا ہی ہے۔نہ لائسنس کی ضرورت اور نہ ہی پولیس کو مہینہ دینا اور پھر آپ اس رکشے والے کو دیکھ رہے ہونا۔''

''ہاں''اس نے جواب دیا۔

''آپ کے جانے کے بعد آئے گا اور کہے گا کہ آپ اس کے گاہک ہیں اور ادھر وہ پولیس والے ہیں کے ہفتہ بھی لیتے ہیں اور جسموں کو بھی نچوڑتے ہیں۔''۲۶

آنند لہر نے سماج میں ہونے والی بدکاریوں کے اڈوں اور ان سے جڑے ہوئے لوگوں کی عمدہ عکاسی کی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے سیاسی نظام پر بھی تنقید کی ہے کہ آج کل سیاسی جماعتیں بھی قابلیت اور استعداد کی بنیاد پر نہیں بلکہ خوبصورت عورتوں کو ٹکٹ دے دیتی ہیں یا ان لوگوں کو جن کی عورتیں خوبصورت ہوں۔مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لہر نے سماجی حقیقت کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

ایک اور افسانہ''بیراگن''کے عنوان سے افسانوی مجموعہ بٹوارہ میں شامل ہے۔یہ مختصر افسانہ ہے جس میں ایک ایسے مرد کی کہانی بیان کی گئی ہے جو دنیا کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لیتا ہے۔گوتم پرشاد کا دل اچانک دنیا سے بے زار ہو جاتا ہے اور خلوت نشینی اختیار کر لیتا ہے۔اس کے ماں باپ اس کی شادی سریتا نامی لڑکی سے کراتے ہیں کہ چلو اس بہانے شاید اس کا دل لگے۔لیکن گوتم پرشاد سریتا میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔سریتا بناؤ سنگھار کرتی ہے۔اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی ہے لیکن لاکھ کوششوں کے باوجود اس کا دل سریتا سے نہیں لگتا۔ایک دن اچانک گلی سے

ایک خوبصورت ویشیا گزرتی ہے۔گوتم پرشاد اس کو دلچسپی سے دیکھنے لگتا ہے۔سریتا کو لگتا ہے کہ ہوسکتا ہے اس بہانے گوتم کا بیراگ ٹوٹے۔وہ اس کو اس ویشیا کے پاس لے جاتی ہے جہاں ناچ گانے کی محفلیں ہوتی ہیں۔گوتم پرشاد کا دل وہاں پر لگنا شروع ہو جاتا ہے۔آہستہ آہستہ وہ بیراگ چھوڑ کر اس ویشیا میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔بالآخر گوتم پرشاد کو ویشیا سے پیار ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بیوی سریتا سے نفرت شروع کر لیتا ہے۔جس سے سریتا بہت پریشان ہوتی ہے۔اس کا دل اچاٹ ہو جاتا ہے۔سریتا گوتم پرشاد سے بے پناہ محبت کرتی تھی لیکن جب گوتم نے اس سے نفرت شروع کر لی تو اس کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی۔اس دوران گوتم ویشیا کو دل و جان سے چاہنے لگتا ہے۔ایک دن اس کے پاس جاتا ہے اور اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے اور اسے اپنانے کے تمنا ظاہر کرتا ہے۔اس پر ویشیا اسے جواب دیتی ہے کہ وہ کسی ایک کی ہو کر نہیں رہ سکتی۔وہ کئی مردوں کا دل بہلا سکتی ہے لیکن کسی ایک کی ہو کر اس کا گھر آباد نہیں کر سکتی،یہی اس کا پیشہ ہے۔تب گوتم پرشاد کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیوی ہی اس کے لئے سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔وہی اس کی زندگی ہے،وہی اس کا گھر بسا سکتی ہے۔جس کی تصویر کشی آنند لہر نے یوں کی ہے۔

> ''وہ ویشیا کے پاس گیا اور اس سے کہا وہ اس کا ہو گیا ہے۔اس پر ویشیاں نے کہا اس کا وقت بٹا ہوا ہے۔اس کا حسن گلی میں لگے بلب کی طرح ہے جو راستہ تو روشن کر سکتا ہے مگر کسی کے گھر کا اندھیرا نہ مٹا سکتا ہے۔یہ کہہ کر ویشیا نے محفل لگا دی اور دوسرا گانا شروع کر دیا۔گوتم پرشاد کو گیان ہو گیا۔اسے لگا کے سریتا ہی سب سے خوبصورت ہے۔وہ اس کی بیوی ہے۔گھر کی روشنی ہے۔''[۲۷]

ویشیا کے دربار سے گوتم مایوس اور بے آبرو ہو کر واپس اپنی بیوی کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے لیکن جب وہ گھر پہنچتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ سریتا اس کے ظلم و عتاب سے تنگ آ کر اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔زیر بحث افسانے میں آنند لہر نے عورت کی قربانی اور مرد کی لاپروائی کو پیش کیا ہے۔یہ افسانہ سماج میں ان لوگوں کی عکاسی کرتا ہے جو اپنی سلیقہ مند،فرماں بردار اور با اخلاق بیوی کو چھوڑ کر ادھر ادھر تعلقات قائم کرتے ہیں۔یہاں تک کہ کوٹھے پر بیٹھی ایک وشیا جس کا کوئی مذہب،برادری اور وقار نہیں ہوتا اس سے دل لگا لیتے ہیں لیکن اپنی بیوی کی خوبیاں انہیں نظر نہیں آتیں۔افسانہ جہاں ایک طرف فرماں بردار بیوی اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی عکاسی کرتا ہے

وہیں ان لوگوں کی نقاب کشائی بھی کرتا ہے جو غلط عادتوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اس موضوع پر ان کا ایک اور افسانہ ''طلاق'' بھی قابل ذکر ہے۔ جو آخری افسانوی مجموعہ ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' میں شامل ہے۔اس کا موضوع بھی کوئی نیا نہیں ہے بلکہ وہی روایتی موضوع ہے۔ جس کو لہر نے خوبصورت طریقے سے پیش کیا ہے۔ افسانہ ''طلاق'' میں بھی ایک با اخلاق اور فرماں بردار عورت اپنے پتی کے ظلم و عتاب کا شکار ہوتی ہے۔ گوہر اپنی بیوی رانی کو طلاق کی دھمکی دیتا ہے۔ رانی اس سے بے حد پیار کرتی ہے اور ہر صورت میں ازدواجی زندگی خوشگوار گزارنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن وہ اسے طلاق دینے کی ٹھان لیتا ہے۔ جب وہ اپنا قصور معلوم کرنا چاہتی ہے تو وہ صرف اتنا جواب دیتا ہے کہ وہ اسے پسند نہیں۔ رانی کچھ بھی کر لے لیکن وہ طلاق ضرور دے گا۔ رانی بہت پریشان ہوتی ہے اور زار و قطار روتی اور گڑگڑاتی ہے۔ لیکن گوہر پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اتنا بے رحم ہو جاتا ہے کہ آسمان بھی اس کی بے رحمی کا ماتم مناتا ہے۔

بالآخر گوہر رانی کو طلاق دینے کا مسلم ارادہ کر کے وکیل کے پاس جاتا ہے۔ جب وکیل اسے وجوہات پوچھتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے کیونکہ رانی بالکل بے گناہ ہے۔ پھر وہ کھیل سے کہتا ہے کہ وہ کئی الزام لگا کر اپنے دوستوں کی گواہی کے سہارے ثابت کر سکتا ہے۔ شام کو جب وہ گھر واپس جا رہا ہوتا ہے تو مندر سے یہ آواز سن کر کہ بچھڑنا ایک فطری عمل ہے اگر کوشش کرنی ہے تو ملنے کی کرو۔ گوہر کا ارادہ بدل جاتا ہے اور وہ گھر پہنچ کر رانی کو گلے لگا لیتا ہے۔

یہاں افسانہ نگار نے عورت کی بے بسی اور مرد کی بے رحمی اور اپنے اختیارات کی وجہ سے عورت پر کیے جانے والی ناانصافیوں کو بیان کیا ہے۔ نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں عورت کا اپنا کوئی مقام نہیں وہ مردوں کی مرہون منت ہے۔ وہ جب چاہیں انہیں چھوڑ دیں، اور جب چاہیں اپنا لیں۔ مرد اپنی انا کی تسکین کے لیے عورت کی زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔

افسانہ ''انصاف'' میں بھی عورتوں کے مسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس میں ایک مظلوم عورت کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار رانی ہے۔ رانی آنند لہر کی بہت ساری کہانیوں کا کردار ہے۔ رانی جو ایک پاک دامن عورت ہے۔ جسے ایک درندہ صفت انسان زبردستی اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے۔ یہ ہمارے سماج میں برسوں سے چلا رہا ہے کہ اگر کہیں زبردستی کوئی مرد کسی عورت کی عزت لوٹ لے تو بھی لوگ حقیقت جانے بغیر اس کا الزام

عورت کے سر لگاتے ہیں۔جس سے معاشرے میں اس کا وقار کم ہو جاتا ہے۔کئی عورتیں حالات اور اپنی بے بسی کی وجہ سے ان زیادتیوں کا شکار ہوتی ہیں۔ایسی ہی عورتوں کی کہانی آنند لہر نے رانی کے ذریعے اس افسانے میں پیش کی ہے۔ایک دن اچانک کسی رشتہ دار کی موت ہونے پر رانی کے گھر والے گھر سے باہر جاتے ہیں۔کامدیو کو خبر ہو جاتی ہے کہ رانی رات کو گھر پر اکیلی ہے۔وہ موقع پا کر رات کو رانی کے گھر میں گھس کر اس کی عزت لوٹ لیتا ہے۔رانی بہت پریشان ہوتی ہے پہلے وہ اس راز کو معاشرے میں اپنی عزت بچانے کے لئے پی لینے کی ٹھان لیتی ہے لیکن جب اسے خبر ہوتی ہے کہ ایک پڑوسی نے دیکھ لیا ہے تو وہ مجبوراً شور مچاتی ہے۔پولیس موقع پر آتی ہے اور مقدمہ درج کیا جاتا ہے۔عدالت میں مقدمے کی کاروائی چلنا شروع ہو جاتی ہے اور ایک لمبا عرصہ انصاف ہونے میں گزر جاتا ہے۔اسی دوران اپنے گاؤں سے دور رانی کی شادی ہو جاتی ہے۔وہ اپنے گھر میں عزت سے رہنے لگتی ہے اس کے دو بچے ہوتے ہیں اور زندگی کا سلسلہ بڑا پر امن گزر رہا ہوتا ہے۔پندرہ سال کا عرصہ بیت جاتا ہے۔پندرہ سال بعد اچانک عدالت اس مقدمے میں کامدیو کو سزا سناتی ہے۔جس سے ایک بار پھر یہ مسئلہ سماج میں ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ہر طرف کہرام مچ جاتا ہے۔ ہر کسی کے لئے یہ مسئلہ موضوع بحث بنتا ہے۔اخباروں کی سرخی بنتا ہے۔اسی دوران میڈیا والے اس مسئلہ کی حقیقت جاننے کے لئے ایک دن رانی کے گھر پہنچ جاتے ہیں۔اس کے خاوند سے اس کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ آپ کی کیا رائے ہے اس کے بارے میں۔اسے چونکہ اس سے قبل اس کے متعلق کوئی علم نہیں تھا وہ اچانک یہ سن کر چونک جاتا ہے۔رانی کے ساس سسر بھی آگ بگولہ ہو جاتے ہیں اور وہ بھی بغیر کسی تحقیق کے سارا الزام رانی کے سر لگا دیتے ہیں۔جس سے ایک بار پھر رانی کی ساری عزت تار تار ہو گئی۔وہ پھر سے اپنا بنا بنایا وقار، اپنی عزت و اہمیت کھو گئی۔ ہر کوئی اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔جس کی تصویر کشی کرتے ہوئے آنند لہر لکھتے ہیں۔

> ’’رانی کو سب غصے اور نفرت سے دیکھنے لگے۔‘‘ ’’یہ بدکردار عورت اس گھر میں کہاں سے آئی ہے۔‘‘ رانی کے محلے والوں نے کہا۔رانی وہاں سے دوڑی اور بھاگی۔معلوم نہ ہو سکا کہاں گئی ہے۔’’گندگی سے بھری ہے۔میرے بچوں پر بھی اپنا برا اثر ڈالے گی۔‘‘ خاوند نے کہا۔’’آج تک یہ راز نہ جانے اس نے کیسے چھپائے رکھا۔‘‘ سسر نے کہا۔‘‘ ۲۸

رانی کو مجبوراً گھر چھوڑنا پڑا۔اسے اپنے بچے، اپنا پتی چھوڑنا پڑا۔اس کی دنیا لٹ گئی۔افسانے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح سماج میں لوگ موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی جنسی تسکین کے لیے ایک عورت کی ساری زندگی برباد کر دیتے ہیں اور شک کی بنیاد پر سارا الزام اس کے ہی سر لگاتے ہیں حالانکہ وہ بے قصور ہوتی ہے۔دراصل عورت کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔مرد کی نسبت معمولی سے الزام کی وجہ سے بھی اس کی زندگی داغدار ہو جاتی ہے۔افسانہ نگار یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سماج میں مختلف صورتوں میں اس کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے اور حد یہ ہے کہ اگر ایک بار اس کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو اس کو انصاف ملنے کے بجائے کئی اور الزامات سوغات میں ملتے ہیں۔رانی جو کہ ایک بے گناہ عورت تھی۔ اس کے ساتھ زبردستی بلاتکار ہوا تھا۔ اس کو انصاف ملنے کے بجائے دگنی سزا ہوئی۔جس کی وجہ سے اسے گھر بار، خاوند، بچے، عزت، شہرت سب کھونا پڑا۔یہی ہمارے سماج میں انصاف کا ترازو ہے، انصاف کا مقام ہے۔جس کی وجہ سے آنند لہر نے افسانے کو انصاف کا عنوان دیا ہے۔

## مفلسی

مفلسی ایک ایسی وبا ہے جس سے ہمارا سماج آج تک اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ہندوستان ایک کثیر آبادی والا ملک ہے۔یہاں بے شمار لوگ بنیادی سہولیات سے بھی محروم ہیں۔آئے روز کئی لوگ غریبی کی وجہ سے موت کا شکار ہوتے ہیں۔ بہت ساروں کو اس وبا سے نپٹتے ہوئے خودکشی بھی کرنی پڑتی ہے۔کئی معصوم عورتیں اس لعنت کی وجہ سے اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہیں۔کئی سماجی وجوہات کی بنا پر غریبی دن بدن بڑھ رہی ہے۔دولت کی نابرابری، رشوت خوری، امیروں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال وغیرہ ایسے عوامل ہیں جن کی وجہ سے غریبوں، مفلسوں کو دہری مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔آج ہمارے سماج میں رشوت اس قدر عروج پکڑ چکی ہے کہ غریبوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔غریبی اپنے ساتھ کئی مصیبتوں کو لاتی ہے۔اسی لئے کسی نے کہا تھا کہ خدایا موت دے دے لیکن غریبی نہ دے۔غریب و بے بس اور لاچار عوام کا استحصال کوئی نئی بات نہیں بلکہ یہ سلسلہ بہت پرانا ہے۔ہمارے سماج میں ہزاروں مسائل غریبی سے جڑے ہوئے ہیں۔جن کو ہمارے قلم کاروں نے اپنی حساس نگاہوں سے مشاہدہ کر کے ادب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔آنند لہر نے بھی ان مسائل کو اپنے چند افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔جن میں غربت اور اس بیماری سے پیدا شدہ مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔غربت کی عکاسی کرنے والے افسانوں میں افسانہ ''زندگی''، سنہرا کفن، کھیر اور کلفیاں قابل ذکر ہیں۔افسانہ ''سنہرا کفن'' اس موضوع کی خوبصورت عکاسی کرتا

ہے۔افسانہ نگار نے ایک غریب خاندان کی کہانی کو بیان کیا ہے۔جس کی کفالت گو بند کرتا ہے۔گو بند نہایت غربت میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کی نوکری لگ جاتی ہے اور پانچ ہزار تنخواہ مقرر ہوتی ہے۔پہلی تنخواہ ملنے پر انہیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔گھر میں ایک عجیب خوشی کا ماحول بنتا ہے۔کیونکہ اس خاندان نے اس سے قبل اتنی بڑی رقم نہیں دیکھی تھی۔گو بند اپنی پہلی تنخواہ لا کے اپنی بیوی ریکھا کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔خاندان کا ہر کوئی فرد ان پیسوں سے اپنی دیرینہ خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔خوشی اور جشن مناتا ہے۔گو بند ان پیسوں سے اپنی کئی خواہشوں کی تکمیل کے منصوبے بناتا ہے۔اس کی ماں کو ایک عجیب خوشی ملتی ہے کیونکہ اس نے انتہائی غربت میں دن گزارے تھے اور زندگی بھر کبھی اتنے پیسے نہیں دیکھے تھے۔افسانہ نگار نے اس منظر کو یوں پیش کیا ہے۔

''اس نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا تھا۔غریبی دیکھی تھی۔بیماری دیکھی تھی۔امیروں کی باراتیں دیکھی تھیں۔غریبوں کے جنازے دیکھے تھے۔پتیلے میں ختم ہوتے ہوئے چاول دیکھے تھے اور دال پر گھر میں ہوتی ہوئی لڑائی دیکھی تھی۔بچوں کو کتابیں نہ ملنے والے واقعات دیکھے تھے۔محلے کی لڑکیاں جوان ہوتی ہوئی اور ان کی جوانی سے ڈرتے ہوئے ماں باپ دیکھے تھے مگر پانچ ہزار روپے اکٹھے نہ دیکھے تھے اور ایک ایک راپیہ کر کے اکٹھے کرنے ہوں تو پانچ ہزار دن لگتے ہیں۔''۲۹

تنخواہ ملنے پر جشن ہوتا ہے اور ہر کوئی اپنی اپنی خواہش پوری کرنے کی تیاری کرتا ہے۔لیکن اسی دوران گو بند کی بیوی ریکھا کی سہیلی شالنی ان کے گھر آتی ہے۔دراصل ریکھا ایک بڑے افسر کی بہن تھی لیکن گوتم کی غربت کا اس کو احساس تھا اور اس نے کبھی اس کی غربت کا شکوہ نہ کیا تھا۔وہ اپنے خاندان کی غربت کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھی۔اس نے غربت میں زندگی جینے کا ہنر سیکھ لیا تھا۔ایک خود دار عورت ہونے کی وجہ سے وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ اس کی کسی سہیلی کے سامنے اس کی غربت کا راز افشاں ہو۔اور یہی خودداری اس کی موت کا سبب بنی۔ہوا یوں کہ اس کی سہیلی شالنی نے اسے بازار چلنے کے لیے کہا اور وہ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے اس کے ساتھ چلی گئی تا کہ اس کی غربت کا راز اس کے سامنے نہ کھل جائے۔بازار میں سہیلیوں کے سامنے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایک شال خریدنی پڑی۔جس کے لیے اس کے پتی کی پوری تنخواہ چلی گئی۔جس سے خاندان کے کئی لوگوں کی ضروریات کو پورا

کرنا تھا۔ ریکھا جب گھر واپس لوٹی تو اس نے دیکھا کہ خاندان کے تمام افراد پیسوں کے منتظر ہیں کہ ریکھا پیسے لائے گی اور اس سے وہ اپنی اپنی خواہشات پوری کریں گے۔ گھر کے تمام افراد کو پیسوں کے لئے منتظر دیکھ کر ریکھا پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شال خرید کر تمام خاندان کی امیدوں کی شمع گل کر دی۔ ریکھا ایک حساس اور غیرت مند عورت تھی اس لیے وہ یہ منظر دیکھ کر برداشت نہ کر سکی اور غش کھا کر گر گئی۔ غشی کے عالم میں ریکھا کی موت ہو گئی اور یوں اس خاندان کی خوشی ماتم کدے میں تبدیل ہو گئی۔ جس کی منظر کشی کرتے ہوئے آنند لہر یوں رقمطراز ہیں۔

''ریکھا نے سب کچھ سنا۔ دروازے پر گر گئی۔ سب دوڑے۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور ہو گیا۔ ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جس میں ایک خوبصورت شال تھا اور پرس خالی تھا۔

''ہائے یہ کیا ہو گیا؟'' ریکھا کی ساس چیخی۔

گوبند اس کی لاش پر گر پڑا۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی۔ سب اصل بات کو سمجھ گئے مگر کوئی بولنا نہیں چاہتا تھا۔''[۳۰]

ریکھا کی موت سے ہر کسی کی امنگیں، آرزوئیں ادھوری رہ جاتی ہیں اور وہ شال جس سے ریکھا کی آرزوئیں پوری ہونی تھیں، اس کا خوبصورت بدن سجنا تھا اس سے اس کی لاش سجائی گئی۔ جسے سنہرا کفن کا نام دیا گیا۔ افسانہ نگار نے ایک غریب خاندان کی بے بسی اور لاچاری کی عکاسی کرتے ہوئے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ غریبی بہت بری بلا ہے۔ جو انسان کی امنگوں اور خواہشوں کا قتل کرتی ہے۔ غریبوں کو اپنی غربت اور بدنصیبی چھپانے کے لیے طرح طرح کی رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ غریب عورتوں کو کس طرح اپنی غربت چھپانے کے لیے اپنی خواہشات کو دل میں دفن کرنا پڑتا ہے اس کو افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

افسانہ ''کھیر'' بھی غربت کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔ دھنیا جو کہ اس افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کے پاس رہنے کے لئے مکان بھی نہیں ہوتا اور وہ ایک ٹینٹ میں گزارا کرتا ہے۔ اس کی دیرینہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے گھر میں میٹھی کھیر پکے۔ جس کے لیے وہ محنت مزدوری کر کے آخر ایک دن سامان لاتا ہے۔ اس کی بیوی بڑی خوشی سے کھیر پکانا شروع کرتی ہے۔ رات کو جب کھیر تیار ہوتی ہے تو ان کے ٹینٹ کے پاس رہنے والے سیٹھ کا لڑکا اپنے

گنڈوں کے ساتھ ان کے ٹینٹ میں داخل ہو جاتا ہے۔ سیٹھ کا لڑکا دھنیا کی لڑکی دیو کی عزت لوٹنا چاہتا ہے اور اسے پورا یقین ہے کہ وہ یہ جرم کرے گا لیکن اس کے لئے اسے کوئی سزا نہیں ہوگی۔ کیونکہ پولیس کو راضی کرنے کے لیے ان کے پاس بے شمار دولت ہے۔ سیٹھ کا لڑکا دولت کے غرور میں طاقت کے بل بوتے پر دھنیا کے گھر میں داخل ہو کر کہرام مچا دیتا ہے۔ دھنیا اور اس کی بیوی سب جانتے ہوئے بھی خاموش ہو جاتے ہیں کہ کسی بہانے جان بچ جائے۔ سیٹھ کا لڑکا دیو کی عزت تار تار کر دیتا ہے۔ دھنیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی بچی کے ساتھ غلط ہو رہا ہے اس لئے احتجاج نہیں کر پاتا کہ اس کے خاندان کو جان کا خطرہ ہے۔ لڑکا دیو کی عزت لوٹ کر چلا جاتا ہے اور گھر میں پکائی گئی کھیر سیٹھ کا کتا چاٹ جاتا ہے۔ اور یوں غربت اور بے بسی کا ستایا ہوا دھنیا اپنی بیٹی کی عزت بھی کھو جاتا ہے اور ان کی کھیر کھانے کی دیرینہ خواہش بھی خاک آلود ہو جاتی ہے۔ جس کی منظر کشی افسانہ نگار نے اس طرح کی ہے۔

> ''سارے گھر کے لوگ کونوں کے ساتھ لگ گئے۔ خاموشی چھا
> گئی۔ پسینے سے شرابور سیٹھ کا لڑکا آیا اور دیو کے بدن کو چاٹنے لگا اور
> پھر اسے توڑنے لگا۔ سیٹھ کا کتا آیا اور کھیر کھانے لگا۔ سیٹھ کے لڑکے
> نے دیو کے بدن کو چاروں طرف گھمایا۔ پورا مزہ لیا اور پھر یوں
> پھینکا جیسے کہہ رہا ہو اس میں اتنا کم مزہ کیوں ہے۔؟
> ادھر کتے نے برتن کو چاروں طرف سے چاٹنے کے بعد الٹا سیدھا کیا
> اور الٹا کر کے چلا گیا۔'' [۳۱]

یوں ایک مزدور کی کھیر کھانے کی دیرینہ تمنا خاک میں ملنے کے ساتھ ساتھ اس کی بچی کی عزت اس کی نظروں کے سامنے تار تار ہو گئی۔ نہ اس کی کھیر کھانے کی تمنا پوری ہوئی اور نہ ہی وہ اپنی بچی کی عصمت لٹتی دیکھ کر کوئی احتجاج کر سکا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اسے جان کا خطرہ تھا۔ افسانہ ''کھیر'' جہاں ایک طرف بے بسوں، لاچاروں اور مجبوروں کی غربت، بے بسی اور لاچاری کی عکاسی کرتا ہے وہیں دوسری طرف ہمارے سماج میں بسنے والے دولت اور طاقت کے نشے میں اندھے لوگوں کی درندگی، ظلم وعتاب اور وحشیانہ حرکات کے ننگے ناچ کا بیانیہ پیش کرتا ہے۔ اس سے زیادہ بے بسی و مجبوری کی انتہا کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ماں باپ اپنی معصوم بچی کی عزت لٹتی دیکھ کر کچھ نہ کر سکیں۔ سرمایہ داروں اور طاقتوروں کے ہاتھوں مفلسوں اور مظلوموں کے استحصال کا سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا

ہے۔جس کوقلم کاروں نے اپنے اپنے ڈھنگ سے پیش کیا ہے لیکن اس افسانے میں آنند لہر نے جس فنکاری سے غریبی ، بے بسی اور لا چاری کی تصویر کھینچتے ہوئے طاقتوروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدوروں کے استحصال کو پیش کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتیں ہیں۔ بلا شبہ یہ ایک بہترین افسانہ ہے جس میں افسانہ نگار نے ایک روایتی موضوع کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔

افسانہ’’ کلفیاں‘‘ میں آنند لہر نے ایک ریڑھی والے کو موضوع بنایا ہے۔ایک غریب شخص دھنیا اپنی دولڑکیوں اور بیوی کا گزارا ریڑھی پر کلفیاں بیچ کر چلاتا ہے۔یہی اس کی کل کائنات ہے اور روزی روٹی کا واحد ذریعہ بھی۔گھر میں دو جوان بچیاں ہیں جن کو غربت کی وجہ سے کوئی بھی اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوتا لیکن اپنے جسم کی آگ بجھانے کے لئے ہر ایک کی ان پر نظر ہے۔دھنیا کی بیوی کو بھی لوگ اپنی ہوس کا شکار بنانا چاہتے ہیں۔جس کی تصویر کشی لہر نے افسانہ کلفیاں میں یوں کی ہے۔

’’بڑی لڑکی پہ جو جوانی کی دہلیز پر ہے بہاری کے لڑکے جگو کی نظر ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظروں سے اسے چبانا چاہتا ہے اور کپڑے اتارنے کا انتظار کرنے کا بھی اس کے پاس وقت نہ ہے۔دوسری لڑکی پر بابو مٹھائی والے کے لڑکے بسنت کی نظر ہے۔جو سانپ کی طرح اس کے جسم پر رینگنا چاہتا ہے اور اس کے انگ انگ کو ڈسنا چاہتا ہے۔وہ لڑکی ابھی لڑکپن کو چھوڑ کر آگے بڑھنے ہی والی ہے۔اس کی بیوی پر گلو پان والے کی نظر ہے جو پان کی طرح کھا کر اسے چبانا چاہتا ہے۔‘‘ ۳۲؎

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں غریب کی بچی کی کیا اہمیت ہے۔غربت کی وجہ سے غریب کی بچی جائز رشتے کے لئے کسی کو بھی پسند نہیں آتی لیکن بدکاری کے لئے سماج میں ہر کسی کی ان پر نظر ہے۔اوراسی وجہ سے سماج میں غریب خاندان کی عورتوں کو انصاف نہیں ملتا۔کوئی اپنی بے بسی کی وجہ سے جسم فروشی پر مجبور ہوتی ہے تو کوئی دولت مندوں کے ہاتھوں اپنی عزت لٹا کر بے سروساماں ہو جاتی ہے۔ جبکہ کئی غریبی کی وجہ سے بد اخلاق اور معمر مردوں کے حوالے کر دی جاتی ہیں۔دراصل مفلسی نام ہی بے بسی بھوک،ذلت اور رسوائی کا ہے۔اور بھوک ایک ایسی بیماری ہے جو انسان کو کچھ بھی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔انسان

اپنے نفس کی آگ بجھانے کے لیے کوئی بھی جرم کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

زیر بحث افسانے میں ایک مفلس کی کہانی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ آنند لہر نے سرمایہ داروں اور لیڈروں کے ہاتھوں غریبوں کے استحصال کو بھی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ریڑی جو کہ دھنیا کی آمدنی کا واحد ذریعہ تھا بلکہ یوں کہئے کہ اس کی کل کائنات تھی۔ ایک دن شدید گرمی کے موسم میں بڑی محنت ومشقت سے اس امید پر معمول سے زیادہ کلفیاں بناتا ہے کہ آج گرمی کی وجہ سے زیادہ بکیں گی۔ اس کی بچیاں اور بیوی اسی امید پر کہ کل ان کی کلفیاں زیادہ بکیں گیں، ان کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔ اپنی ضرورت کی بعض چیزیں ادھار لے آتی ہیں۔ لیکن دوسرے دن ان کی تمام تر امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ کیونکہ دوسرے دن پردھان منتری کے دورے کی وجہ سے پولیس ان کی ریڑی بند کرا دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے گرمی میں ان کی تمام کلفیاں پگھل جاتی ہیں۔ پردھان منتری اس راستے سے نہیں آتا کیونکہ ان کا روٹ بدل دیا جاتا ہے لیکن دھنیا کی کلفیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ لوگوں کا قرضہ ادا نہیں کرسکتا۔ جس کی وجہ سے لوگوں کی نظریں اس کی بچیوں اور بیوی پر لگ جاتی ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ قرض ادا نہ کرنے کی صورت میں وہ جسم دینے پر مجبور ہوں گی۔ افسانہ نگار نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ بڑے لوگوں کی وجہ سے مفلسوں، غریبوں کی دنیا تباہ ہو جاتی ہے۔

آنند لہر کا ایک اور افسانہ ''زندگی'' بھی اسی موضوع کے عکاسی کرتا ہے۔ اس میں غربت کی عکاسی ضرور ہوئی ہے لیکن دیگر افسانوں کی طرح یہاں غریب کی بے بسی، لاچاری اور استحصال کو بیان کرنے کے بجائے ایک غریب کی معمولی آمدنی کے باوجود اس کی شکر گزاری اور محدود خواہشات کے ساتھ گزرنے والی امن وسکون کی زندگی کا تقابل ایک صاحب ثروت آفیسر کی زندگی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عزت اور امن و سکون کی زندگی جینے کے لیے مال ودولت اور عہدے کی ضرورت نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی ہے۔ افسانے میں رمیش جو کہ ایک بہت بڑا افسر ہے اس کی زندگی اور اس کے گھر کے ماحول کا تقابل دھرم چند نامی ایک عام انسان کے ساتھ کیا گیا ہے۔ رمیش جو کہ ایک بہت بڑا افسر ہے لیکن اخلاقی قدروں سے بالکل گرا ہوا ہے۔ اس کے گھر کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی بیوی جس کا تعلق بڑے خاندان سے ہے وہ اپنے ماں باپ کے عہدے اور ان کی جائیداد کے فخر کی وجہ سے خاوند کی عزت نہیں کرتی۔ رمیش کے بیٹے بھی اسے بالکل قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ غرض کہ خاندان کا ہر فرد زندگی کی ہر چیز کو دولت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے انسانی رشتوں اور اخلاقی قدروں کی ان سب کی

نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رہتی۔گھر میں ایک دوسرے کے لئے کوئی عزت نہیں ہوتی ۔جس کی وجہ سے رمیش گھر میں عزت ووقار کھونے پر چین وسکون کی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔اس ضمن میں افسانے سے یہ اقتباس دیکھیں جس میں رمیش کی بیوی اس سے محو گفتگو دکھائی گئی ہے۔

''آفس ۔۔۔۔آفس سن کر میں تنگ آگئی ہوں۔تمہارے آفس۔جتنی تنخواہ تم لیتے ہو اتنے روپے میرے پتا جی ہر مہینے اپنے نوکروں میں بانٹ دیتے ہیں۔''۳۳ے

اس کے برعکس دھرم چند کے گھر کا ماحول بالکل الگ ہوتا ہے۔دھرم چند ایک معمولی ملازم ہے لیکن امن و سکون کی زندگی گزارتا ہے۔اس کی معمولی آمدنی کی گھر میں ہر کوئی قدر کرتا ہے۔گھر کا ہر فرد رشتوں کی اہمیت جانتا ہے۔ایک دوسرے کو عزت دینی جانتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ لوگ معمولی آمدنی سے چین وسکون کی زندگی بسر کرتے ہیں۔کیونکہ ان کے ہاں مال ودولت سے رشتوں کی اہمیت زیادہ ہے۔دراصل افسانہ نگار یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ دولت کے نشے میں لوگ اخلاقی قدروں کو بھول جاتے ہیں اور خوشحال زندگی جینے کے لئے صرف مال ودولت کی ضرورت نہیں ہوتی۔افسانے میں نئی اور پرانی تہذیب کے درمیان کشمکش دکھائی گئی ہے۔دور حاضر میں ہمارے سماج میں مغربی تہذیب بڑی شدت سے پھیل رہی ہے۔جس کی وجہ سے اخلاقی قدریں گر رہی ہیں ،رشتے دم توڑ رہے ہیں۔انہیں چیزوں کا احاطہ کرنے کے لیے آنند لہر نے ایک غریب اور امیر کی زندگی کا تقابل کیا ہے۔نیز دو تہذیبوں کو ان کے ذریعے پیش کیا ہے۔

### رشوت

رشوت عصر حاضر کا بہت بڑا المیہ ہے۔اس وقت زندگی کا شاید ہی کوئی شعبہ ایسا ہو جہاں رشوت نہ ہو۔یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کی وجہ سے آئے روز حقداروں کی حقوق تلفی اور غریبوں کا استحصال کھلے عام ہورہا ہے۔سماج میں غریبی کم ہونے کے بجائے رشوت خوری نے غریبوں کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔رشوت نے حق اور انصاف کا گلا دبوچ دیا ہے۔جس کی وجہ سے کئی طرح کے جرائم آئے روز جنم لے رہے ہیں۔رشوت کے ذریعے حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دیا جاتا ہے۔کئی بے گناہوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔جبکہ ہزاروں مجرم سرعام پھر رہے ہیں۔رشوت نے سچ اور انصاف کی جڑوں کو اکھاڑ دیا ہے۔اگرچہ بہت سارے لوگوں نے مختلف ذرائع

سے اس کے خلاف وقتاً فوقتاً پرچار کیا ہے تاہم یہ سلسلہ کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ہمارے ادبا وشعرا کے ہاں بھی دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ایک اہم موضوع رشوت خوری بھی رہا ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سماج سے رشوت کو ختم کرنے کی صدا ہمیشہ بلند کی ہے۔ قلم کی مدد سے رشوت کے خلاف صدا بلند کرنے والوں میں ایک اہم نام آنند لہر کا بھی ہے۔ آنند لہر نے اپنے افسانے ''اب تھانا چل پڑے گا''، ایک خبر، غلط علاج، دو دوست اور صرف ایک شام سنگھ وغیرہ میں رشوت اور اس سے جڑے مسائل کی بہترین عکاسی کی ہے۔

افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' میں شامل افسانہ ''اب تھانہ چل پڑے گا'' میں رشوت خوری کی بڑی خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ افسانے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ محکمہ پولیس کس طرح لوگوں سے رشوت وصول کرتا ہے۔ دراصل پولیس کو عوام کی دفاع اور ان کے مسائل کو سلجھانے کے لیے تعینات کیا جاتا ہے۔ لیکن محکمہ پولیس اپنے اختیارات کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں کا مختلف زاویوں سے استحصال کرتا ہے۔ زیر بحث افسانے میں آنند لہر نے ایک گاؤں کا منظر نامہ پیش کیا ہے۔ جہاں ضرورت نہ ہونے پر بھی ایک پولیس چوکی اس لیے قائم کی جاتی ہے تاکہ وہ محکمے کی آمدنی کا ذریعہ بن سکے۔ چوکی قائم ہونے کے بعد ایک عرصہ تک گاؤں میں کوئی جرم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے چوکی پر تعینات پولیس کارکنان بہت پریشان ہوتے ہیں۔ اسی دوران ان کے اعلیٰ آفیسران سے اس مدت کی آمدنی میں سے حصہ طلب کرتے ہیں۔ چوکی پر تعینات پولیس اہلکار ہر ممکن کوشش کے باوجود ناکام ہوتے ہیں کیونکہ وہاں کوئی جرم نہیں ہوتا۔ بالآخر وہ لوگوں پر ناجائز مقدمات لگانے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ کیونکہ قانون ان کے ہاتھ میں ہے، اختیار ان کے پاس ہیں۔ جس کی خوبصورت عکاسی کرتے ہوئے آنند لہر یوں رقمطراز ہیں۔

> ''کان چند نے گاؤں کے لوگوں کو کافی حد تک قانون سکھانے کی کوشش کی تھی اور یہاں تک کہا تھا کہ ہر واقعہ پولیس کو بتایا جائے مگر اس گاؤں میں کوئی واقع ہی نہیں ہوتا تھا۔ کئی لوگوں کو معلوم تھا کہ کام چند کے پاس قانون کے پانچ سو پچاس دفعات ہیں اور وہ کئی بار تنگ آ کر ہم پر کوئی دفعہ لگا سکتا ہے۔''
>
> آخر کان چند نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر لوگ جرم نہیں کریں گے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ قانون اپنا کام نہیں کرے گا۔''[۳۴]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اگر لوگ بے گناہ ہیں تو بھی پولیس ان پر جھوٹے مقدمے لگا کر ان سے رشوت وصول کرتی ہے۔اسی دوران اس گاؤں میں رہنے والی اچھری نامی ایک عورت کی موت ہو جاتی ہے جو ایک غریب عورت ہوتی ہے۔جس کا کوئی سہارا نہیں ہوتا،کوئی رشتہ دار نہیں ہوتا۔وہ اس گاؤں میں ایک جھونپڑا بنا کر رہتی ہے اور گاؤں والے اسے روٹی بھی دیتے ہیں۔اس کی اچانک موت پر گاؤں والے یہ مشورہ کرتے ہیں کہ پولیس میں رپورٹ کرائی جائے۔لوگ چوکی میں رپورٹ درج کرانے جاتے ہیں۔چوکی افسر کان چند انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے اور اسے امید کی کرن نظر آتی ہے کہ آج کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور بنا ہے جو اس کی آمدنی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔کان چند رپورٹ درج کرنے کے لیے گاؤں والوں سے چائے پانی طلب کرتا ہے۔جس سے ان کی حیرانی کی انتہا نہیں رہتی کہ ایک ایسی عورت جس کا دنیا میں کوئی نہیں،جس کا گھر بار رشتہ ناطہ کچھ بھی نہیں اس کی موت پر بھی رشوت طلب کرنا سب کو چونکا دیتا ہے۔گاؤں والے مزید وضاحت کرتے ہیں کہ بجلی گرنے سے اس کی موت واقع ہوئی ہے اور چائے پانی دینے کے لیے اس کا اپنا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔جس پر پولیس افسر کا یہ جواب مردہ ضمیری کی تمام حدوں کو پار کر جاتا ہے کہ موت کس طرح ہوئی ہمیں اس سے کوئی مطلب نہیں۔واقعہ کچھ بھی ہو ہماری چائے پانی قائم رہتی ہے۔افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''لکھو صاحب۔بجلی گری اچھری مری۔''

''اچھری مری۔بجلی گری۔'' کان چند نے لکھا اور کہا۔

''ہمارا چائے پانی؟''

سب حیران ہو گئے۔اس شخص نے پھر اپنی بات دہرائی۔

''نہیں صاحب!بجلی گری اچھری مری۔''

اس پر دوسرے سپاہی نے کہا۔''

''اچھری مری بجلی گری یا بجلی گری اچھری مری مگر ہمارا چائے پانی ہر حالت میں قائم رہتا ہے۔''۳۵

پولیس والوں کی یہ بات سن کر گاؤں والے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ اچھری کی لاش پر آدھا کفن ڈالا جائے اور آدھے کفن کے پیسے پولیس والے کو دیے جائیں۔بالآخر یہی ہوتا ہے اور پولیس والا پیسے لے کر اپنے اعلیٰ آفیسر کو

فون کرتا ہے کہ صاحب بونی ہوگئی ہے، لگتا ہے اب تھانہ چل پڑے گا۔ اس کے بعد اس گاؤں میں ہر جرم ہوتا ہے، ہر ناجائز کام ہوتا ہے کیونکہ وہاں پولیس تھانہ ہے۔ افسانے سے یہ بات واضع ہوتی ہے کہ دراصل پولیس اور تھانے لوگوں کی دفاع کے لیے نہیں بلکہ مجرموں کے جرم چھپانے اور بے گناہوں کو مجرم قرار دینے اور انہیں جرم کی دعوت دینے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ رشوت خوری اور مردہ ضمیری کی انتہا اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ مردوں کے کفن تک نہیں بخشے جاتے۔ جس سماج میں لاشوں کو ننگا کیا جاتا ہو وہاں بہتری کی کوئی امید کیسے ہوسکتی ہے۔ ہمارے سماج میں ناانصافی، لوٹ کھسوٹ اور رشوت خوری کس قدر عروج پر ہے اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے اس سے بہتر مثال اور کیا ہوسکتی ہے۔

افسانہ ''ایک خبر'' ریلوے محکمہ کے ملازموں کی رشوت خوری کو پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں رشوت کے ساتھ محکمہ کے اعلیٰ آفیسران کے ہاتھوں چھوٹے ملازموں کا استحصال اور ان کی بہو بیٹیوں کی عصمت دری کی عکاسی بھی کی گئی ہے۔ ناتھ جو کہ اس محکمے کا ایک معمولی ملازم ہوتا ہے اپنی معمولی آمدنی کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار تھوڑا بہت کوئلہ چوری کر کے بیچ لیتا ہے۔ جس سے اس کا گزارا چلتا ہے۔ محکمہ کا یہ دستور ہے کہ جب آفیسر کسی ملازم پر مہربان ہوتے ہیں تو وہ اسے وہاں تعینات کر دیتے ہیں جہاں سے وہ چوری کر سکے۔ یہی مسئلہ ناتھ کا بھی ہوا۔ اسے آفیسر نے اس لئے وہاں تعینات کیا جہاں سے وہ کوئلہ چوری کر سکتا تھا کیونکہ اس کے گھر میں اس کی جوان سالہ خوبصورت لڑکی تھی۔ جو افسروں کی توجہ کا مرکز تھی۔ بعدازاں جب اس کی شادی ہو جاتی ہے تو افسر ناتھ کو وہاں سے ہٹا کر ایسی جگہ تعینات کرتا ہے جہاں اس کی آمدنی کا ذریعہ بند ہو جاتا ہے اور اس کے دن مشکل ہو جاتے ہیں۔ محکمہ کے آفیسر خوب رشوت لیتے ہیں، چوری کرتے ہیں جس سے ناتھ بہت پریشان ہوتا ہے۔ ایک دن اخبار والا اخبار بیچتے ہوئے بولی لگاتا ہے کہ محکمہ ریلوے کے افسروں کو سزا ہوئی ہے۔ ناتھ یہ خبر سن کر خوش ہوتا ہے اور اپنی بچی کے دس روپے چوری کر کے ان سے اخبار خرید لیتا ہے۔ اس کی بیٹی رانی جب دیکھتی ہے کہ اس کے پیسے غائب ہیں تو وہ خود کشی کر لیتی ہے۔ دوسرے دن کی خبر آتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اگلے دن کی خبر جھوٹی تھی۔ ریلوے کے کسی ملازم کو سزا نہیں ہوئی۔ یہ سن کر ناتھ کو دہرا جھٹکا لگتا ہے۔ جب اسے پتہ چلا کہ جس خبر کے لیے اس نے پیسے چرائے تھے وہ جھوٹی ہے اور اسی خبر کے لئے اس کی بچی جان چلی گئی۔ افسانے میں رشوت خوری، چوری اور افسروں کے ہاتھوں چھوٹے ملازموں کے استحصال کا عمدہ بیانیہ پیش کیا گیا ہے۔

''دو دوست'' آنند لہر کا مختصر سا افسانہ ہے۔جس میں دو حقیقی بھائیوں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔دونوں انجینئر کے عہدے پر فائز ہوتے ہیں لیکن دونوں کے اخلاق واطوار اور سوچ میں بڑا فرق ہے۔شام لعل جو کہ خوب رشوت لیتا ہے اور مال و دولت سے اسے اس قدر لگاؤ ہو جاتا ہے کہ وہ اخلاقی قدروں اور رشتوں کے تقدس کو بھول جاتا ہے،احساس ختم ہو جاتا ہے۔بے ایمانی اور دھوکہ بازی اس کا مشغلہ بن جاتا ہے۔وہ جو بھی کام کرتا ہے اس میں دھوکہ کرتا ہے کیونکہ حرام خوری اس کی سرشت میں گھر کر جاتی ہے۔وہ انتہائی لالچی ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اپنے حقیقی رشتوں کے لیے وقت نکالنے کی اس کو فکر نہیں رہتی۔وہ دولت اکٹھی کرنے کی تگ و دو میں اپنی خوبصورت بیوی کو بھی وقت نہیں دے سکتا۔جس کا نقشہ آنند لہر نے افسانے میں یوں کھینچا ہے۔

> ''شام لعل ہمیشہ اس بات سے پریشان رہتا کہ کہیں دوسرے لوگ زیادہ
> کمیشن نہ کھا جائیں۔وہ دن رات کمیشن اور روپے کے چکر میں گھومتا
> رہتا۔اس کی بیوی از حد خوبصورت تھی مگر اسے اپنی بیوی کو دیکھنے کا کبھی
> موقع نہ ملا۔وہ بیوی بچوں پر ہر وقت رعب ڈالتا رہتا۔آپ کے لیے یہ
> سب کچھ کر رہا ہوں۔''۳۶

جبکہ اس کے دوسرے بھائی رام لعل کا معاملہ بالکل الگ ہے۔وہ ایک دیانتدار اور خوش اخلاق انسان ہے۔خدمت خلق اس کی منشا ہے۔وہ جو کام کرتا ہے ایمانداری اور محنت سے کرتا ہے۔گھر میں اپنی بیوی بچوں کو وقت دیتا ہے۔جس سے اس کے گھر کا ماحول بڑا پرامن اور خوشگوار بن جاتا ہے۔دونوں اپنی ملازمت کے دوران الگ الگ طریقۂ کار سے زندگی گزارتے ہیں۔شام لعل دھوکہ کرتا ہے، بے ایمانی کرتا ہے اور خوب رشوت لیتا ہے۔جبکہ رام لعل دیانتداری سے اپنا فرض منصبی نبھاتا ہے، رشوت نہیں لیتا اور ہر کسی کے کام آتا ہے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد شام لعل اس صدمے میں احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے کہ اس کی آمدنی کا سلسلہ رک گیا ہے۔جس سے وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہو کر بیمار ہو جاتا ہے۔جبکہ رام لعل کو ریٹائرمنٹ کی خوشی ہوتی ہے۔وہ سماج میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔سماج میں اس کو خاطر خواہ عزت ملتی ہے۔گھر میں اس کی خوب عزت ہوتی ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شام لعل کی بیماری بڑھ جاتی ہے اور اس کی بیوی بچے اسے بوجھ سمجھنے لگتے ہیں اور اس کی دیکھ بھال کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔شام لعل مجبور و بے بس ہو کر گھر سے نکل جاتا ہے۔اور رام لعل اپنی

بیوی بچوں کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارتا ہے۔

مختصر طور پر دیکھا جائے تو شام لعل کا کردار ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو رشوت لیتے ہیں، بے ایمانی کرتے ہیں اور رشتوں کو اہمیت نہیں دیتے۔ اور بالآخر جب حالات کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں تو کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا اور وہ نتیجتاً ذلیل وخوار ہوتے ہیں۔ نیز افسانہ نگار نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ اس طرح کے لوگوں کا انجام بڑا عبرتناک ہوتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف رام لعل کا کردار ایمانداری، خوش اخلاقی، ملنساری اور حلال کھانے والے لوگوں کی پیروی کرتا ہے۔ جو اپنے اختیارات کے دوران اچھے کام کرتے ہیں اور بالآخر اس کا اچھا صلہ پاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے رشوت خوری اور اس کے انجام کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔

افسانہ ''صرف ایک شام سنگھ'' میں بھی رشوت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس افسانے میں آنند لہر نے محکمہ پولیس میں رشوت کے ذریعے کیے جانے والے عوامی استحصال کو پیش کیا ہے۔ نیز ان پولیس اہلکاروں کو بھی موضوع بنایا ہے جو فطرتاً ایماندار ہوتے ہیں، رشوت نہیں لینا چاہتے لیکن محکمے میں آ کر رشوت خوری کے لیے انہیں مجبور کیا جاتا ہے۔ آفیسران کی طرف سے انہیں رشوت لینے اور ان تک پہنچانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ جبکہ انکار کی صورت میں انہیں جو مشکلات درپیش آتی ہیں ان کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ محکمہ پولیس اس وقت ہمارے سماج میں رشوت خوری کے لیے بہت بدنام ہے اور ہو بھی کیوں نہ جہاں رشوت دینے کے لیے لوگوں کو مردوں کے کفن بیچنے پڑیں۔ رشوت کی انتہا اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے۔ افسانہ ''صرف ایک شام سنگھ'' میں آنند لہر نے محکمہ پولیس کے رشوت خور اور ایماندار ملازموں کا آپس میں تقابل کرتے ہوئے بتایا ہے کہ رشوت خور اور نااہل ملازموں کے ہاتھوں انصاف دب جاتا ہے جبکہ ایماندار ملازموں کو محکمے میں طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ افسانہ نگار نے رام سنگھ نامی ایک تھانیدار کو مرکزی کردار بنایا ہے۔ جو بہت ایماندار ہوتا ہے اور محکمے میں اس کے آنے سے دیگر ملازمین کی اوپر کی آمدنی کم ہوجاتی ہے، اعلیٰ آفیسر اس کو رشوت لینے پر مجبور کرتے ہیں لیکن وہ کسی بھی صورت میں راضی نہیں ہوتا۔ جس کی وجہ سے اسے بہت پریشان کیا جاتا ہے۔ بار بار تبادلہ کیا جاتا ہے۔ جس کی تصویر کشی افسانہ نگار نے یوں کی ہے۔

> ''رام سنگھ ایک جگہ سے دوسری جگہ پھر دوسری جگہ سے دوسری جگہ تبدیل
> ہوتا رہا۔ اس سلسلے میں اس کی انکری منٹ بھی بند ہوگئی۔ وہ پولیس کا
> سارا کام بھول گیا۔ وہ وردی اب یوں پہنتا ہے جیسے عام آدمی کپڑے

پہنتا ہے ۔ہتھیار چلانا بھی بھول گیا ہے۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی
معلوم نہ رہا ہے کہ چالان کیسے پیش کرتے ہیں۔'' ۳۷

افسانے کا ایک اور کردار ''چیلا سنگھ'' ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو رشوت خوری اور بے ایمانی کے لیے محکمے میں مشہور ہیں۔ وہ رشوت لیتا ہے اور اپنے افسروں کو بھی خوش رکھتا ہے۔ جس کی وجہ سے تمام آفیسروں کے لیئے منظور نظر ہے۔ چیلا سنگھ جیسے بے ایمان اور نا اہل لوگوں کے ہاتھوں قانون کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔ اور ان لوگوں کو کسی بھی مقدمے کی پیروی کرنے کا سلیقہ نہیں رہتا۔ بالآخر کچھ مجرم لوگ چیلا سنگھ کے بچے کا قتل کر دیتے ہیں۔ مجرموں کو گرفتار کیا جاتا ہے لیکن پولیس والے اپنی نا اہلی کی وجہ سے مجرموں کو سزا نہیں دلا سکتے کیونکہ انہیں قانون کا پتا نہیں ہوتا۔ تب انہیں رام سنگھ یاد آتا ہے کہ وہ ایک قابل انسان ہے جو اس مقدمے کی پیروی کر سکتا ہے اور مجرموں کو سزا دلا سکتا ہے۔ چیلا سنگھ اس وقت رام سنگھ سے رجوع کرتا ہے اور مدد کی بھیک مانگتا ہے لیکن رام سنگھ اسے یہ کہہ کر انکار کر دیتا ہے کہ آپ جیسے بے ایمان اور ظالم لوگوں کی وجہ سے وہ محکمے میں پچھلے لمبے عرصے سے کام نہیں کر سکا۔ بار بار تبادلے کا شکار ہوتا رہا جس کی وجہ سے وہ اپنی قابلیت کھو گیا ہے۔ تب ہر ایک کو افسوس ہوتا ہے کہ کاش ان لوگوں نے ایک بھی رام سنگھ رہنے دیا ہوتا تو آج مشکل وقت میں کام آتا۔

مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنند لہر نے افسانے میں یہ بات واضح کی ہے کہ محکمہ پولیس اس قدر بے ایمانی اور رشوت خوری کا شکار ہو چکا ہے کہ اس میں ایک ایماندار ملازم کا گزارا نہیں رہا۔ یہاں کئی لوگوں کو نہ چاہتے ہوئے بھی دوسروں کی وجہ سے جرم میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ نفی کی صورت میں انہیں طرح طرح کی مشکلات دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی قابلیت اور ایمانداری بھی کھونی پڑتی ہے۔ نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ رشوت خوری کی وجہ سے پولیس ملازمین کسی بھی مقدمے کی کارروائی صحیح نہیں کرتے۔ جس کی وجہ سے قانون اور انصاف کے دب جانے کے ساتھ ساتھ ملازمین اپنی صلاحیتیں کھو گئے ہیں۔ رشوت نے انہیں مفلوج کر دیا ہے۔ اب اگر کہیں وہ انصاف کرنا بھی چاہیں تو ان سے انصاف نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ یہ صلاحیت کھو چکے ہیں۔

## طبقاتی کشمکش

ہمارے سماج میں سرمایہ داروں اور طاقتوروں کے ہاتھوں مظلوموں، مفلسوں اور کم درجہ والے لوگوں کا استحصال کوئی نئی بات نہیں ہے۔ طاقتوروں کو جب بھی مظلوم کو دبانے کا موقع ملتا ہے تو وہ کوئی کسر باقی نہیں

چھوڑتے۔اسی طرح سرمایہ داروں کے ہاتھوں غریبوں کا استحصال بھی آئے روز بڑھ رہا ہے۔بڑے بڑے لوگ اپنے عہدے اور طاقت کا استعمال کر کے غریبوں کی عورتوں کی عصمت لوٹ رہے ہیں۔بڑے لوگ غریب اور کم درجے کے لوگوں کی بہو بیٹیوں کو اپنی ہوس کا شکار تو بناتے ہیں لیکن انہیں اپنانے کے لئے کسی بھی صورت میں تیار نہیں ہوتے۔اپنی دولت و شہرت کی وجہ سے اخلاقی قدروں اور رشتوں کے تقدس کو بھول جاتے ہیں۔جس سے ان کے اندر نفرت کا شدید جذبہ جنم لیتا ہے۔افسانہ ''چھوٹے لوگ'' اسی ضمن میں لکھا گیا ہے۔جس میں آنند لہر نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ سماج میں بڑے بڑے طاقتور لوگ اپنی طاقت کا بے جا استعمال کر کے چھوٹے لوگوں کا استحصال کرتے ہیں۔بعض لوگ اپنے عہدے کے فخر میں رشتوں کی اہمیت بھول جاتے ہیں اور دوسروں سے نفرت کرتے ہیں۔وہ اگرچہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں لیکن اخلاقی اعتبار سے بہت گر جاتے ہیں۔جبکہ بعض لوگ چھوٹے چھوٹے عہدوں پر ہو کر بھی اعلیٰ اخلاقی قدروں پر ہوتے ہیں۔نیز افسانہ نگار نے ان لوگوں کو بھی موضوع بنایا ہے جن کا رویہ عہدہ حاصل ہونے پر بالکل بدل جاتا ہے۔

افسانہ ''اچھا کام'' ذات پات کے موضوع پر محیط ہے۔جس میں آنند لہر نے ایک بڑے سرمایہ دار سیٹھ کو پیش کیا ہے۔جس کی دولت و شہرت کے چرچے ہوتے ہیں اور وہ اپنے سے کم درجے کے لوگوں سے نفرت کرتا ہے۔اپنے وضع کردہ اصولوں پر ڈٹا رہتا ہے اور اپنے سے کم درجہ والے لوگوں سے بات کرنا اور ان کی ذات میں شادی کرنا ذلت و رسوائی کا باعث سمجھتا ہے۔اس کا لڑکا خوش دیو یہ سب نہیں چاہتا۔وہ اپنے باپ کے متضاد خیالات کا حامی ہے۔ذات برادری پر یقین نہیں رکھتا۔اسی بنیاد پر وہ ایک عام لڑکی آرتی سے دل لگا لیتا ہے جو چھوٹی ذات کی ہوتی ہے۔جب سیٹھ دین دیال کو پتا چلتا ہے تو وہ بہت پریشان ہوتا ہے کہ اس کا لڑکا ایک کم ذات لڑکی کو چاہتا ہے۔دین دیال بہت غصہ کرتا ہے اور خوش دیو کو منع کرتا ہے کہ چھوٹی ذات کی لڑکی سے وہ محبت نہ کرے کیونکہ یہ ان کی عزت کے خلاف ہے۔جس کی تصویر کشی افسانہ نگار نے یوں کی ہے۔

> ''ایک دن تنگ آ کر سیٹھ دین دیال نے خوش دیو سے کہا ''خوش دیکھنے میں نے صرف سنا ہی نہیں بلکہ دیکھا بھی ہے کہ تم آرتی کو دیکھتے رہتے ہو۔'' اس پر خوش دیو نے کہا مگر اس میں برا کیا ہے۔اچانک دین دیال نے کہا۔''اس کی ذات ہمارے مطابق نہیں ہے۔'' اس پر خوش دیو نے

کہا۔''پتا جی اس کی ذات آپ کے اور ہمارے مطابق ہو نہ ہو مگر ایک بات صاف ہے کہ اس کے جسم کی بناوٹ میرے مطابق ہے۔''۳۸؎

اسی بنیاد پر دین دیال اور خوش دیو کے درمیان تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔دین دیال دوسری ذات کی لڑکی سے خوش دیو کی شادی نہیں کرنا چاہتا جبکہ خوش دیو ذات کو بالکل اہمیت نہیں دیتا۔وہ صرف آرتی کو چاہتا ہے اور اسی کو اپنانا چاہتا ہے۔باپ بیٹے کے درمیان ایک عجیب کشمکش پیدا ہو جاتی ہے۔دین دیال اپنی انا پر ڈٹ جاتا ہے جبکہ خوش دیو اپنی محبت کو حاصل کرنے کی ٹھان لیتا ہے۔کچھ دیر خوش دیو اور آرتی کی محبت کا یہ سلسلہ چلتا ہے اور اسی دوران آرتی حاملہ ہو جاتی ہے۔جس کی وجہ سے دین دیال بہت پریشان ہوتا ہے کہ سماج میں اس کی عزت ختم ہوگئی۔وہ اس کے لیے آرتی کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔لیکن آرتی کو اپنے بیٹے کے لیے قبول کرنے کے لیے کسی بھی صورت میں تیار نہیں ہوتا۔اس صدمے سے دوچار ہو کر اچانک ایک دن خوش دیو کی موت ہو جاتی ہے۔اس کے مرنے کے بعد سیٹھ دین دیال کو بہت صدمہ ہوتا ہے کہ اس کی انا کی وجہ سے اس کے بچے کی موت ہوگئی۔ایک دن اچانک اس کی نظر آرتی پر پڑتی ہے تو اس کے منہ سے نکلتا ہے کہ خوش دیو نے زندگی میں صرف یہ ایک کام اچھا کیا ہے۔وہ آرتی کو اچھی تسلیم ضرور کرتا ہے لیکن خوش دیو کی موت کے بعد۔جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو وقت گزرنے کے بعد عقل آتی ہے۔

مختصر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے سماج میں آئے روز اس طرح کے بہت سارے حادثات ہوتے ہیں۔ذات اور برادری کی وجہ سے بہت سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔کئی روحیں ان کی وجہ سے محبت میں ناکام ہو کر زندگی کی جنگ ہار جاتی ہیں۔افسانہ نگار ذات پات کے بالکل خلاف تھے اور اسی مسلئے کو ختم کرنے کے لیے انہوں نے یہ افسانہ لکھا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ بعد میں پچھتانے سے انسان کو پہلے ہی نفرت اور انا کو ختم کر کے صحیح فیصلہ کرنا چاہیے۔

افسانہ''بڑا آدمی''ایک دولت مند لیکن بد اخلاق اور بے حس انسان کی کہانی ہے۔سیٹھ گوگل چند اس افسانے کا مرکزی کردار ہے جو ہر چیز کو دولت کی نگاہ سے دیکھنا چاہتا ہے۔اس کی ایک ہی خواہش ہے کہ لوگ اسے بڑا آدمی کہیں۔مال و دولت کی فراوانی ہونے کے باوجود ہر وقت دولت اکٹھی کرنے میں مصروف رہتا ہے۔دولت اور لالچ میں اسے ہر ناجائز کام جائز نظر آتا ہے۔وہ اپنا نام اونچا کرنے کے لئے لوگوں کا استحصال کرتا ہے۔دولت کا نشہ اس سے عقل اور احساس چھین لیتا ہے۔ظلم، ناانصافی اور بے حسی کا شکار سیٹھ گوگل چند اپنے ماتحت لوگوں کا

استحصال کرتا ہے اوران پر ظلم و جبر کی انتہا کر دیتا ہے۔ گوگل چند کا کردار سماج میں ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو بے ایمانی اور ظلم و جبر سے دولت اکٹھی کرتے ہیں۔ دولت کے نشے میں انسانی اقدار کو بھول جاتے ہیں۔ نیز اپنی اصلی حقیقت کو بھول کر وقتی طور پر عیاشی کرتے ہیں اور بعد میں رسوائی اور ناکامی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ سماج میں امیر لوگ اپنی دولت اور طاقت کا سہارا لے کر کئی بدکاریوں کو انجام دیتے ہیں۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے لہر افسانے میں یوں رقمطراز ہیں۔

''ہر امیر آدمی اس دنیا میں میں سمجھتا ہے کے گناہ کرنا پاپ کرنا اس کا حق ہے اور وہ ایسا نہ کر کے سماج پر بہت بڑا احسان کر رہا ہے۔ روپیہ روپے کو لاتا ہے اور پھر بغیر محنت سے روپیہ صرف بے ایمانی کے راستے لایا جا سکتا ہے۔ اصل میں وہ روپیو کو ہی پسند کرتا تھا۔'' ۳۹

افسانہ نگار نے جہاں دولت مند لوگوں کے ہاتھوں غریبوں کے استحصال اوران کی بے ایمانی اور لوٹ کھسوٹ کی عکاسی کی ہے وہیں یہ بتانے کی سعی بھی کی ہے کہ ایک خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے صرف دولت ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اعلیٰ اخلاق، ایمانداری اور احساس و مروت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے لوگ جو صرف دولت کو ترجیح دیتے ہیں بالآخر اپنے ہی گھر میں عزت و وقار کھو کر بے چینی کا شکار ہوتے ہیں۔ سیٹھ گوگل چند کا معاملہ بھی بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جو خوب دولت اکٹھی کرتا ہے، شہرت کماتا ہے، لوگوں سے نفرت کرتا ہے اور رشتوں کے تقدس کو بالکل نہیں جانتا۔ جس کی وجہ سے اس کے گھر کا ماحول بگڑ جاتا ہے۔ ہر کوئی دولت کے نشے میں رشتوں کی اہمیت کھو جاتا ہے۔ وقت گزرنے پر گھر میں گوگل چند کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ کسی کو اس کی فکر نہیں رہتی کیونکہ اس نے کبھی رشتوں کی اہمیت نہ جانی اور نہ ہی اولاد کی تربیت کی۔ دولت کے پجاری گوگل چند کے گھر والے بھی اسے دولت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جب وہ کچھ کمانے کے لائق نہیں رہتا اور بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچتا ہے تو گھر میں اس کی بالکل عزت نہیں رہتی۔ تب اسے اپنی تمام تر دولت بیکار نظر آتی ہے اور وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے غریب شخص تصور کرتا ہے۔ جس کی منظر کشی آنند لہر نے یوں کی ہے۔

''کوئی اس کا انتظار نہ کر رہا تھا۔ مگر شراب کے عالم میں اس کی بہو نے کہہ دیا۔'' نہ جانے کب وہ بوڑھا مرے گا اور جائیداد ہمیں ملے

گی۔'' دوسری بہو نے کہا۔''ہم تو فیکٹری اپنی مرضی سے چلائیں
گے۔'' گوگل چند کی بیوی کسی کلب میں گئی ہوئی تھی۔کسی نے گوگل چند کو
کھانے کے لئے نہیں کہا، بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔''[۲۹]

اخلاقی قدروں کی گراوٹ، رشتوں کی اہمیت کا کم ہونا اور اولاد کی غلط تربیت ایسے مسائل ہیں جو عصر حاضر میں عروج پکڑتے جا رہے ہیں۔بچوں کے لیے ماں باپ کی کوئی عزت نہیں رہی۔انہیں مسائل کی ترجمانی کرتا ہوا یہ افسانہ بڑا دلچسپ ہے۔افسانے میں رکشہ والا ایک ایسا کردار ہے جو ایک غریب لیکن سلیقہ مند، باخلاق، حساس اور تربیت یافتہ خاندان کی ترجمانی کرتا ہے۔گو اس کے پاس دولت کم ہے لیکن اخلاقی قدریں اس کو بہت محدود دولت کے ساتھ چین وسکون کی زندگی گزارنے میں مدد کرتی ہے۔اپنی محدود خواہشات کے ساتھ عزت و وقار کی زندگی بسر کرتا ہے۔جس کی زندگی کو لہر نے سیٹھ گوگل چند کی زندگی پر ترجیح دی ہے۔

## ازدواجی زندگی

میاں بیوی کا رشتہ اللہ پاک نے ایک خوبصورت رشتہ بنایا ہے۔خوبصورت زندگی گزارنے کے لیے ازدواجی زندگی کا خوبصورت ہونا لازمی ہے۔میاں بیوی کی کامیاب ازدواجی زندگی ایک صحت مند خاندان کو تشکیل دیتی ہے۔میاں بیوی کے ایک دوسرے پر حقوق ہوتے ہیں جن کی ادائیگی میں اگر کسی بھی طرف سے کوتاہی ہو تو کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔اس رشتے میں پیار اور ایثار وقربانی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔اگر وہ نہ ہو تو زندگی اجیرن بن کر رہ جاتی ہے۔ہمارے سماج میں بہت ساری ایسی برائیاں ہیں جن کی وجہ سے لوگوں کی ازدواجی زندگی پریشان ہو کر رہ جاتی ہے۔جن میں بے جوڑ شادی، ذات پات اور مفلسی ایسے مسائل ہیں جو اس رشتے کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔بہت ساری عورتیں غریبی کا شکار ہو کر عمر رسیدہ مردوں کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک کر دی جاتی ہیں۔کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے اپنا من پسند اور اپنی عمر کا جیون ساتھی ہونا ضروری ہے۔یہ ایک فطری عمل ہے کہ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی خواہشات اور عادات واطوار میں تبدیلی آتی ہے۔اس لیے ایک نوجوان لڑکی کو عمر رسیدہ مرد وہ پیار محبت نہیں دے سکتا جو اس کو ضرورت ہوتی ہے۔بسا اوقات بڑے بڑے رئیسوں کے ہاتھوں غریبوں کی بچیاں بک جاتی ہیں۔کئی بار ذات پات اور رنگ ونسل کی تفریق کی وجہ سے من پسند شادی نہیں ہو سکتی جو بعدازاں ازدواجی زندگی میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔جبکہ بہت ساری بری عادات بھی اس رشتے میں دراڑ پیدا کرتی

ہیں۔خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے سب سے اہم بات جو ہے وہ یہ کہ میاں بیوی کے درمیان ذہنی ہم آہنگی ہونا لازمی ہے۔اگر کسی بھی وجہ سے ان کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہ ہو پائی تو یہ رشتہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔غریبی کے علاوہ ایک اور اہم چیز جو بالخصوص عصر حاضر میں ہمارے سماج میں عام ہوتی جارہی ہے وہ یہ کہ اعلیٰ عہدوں کو دیکھ کر کمسن بچیوں کو معمر مردوں کے ساتھ بیاہ دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی وہی مسئلہ درپیش آتا ہے کہ بڑا افسر اپنی کم عمر بیوی کو پیسہ اور زندگی کی دیگر آسائش تو فراہم کرسکتا ہے لیکن وہ پیار و محبت نہیں دے سکتا جو ایک نوجوان لڑکی کو چاہئے۔ یہ مسئلہ پہلے سے ہمارے سماج میں رہا ہے اور اب زیادہ تقویت پکڑ چکا ہے۔ ہمارے قلم کاروں کے لیے اہم موضوع رہا ہے۔ اردو ادب میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔آنند لہر نے بھی اس موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے کچھ افسانے تخلیق کیے ہیں جن میں بیراگن، کئی رنگ، اور اس روز، قابل ذکر ہیں۔

''بیراگن'' میں آنند لہر نے گوتم پرشاد اور سریتا کی ازدواجی زندگی کو پیش کیا ہے۔ بہت سارے مردوں کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی فرماں بردار، خوبصورت اور خوش اخلاق بیوی کو چھوڑ کر دیگر عورتوں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنی بیوی میں ہزاروں خوبیاں ہونے کے باوجود دوسری عورتیں اچھی لگتی ہیں۔ گوتم پرشاد کی کہانی بھی یہی ہے کہ سریتا سے اس کا نکاح ہو جاتا ہے۔سریتا ایک سلیقہ مند اور وفا شعار بیوی کی طرح اس کی خدمت بجالاتی ہے لیکن گوتم پرشاد کا دل کسی بھی صورت میں سریتا سے نہیں لگتا۔ گوتم پرشاد کا دل دنیا سے اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ سریتا کو کسی بھی صورت میں اپنانے کو تیار نہیں ہوتا۔ سریتا، گوتم پرشاد کا بیراگ توڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتی۔آخر ایک دن ان کی گلی سے ایک ویشیا کا گزر ہوتا ہے جو گھنگرو بجارہی ہوتی ہے۔ گوتم پرشاد دلچسپی سے گھنگرو کی آواز سنتا ہے۔ سریتا کو لگتا ہے کہ ہو سکے اس بہانے اس کا بیراگ ٹوٹے۔ وہ سجا سنوار کر گوتم پرشاد کو ویشیا کے پاس گھنگرو کی آواز سننے کے لیے لے جاتی ہے۔ جہاں یہ سلسلہ کچھ دن چلنے کے بعد گوتم پرشاد ویشیا پر عاشق ہو جاتا ہے۔ سریتا کو امید لگتی ہے کہ ویشیا کے بہانے گوتم پرشاد کا بیراگ ٹوٹے گا اور وہ سریتا کے ساتھ رشتہ اچھے سے نبھائے گا۔لیکن گوتم پرشاد ویشیا پر عاشق ہو جاتا ہے اور سریتا اسے ایک بوجھ نظر آنے لگتی ہے۔ سریتا سے اس کی نفرت مزید بڑھ جاتی ہے اور وہ دل جمی سے ویشیا کے گلی کوچے میں چکر لگانا شروع کر دیتا ہے۔ افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''گوتم پرشاد کا دل اسی دنیا میں لگنے لگا۔ سریتا بڑی خوش ہوگئی کہ چلو اس

کے پتی کا بیراگ ختم ہونے لگا ہے۔ مگر ادھر سریتا گوتم پرشاد کو ایک بوجھ
نظر آنے لگی۔ وہ آہستہ آہستہ سوچنے لگا کے اس کی دنیا میں سریتا کی
ضرورت نہ ہے۔''۴۱؎

سریتا کی آخری امید ختم ہو جاتی ہے اور اس کا دل دنیا سے بیزار ہو جاتا ہے۔ اسے دنیا کی ہر چیز بیکار نظر آتی ہے اور لگتا ہے کہ عورت کا جسم کھلونے کی طرح ہے۔ جس سے کسی بھی وقت کوئی بھی کھیل سکتا ہے۔ اسی دوران گوتم پرشاد ویشیا سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے اسے دل وجان سے پیار کرتا ہے اور اسے اپنانا چاہتا ہے۔ لیکن ویشیا یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہے کہ اس کا جسم کسی ایک کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ وہ کسی ایک کی ہو کر نہیں رہ سکتی۔ وہ کئی لوگوں کے لئے دل بہلائی کا سامان ہے۔ ویشیا گوتم شاد کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کام میں مگن ہو جاتی ہے۔ جس سے گوتم پرشاد بے آبرو ہو کر واپس لوٹتا ہے اور اسے تب احساس ہوتا ہے کہ اپنی بیوی سے زیادہ وفادار اور پیار و محبت کرنے والی کوئی عورت نہیں ہو سکتی۔ اس منظر نامے کو افسانہ نگار نے یوں پیش کیا ہے۔

''وہ وشیا کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ وہ اس کا ہو گیا ہے۔ اس پر
ویشیا نے کہا اس کا وقت بٹا ہوا ہے۔ اس کا حسن گلی میں لگے بلب کی
طرح ہے جو راستہ تو روشن کر سکتا ہے مگر کسی کے گھر کا اندھیرا نہ مٹا سکتا
ہے۔ یہ کہہ کر ویشیا نے محفل لگا دی اور دوسرا گانا شروع کر دیا۔ گوتم
پرشاد کو گیان ہو گیا۔ اسے لگا کہ سریتا ہی سب سے خوبصورت ہے۔ وہ
اس کی بیوی ہے۔۔۔۔
مگر جب وہ گھر پہنچا تو حیران ہو گیا۔۔۔ کیونکہ اسے معلوم ہو گیا کہ
سریتا بیراگن بن کر چلی گئی ہے۔''۴۲؎

ویشیا کے در سے رسوا ہونے کے بعد گوتم پرشاد کو اپنی بیوی سریتا کی قدر آتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اپنی ہی بیوی خوبصورت ہے، اسی سے گھر کی رونق ہے۔ تب وہ اس سے رجوع کرنا چاہتا ہے لیکن تب تک سریتا اس کے ظلم و عتاب سے تنگ آ کر اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ گوتم پرشاد کے روپ میں آنند لہر نے ان لوگوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو بنا سوچے سمجھے اپنی فرماں بردار، سلیقہ مند اور وفا شعار بیوی کو نظر انداز کر کے ایک ویشیا کے پیچھے

بھٹک جاتے ہیں۔ان کو حاصل کرنے کے لیے اپنی عورتوں کو ظلم وزیادتی اور ناانصافی کا شکار بناتے ہیں۔عورتوں کی زندگی جہنم بنانے کے ساتھ ساتھ اپنی بھی بناتے ہیں۔جس کا احساس انہیں وقت گنوانے کے بعد ہوتا ہے۔ہمارے سماج میں بہت سارے ایسے لوگ ہیں جن کی نادانی، بدمزاجی اور جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے کئی عورتیں اپنی زندگی کھو جاتی ہیں۔سریتا کا گوتم پرشاد کے لیے پیار و محبت اور ایثار و قربانی کا جذبہ اور گوتم پرشاد کی طرف سے اسے نظر انداز کرنا بےحسی کی عمدہ مثال ہے۔

افسانہ ''کئی جنگ'' بھی اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔اس میں بھی ایک بداخلاق مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ ناانصافی کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔شروع ہی سے مرد عورت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتا آیا ہے۔اصل میں مرد عورت کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے اور اسے اپنے آرام و آسائش کا سامان تصور کرتا ہے۔عورت کے حقوق اسے نظر نہیں آتے۔زیرنظر افسانے میں ایک ایسے مرد کی کہانی کو پیش کیا گیا ہے جو ہر وقت اپنی انا پر ڈٹا رہتا ہے اور اس کی نظروں میں بیوی کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔حمید اس کہانی کا مرکزی کردار ہے جبکہ بانو اس کی بیوی ہے۔حمید ایک الگ قسم کا آدمی ہے۔ جسے اپنے برابر کوئی نظر نہیں آتا۔وہ بیوی کو اپنی جاگیر سمجھتا ہے اور چاہتا ہے کہ جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔اس کی بیوی بالکل اس کے حکم کے مطابق اور اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارے۔اسے کسی بھی مسئلے میں اپنی رائے دینے یا اپنے طریقے سے زندگی جینے کا حق حاصل نہیں ہے۔حمید کے نزدیک بانوں کی قدر و قیمت گھر کے عام سامان جیسی ہے۔جس کی تصویرکشی کرتے ہوئے آنندلہر یوں لکھتے ہیں۔

> ''بدقسمتی سے حمید سمجھتا تھا کہ اس کی ہر پسند بانو کی پسند ہے اور بانو کو اپنی پسند کا کوئی حق نہ ہے۔حمید اسے اپنے گھر کی ایک چیز سمجھتا تھا۔وہ سمجھتا تھا کہ جیسے گھر کے اندر دوسرا سامان ہے اسی طریقے سے بانو بھی ہے۔''۴۳

بانو ایک سلیقہ مند اور فرماں بردار بیوی کی طرح حمید کی خدمت کرتی ہے لیکن حمید اس سے خوش نہیں ہوتا۔وہ ایک دفتر میں ملازمت کرتا ہے جہاں اسے اپنا کام ٹھیک ڈھنگ سے کرنا نہیں آتا۔دفتر کا تمام غصہ بھی وہ بانو پر نکالتا ہے۔حمید آہستہ آہستہ بانوں پر زیادہ ظلم شروع کر لیتا ہے۔بالآخر جب حمید کا ظلم حد سے بڑھ جاتا ہے تو بانو اپنے مائیکے چلی جاتی ہے۔جب حمید اسے لانے کے لئے اس کے گھر جاتا ہے تو وہ ساری حقیقت اسے سناتی

ہے۔تب حمید شرمندہ ہوکر واپس لوٹنے لگتا ہے تو اس وقت بھی بانو کی حمید کے تئیں محبت نہیں چھپ سکتی اور وہ حمید کو چائے پی کر جانے کے لیے بولتی ہے۔تب حمید شرمندہ ہوتا ہے اور اسے بانو کی محبت کا احساس ہوتا ہے۔اور یہ بات اس پر واضح ہوتی ہے کہ بیوی کی محبت کے کئی رنگ ہیں۔یعنی وہ ظلم وعتاب برداشت کرنے کے بعد بھی اور ناراضگی و غصہ ہونے کے باوجود بھی اس سے محبت کرتی ہے۔آنند لہر نے زیر نظر افسانے میں بیوی کی اپنے خاوند کے تئیں محبت اور قربانی کے جذبے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔جب کہ ان مردوں کو بھی پیش کیا ہے جنہیں عورت کے مقام و مرتبہ اور ان کے حقوق اور عزت واحترام کا احساس اور علم نہیں ہوتا۔وہ اپنی نادانی اور جہالت کی وجہ سے عورت کا غلط استعمال کرتے ہیں۔عورت کو سماج میں وہ مقام ومرتبہ نہیں ملتا جو اسے حاصل ہونا چاہیے۔

افسانہ ''اس روز'' کی کہانی بھی ازدواجی زندگی پر محیط ہے۔اصل موضوع زندگی میں چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے طلاق کی نوبت آنا ہے۔دراصل میاں بیوی کا رشتہ برداشت صبر اور ایثار وقربانی کا رشتہ ہے۔ ہرانسان کی زندگی میں کوئی نہ کوئی موڑ ایسا آتا ہے جہاں صبر وتحمل درکار ہوتا ہے۔انسان ہر حال میں غلطی کا پتلا ہے۔عورت ہو یا مرد ہر ایک سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔لیکن اس رشتے کو نبھانے کے لیے مرد وخواتین دونوں اگر برداشت نہ کریں تو یہ رشتہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔زیر بحث افسانے میں آنند لہر نے اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔راجہ اور روزی دو مرکزی کردار ہیں۔روزی راجہ کی بیوی ہے لیکن راجہ روزی کو چھوڑ کر کرن نامی ایک عورت کو چاہنے لگتا ہے۔یہ بات اس کی بیوی کو برداشت نہیں ہوتی جس سے ان کے درمیان بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں اور طلاق تک نوبت آجاتی ہے۔

ان کی زندگی معمول کے مطابق خوبصورت گزر رہی تھی لیکن اچانک راجہ کی زندگی میں کرن آجاتی ہے۔ جس سے ان کا ازدواجی رشتہ بکھر جاتا ہے۔جب روزی کو یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ راجہ کے تعلقات روزی کے ساتھ ہیں تو راجا اور روزی کے رشتے کے درمیان دراڑیں پڑنا شروع ہوگئیں۔مسلہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن دونوں اپنی اپنی ضد پر اڑ گئے۔جس کے نتیجے میں طلاق کی نوبت آ گئی۔طلاق سے قبل انہوں نے اس مسئلے پر غور نہ کیا اور نہ ہی طلاق کے نتائج پر سوچنے کی کوشش کی۔لیکن معمولی بات پر طلاق ہو جانے کے بعد راجہ اور روزی دونوں کو بہت افسوس ہوا کہ کاش ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا۔طلاق کے بعد انہیں ایک دوسرے کی محبت کا احساس ہوتا ہے۔ازدواجی زندگی اور اس رشتے کے تقدس کا احساس ہوتا ہے۔تب انہیں بے حد صدمہ ہوتا ہے۔دونوں کو اپنی اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے

اوروہ دونوں ایک بار پھر مل کر اپنی اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ وعدہ کرتے ہیں کہ انہیں بھول کر اور اپنے اندر برداشت کا مادہ پیدا کر کے ہم پھر سے اس رشتے کو حسین بنا سکتے ہیں۔ یہ طے ہونے کے بعد رانی راجہ سے لپٹ جاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ اگر ہم اس روز غلط تھے تو اس روز ہمیں ٹھیک ہو جانا چاہیے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو افسانہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ازدواجی زندگی میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کی غلطیاں نکالنے کے بجائے اپنے اندر برداشت کا مادہ پیدا کرنا چاہیے۔ ایک دوسرے کی غلطیوں پر نظر رکھنے کے بجائے خوبیوں کو سراہنا چاہیے۔ معمولی غلطیوں اور بدگمانیوں کو اتنا طول نہیں دینا چاہیے جن سے رشتہ ختم ہو جائے۔ نیز یہ کہ بعد میں پچھتانے سے بہتر ہے کہ انسان پہلے صبر و تحمل اور سوچ سمجھ سے کام لے۔ غلطی انسان کی فطرت میں ہے لیکن غلطی پر ڈٹے رہنا اچھے انسان کی پہچان نہیں۔ انسان کو دوسرے کی غلطیاں تلاش کرنے کے بجائے اپنی غلطیوں کا احساس ہونا چاہیے۔ جس سے رشتے حسین ہو جاتے ہیں۔ افسانہ اس روز یہی درس دیتا ہے کہ اگر ایک دن انسان سے غلطی ہو جائے تو پھر اس پر ڈٹے رہنے اور اپنی انا کو تسکین دینے کے بجائے غلطی کا اعتراف کر لینا بڑا پن ہے اور یہ رشتوں کی بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔

## ہجرت

ہجرت اگر چہ اپنی مرضی سے کی جائے یا حالات کی مجبوری کی وجہ سے یہ کربناک ضرور ہوتی ہے۔ اپنے وطن عزیز سے محبت کس کو نہیں ہوتی۔ انسان جس جگہ رہتا ہے، جس سماج میں رہتا ہے اس سے اس کی ہزاروں خواہشیں جڑی ہوتی ہیں۔ ہجرت سے انسان نہ صرف وطن عزیز کھو جاتا ہے بلکہ اسے اپنی تہذیب و ثقافت بھی کھونی پڑتی ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہجرت سے خونی رشتے بکھر جاتے ہیں۔ جن کا ازالہ کسی بھی صورت میں نہیں ہوسکتا۔ وطن عزیز کو چھوڑنا اور اپنوں سے جدا ہونا یقیناً یہ مقام قیامت سے کم نہیں ہوتا۔ اس سے بڑھ کر انسانی زندگی میں کربناک المیہ کیا ہوسکتا ہے۔ اردو ادب میں ہجرت کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہماری تاریخ کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔ بٹوارے کے بعد دوطرفہ ہجرت اور اس دوران ہونے والے قتل و غارت کو کون بھول سکتا ہے۔ یہ اس وقت کا ایک اہم موضوع تھا جسے ادب میں خوب جگہ ملی۔ آنند لہر نے بھی بٹوارہ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ ''ایک اور ہجرت'' پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس میں انہوں نے کشمیری پنڈتوں کی وادیٔ کشمیر سے جموں ہجرت کے دردناک واقعہ کو پیش کیا ہے۔

ہجرت ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہو یا اندرون ملک اس کا درد و کرب ضرور ہوتا ہے۔افسانہ ''ایک اور ہجرت'' میں وادیٔ کشمیر میں سکونت پذیر کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کی عکاسی کی گئی ہے۔وادیٔ کشمیر جس کو جنت بے نظیر کہا جاتا ہے اور جسے دیکھنے کے لئے لوگوں کی آنکھیں ترستی ہیں۔اس کے دیدار کے لیے دنیا کے کونوں کونوں سے لوگ آتے ہیں۔اس حسین وادی کی گود میں پشت در پشت زندگی کی لطافتوں سے لطف اندوز ہونے والوں کو جلاوطن کر دیا جائے تو ان کے دل کی کیفیات کیا ہوسکتی ہیں۔اس سے بڑھ کر کوئی دردناک حادثہ ان کے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔اس بات کا اندازہ ان فنکاروں کی تخلیقات سے لگایا جا سکتا ہے جنھوں نے اس کرب ناک واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔آنند لہر چونکہ جموں وکشمیر کے باسی تھے۔انہوں نے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر وادی سے ہجرت کرنے والے کشمیری پنڈتوں کو جموں میں زندگی گزارتے ہوئے بھی بہت قریب سے دیکھا تھا۔لہر نے وطن عزیز کے فراق میں تڑپتے ہوئے کشمیری پنڈتوں کو مغموم آنکھوں کے ساتھ دیکھا تھا۔پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ اس موضوع پر ان کا قلم خاموش رہتا۔

کشمیر جہاں اپنی خوبصورتی اور رعنائی کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور ہے وہیں یہاں کی مخصوص تہذیب و ثقافت بھی اپنا الگ مقام رکھتی ہے۔مشترکہ تہذیب کے چرچے بھی کشمیر میں عام رہے ہیں۔مشترکہ تہذیب اور امن وسکون کی زندگی کی کشمیر میں ایک لمبی تاریخ رہی ہے۔جس نے ۱۹۴۷ء کے بعد آہستہ آہستہ دم توڑنا شروع کیا۔آزادیٔ ہند کے بعد جموں وکشمیر کے حالات بگھڑنا شروع ہوئے،مشترکہ تہذیب دم توڑنے لگی،امن وسکون کی زندگی خون خرابے میں بدلنے لگی۔افسانہ ''ایک اور ہجرت'' انہیں چیزوں کا احاطہ کرتا ہے۔آنند لہر نے کشمیر کی مشترکہ تہذیب،خوبصورت مناظر اور امن وسکون کے دور کو پیش کرتے ہوئے اس کے بعد کے نامساعد حالات،پنڈتوں کی ہجرت،ہجرت کے درد و کرب،مشترکہ تہذیب کے بکھراؤ اور مہاجروں کی وطن واپسی کی تڑپ اور تمنا کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔

۱۹۴۷ء کے فوراً بعد جموں وکشمیر کے حالات بگڑ جاتے ہیں۔جو آہستہ آہستہ عروج پکڑنا شروع ہوتے ہیں۔بعد ازاں علحٰدگی پسند لوگوں کا ایک گروہ ابھر کر سامنے آتا ہے اور یوں کشمیر میں علحٰیدگی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے۔جس سے حالات مزید بگڑتے ہیں۔ریاست میں اگر واد جنم لیتے ہیں۔جنہیں مذہبی رنگ دیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر مشترکہ تہذیب بکھرنا شروع ہوتی ہے۔ہندو مسلم اتحاد بعض بدگمانیوں کی وجہ سے ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

۱۹۹۰ء تک پہنچتے پہنچتے یہ مسئلہ بڑا سنگین ہو جاتا ہے اور نہ مسائد حالات کی وجہ سے کشمیری پنڈت وادیٔ کشمیر کے حالات کو ناموافق سمجھتے ہوئے وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کشمیری پنڈتوں کی اکثریت وادیٔ کشمیر سے جموں ہجرت کر جاتی ہے۔ ہجرت سے کشمیری پنڈتوں کی زندگی مفلوج ہو کر رہ جاتی ہے اور انہیں ایک عظیم صدمے سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے آنند لہر افسانہ ''ایک اور ہجرت'' میں لکھتے ہیں۔

> ''پہلے تو اسے یقین نہ آیا مگر بعد میں جب موت کا کھیل شروع ہوا تو اسے کشمیر چھوڑنا پڑا۔ سارا سامان ایک ٹرک میں لاد دیا گیا۔ اس میں کمرے کو سجانے کے خوبصورت قالین بھی تھے جو جب زمین سے اٹھائے گئے تو پھٹ گئے۔ لگا کہ جیسے ہجرت کے خلاف احتجاج کر رہے ہوں اور برتن بھی ایک دوسرے سے ٹکرائے اور انہوں نے بھی جیسے شور کیا ہو اور کہا ہو ''یہ غلط ہے، اسے مت ہونے دو۔'' مگر ان سب کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔'' ۴۴

مندرجہ بالا اقتباس سے جہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کشمیری پنڈتوں نے حالات سے مجبور ہو کر ہجرت کی اور اس مشکل وقت میں سیاسی جماعتوں اور حکومت نے ان کے لئے کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں کی۔ تاہم آنند لہر نے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ کشمیری مسلمان کشمیری پنڈتوں کی ہجرت نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی وہ کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کا سبب بنے۔ عام انسان ہجرت کے حق میں بالکل نہیں تھا لیکن بعض شر پسند عناصر اس دوران ایسے پیدا ہو چکے تھے جن سے محفوظ رہنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لہر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان حالات سے نہ صرف کشمیری پنڈت غیر محفوظ تھے بلکہ کشمیری مسلمان بھی ان ناگفتہ بہ حالات سے متاثر ہوئے۔ جس کا اندازہ افسانے کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

> ''اس کے پڑوسی اسے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ اسے روکیں یا نہ روکیں۔ یہ سوال ان کے دل میں اٹھ رہے تھے کے اگر وہ اسے روک بھی لیں تو کیا وہ اس کی بیوی کی حفاظت کر سکیں گے۔ اس کی بہن کو ان ہوس بھری نظروں سے بچا سکیں گے جو کشمیر کا مقدر بن چکی

ہیں۔سب کچھ سامنے سامنے ہورہا تھا۔زبانیں تھیں مگرلوگ گونگے ہو

گئے تھے۔'' ۴۵؎

مندرجہ بالا اقتباس سے کشمیر کے اس وقت کے حالات کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔کشمیر سے جموں ہجرت کرنے کے بعد لوگوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ان کی عکاسی بھی افسانہ نگار نے بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔ہجرت انسان کی تہذیب وثقافت بدل دیتی ہے،ان کا رہن سہن،کھان پان،آب وہوا سب کچھ بدل دیتی ہے۔یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ کشمیر کی خوبصورت وادی میں چشموں کا صاف وشفاف پانی پینے والے،ٹھنڈی ہواؤں اورمشہورومخصوص پکوان کا مزہ لینے والے لوگ شدت کی گرمی،گردآلود ہوااوراپنی طبیعت سے موافقت نہ رکھنے والے کھانے پسند کرتے۔بہرحال مجبوری میں دن کٹنے لگے اور وطن کی یاد انہیں تڑپانے لگی۔ادھرادھران کی واپسی کی خبریں پھیلنے لگیں اوروہ اس امید پردن کاٹنے لگے لیکن ان کی وطن واپس جانے کی تمنا پوری نہ ہوسکی۔یہاں تک کہ ان کی نئی پیڑی جوان ہوگئی۔نئی نسل کے لوگوں کا جنم اور پرورش کیونکہ نئے سماج میں ہوئی۔اس لئے ان کے لئے خطہ جموں ہی اپنا وطن بن گیا۔جس سے نئی اور پرانی نسل کے درمیان ایک کشمکش پیدا ہوگی۔اوراب ان کے لئے ایک مسئلہ اورکھڑا ہوگیا کہ اگروہ واپس مادروطن لوٹیں گے تو ان کو ایک اورہجرت کرنی پڑے گی۔ایک بار پھراپنے وطن کو چھوڑنا پڑے گا۔کیونکہ جموں میں ایک لمبا عرصہ گزارنے سے جموں بھی اب ان کے لئے ایک محبوب جگہ بن گئی ہے۔ آنندلہر نے کشمیری پنڈتوں اوران کے بچوں کے درمیان اسی کشمکش پرافسانے کا اختتام کیا ہے۔جس میں بزرگ اپنے مادرعزیزواپس جانے کی تمنا دل میں سجائے بیٹھے ہیں جبکہ جموں میں جنم لینے والی ان کی نئی نسل اس بات پرراضی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا وطن جموں ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ پھرسے ہجرت کی جائے۔چونکہ ہجرت درد وکرب کا نام ہے۔اس بنیاد پرآنندلہر نے اس افسانے کا نام بھی ایک اورہجرت تجویز کیا ہے۔

## عشق ومحبت

عشق ومحبت ہمارے ادب کا غالب موضوع رہا ہے۔ہماری شاعری توشروع شروع میں اسی موضوع تک محدود رہی۔لیکن نثر میں بھی اس موضوع پرکچھ کم نہیں لکھا گیا۔اردوفکشن کا جہاں تک تعلق ہے تو ہماری داستانیں اور ناول عشق ومحبت کے قصوں سے بھرے پڑے ہیں۔محبت کے کئی رنگ ہیں۔ماں باپ سے محبت،خالق کائنات سے محبت،اپنے کسی مقصد سے محبت وغیرہ۔محبت کا جذبہ ایک فطری عمل ہے۔مردوزن کی محبت کے قصے شروع سے ہی

مشہور رہے ہیں۔محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو رنگ ونسل ،مذہب وملت اور دولت وشہرت کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔لیکن یہ تمام چیزیں محبت کی راہ میں حائل ضرور ہوتی ہیں۔ یہ ایک ایسا رشتہ ہے جس کے لیے دلوں کا صاف ہونا اور ایثار وقربانی کا جذبہ ہونا ضروری ہے۔ یہ رشتہ ایک طرفہ کھیل نہیں بلکہ دوطرفہ قربانی کا متقاضی ہے۔ ہمارے قلم کاروں نے اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ جہاں تک آنندلہر کا تعلق ہے تو انہوں نے بھی ''تیروں کا کھیل،حساب جیومیٹری،اس نے سوچا،اورعشق کی ہار،جیسے افسانے لکھ کر اس موضوع کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

''حساب جیومیٹری'' آنندلہر کا ایک خوبصورت اور مختصرافسانہ ہے۔جس میں لہر نے مرد کی محبت،احساس اورقربانی کا ذکر کرتے ہوئے عورت کی بے وفائی،موقع پرستی اور خودغرضی کو پیش کیا ہے۔عورت کی فطرت میں ہے کہ وہ اپنے سے کم عہدے والے مرد کوتسلیم نہیں کرتی۔افسانہ''حساب جیومیٹری'' میں آنندلہر نے کرشن اور نیرو کے عشق کی کہانی کو پیش کیا ہے۔کرشن اور نیرو جو کہ ہم جماعت ہوتے ہیں ان کوایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔نیرو کے باپ کا انتقال ہو جاتا ہے۔اس کے گھر کے حالات کچھ بہترنہیں ہوتے لیکن وہ ان حالات کے باوجود اپنی تعلیم جاری رکھتی ہے۔کرشن کوحساب میں مہارت ہوتی ہے اور نیرو کوجیومیٹری میں۔وہ دونوں ایک دوسرے سے حساب اور جیومیٹری سیکھتے ہیں۔کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلنے کے بعد کرشن کی محبت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر امتحان میں کچھ سوال اس لئے غلط کر دیتا ہے تا کہ نیرو کے نمبراس سے زیادہ آسکیں۔حالانکہ وہ اس سے زیادہ قابلیت رکھتا تھا۔جب بارہویں جماعت کا نتیجہ آتا ہے تو نیرو کلاس میں اول آتی ہے جبکہ کرشن کم نمبر لے کر پاس ہوتا ہے۔بارہویں میں اول آنے کی وجہ سے نیرو کو ڈاکٹری کی سیٹ مل جاتی ہے۔جس سے اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔کرشن کی پڑھائی کا سلسلہ رک جاتا ہے جبکہ نیرو کی زندگی بدل جاتی ہے۔اوراب کرشن اس کے لئے ایک معمولی لڑکا بن جاتا ہے۔جس کی اہمیت نیرو کی نظروں میں بالکل بھی نہیں رہتی۔نیرو ڈاکٹر بن جاتی ہے جبکہ اس کے لئے قربانی دینے والا نیروزندگی کی جنگ ہار کر اس کی یاد میں در بدر مارا پھرنے لگتا ہے۔جس کی عکاسی کرتے ہوئے افسانہ نگار یوں رقم طراز ہیں۔

> ''ایک دن کرشن نیرو کو دیکھنے کے لیے شہر میں اس کے کالج میں گیا۔وہاں نیرو اپنے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ بیڈمینٹن کھیل رہی تھی۔اس نے نکر پہنی ہوئی تھی۔کرشن کو سمجھ آگئی کہ اس کے اور نیرو کے

درمیان اب بہت کم چیزیں مشترکہ رہ گئی ہیں۔ مگر نہ جانے کیوں کرشن
کے دل کے اندر نیرو کو چاہنے کی آرزو کبھی ختم نہیں ہوئی۔"٤٦

نیرو کی نظروں میں کرشن کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اسے اس کی محبت بالکل یاد نہیں رہتی۔ جبکہ کرشن کی نظروں میں نیرو کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اب اس کا اور نیرو کا معیار برابر نہیں رہا۔ نیرو اب اسے مل نہیں سکتی۔ کرشن اس سے محبت کرتا ہے اور اس کے عہدے کی خوشی مناتا ہے۔ کرشن کو نیرو کی یاد ستانے لگتی ہے اور وہ دل بہلائی کے لیے شراب پینا شروع کر دیتا ہے۔ جس سے وہ کئی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن بیمار ہونے پر بھی کرشن خوش ہوتا ہے کہ وہ علاج کے لیے اسپتال جائے گا جہاں نیرو اسے چیک کرے گی اور اس بہانے اس کی ملاقات ہو جائے گی۔ کرشن اس امید پر کہ نیرو اس کا علاج کرے گی زیادہ شراب پی کر اپنی بیماری بڑھاتا ہے۔ لیکن آخر کار اس کی یہ امید بھی پوری نہیں ہوتی کیونکہ جو بیماری اسے ہوتی ہے، نیرو اس کی ڈاکٹر نہیں ہوتی۔

آنند لہر نے بتایا ہے کہ جو لوگ مطلبی ہوتے ہیں وہ وقت گزرنے کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ انہیں دوسروں کی محبت کا احساس نہیں ہوتا۔ اور جو لوگ سچے دل سے، ایمانداری سے دوسروں کو چاہتے ہیں انہیں ناکامی اور رسوائی کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ افسانہ "تیروں کا کھیل" بھی اسی موضوع پر لکھا گیا ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے کہ اگر کوئی کسی سے دل و جان سے محبت کرنے لگے تو پھر اسے اس کے بنا کچھ نظر نہیں آتا۔ محبت انسان کے دل میں تیر کے مانند لگتی ہے۔ جب کوئی محبت میں ناکام ہو جاتا ہے تو اس کا دل اس طرح زخمی ہوتا ہے جیسے تیر لگے ہوں۔ زیر بحث افسانے میں آنند لہر نے راجہ کی محبت کو پیش کیا ہے۔ راجہ نیرا کو بے حد چاہتا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کے عشق کی قسمت میں ہارنا ہے۔ جو عشق کا کھیل کھیلتا ہے اس کے نصیب میں ہار ضرور ہوتی ہے۔ راجہ جنون کی حد تک نیرا کو چاہتا ہے۔ نیرا کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ایک دن اچانک اس کی دنیا لٹ جاتی ہے جب وہ نیرا کو ایک اور لڑکے کے ساتھ دیکھتا ہے۔ جس کی تصویر کشی افسانہ نگار نے یوں کی ہے۔

"میری بس اتنی خواہش تھی کہ میرا تیر، تیر کی طرح نیرا کے دل پر لگے اور
اس کے دل سے پیار کا چشمہ پھوٹے۔ ایسا کرتے ہوئے میری ماں مر
گئی۔ میرا گھر اجڑ گیا مگر میرے دل کی دنیا اس دن اجڑی جب نیرا کے
ساتھ ایک راجکمار آیا اور نیرا نے اسے کہا "یہ راجہ ہے تیروں کا کھیل

اچھا کھیلتا ہے۔زخم بھی سہتا ہے لہولہان ہونے پر بھی تیر کی طرح ہی تیر
مارتا ہے۔''۴۷

آنندلہر نے عشق کو تیر کی مانند قرار دیا ہے۔جو انسان کے دل کے پار ہو کر اسے کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔اس میں انسان کو ہزاروں زخم کھانے پڑتے ہیں اور جو لوگ یہ کھیل کھیلتے ہیں ان کا رتبہ بہت بڑا ہوتا ہے۔لیکن لوگ اسے سمجھتے نہیں۔عشق و محبت کا صلہ اچھا نہیں ملتا۔

افسانہ''اس نے سوچا''میں بھی ایک سچے دل اور قربانی کا جذبہ رکھنے والے ناکام عاشق کی کہانی بیان کی گئی ہے۔اس طرح کے واقعات ہمارے سماج میں آئے روز ہوتے رہتے ہیں کہ جو لوگ کسی کو دل و جان سے چاہتے ہیں وہ کسی نہ کسی مجبوری، بے بسی اور سماجی ستم ظریفی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہو سکتے۔کہیں غربت محبت کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے تو کہیں ذات پات اور مذہب و ملت۔افسانہ''اس نے سوچا''کا مرکزی کردار گوبند ہے۔جو گوپالنی نامی ایک لڑکی سے پیار کرتا ہے۔گوپالنی ایک امیر باپ کی بیٹی ہے جبکہ گوبند غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔گوبند گوپالنی کو پانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور اس کے عشق میں اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے۔بالآخر اس کی غربت آڑے آتی ہے اور وہ گوپالنی کو حاصل کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔گوپالنی ایک امیر گھرانے کے لڑکے روشن سے شادی کر لیتی ہے۔جس کی تصویر کشی افسانہ نگار نے یوں کی ہے۔

''پھر کیا ہوا کہ گوپالنی کی شادی روشن سے ہوگئی۔دھوم دھام سے یہ
شادی ہوگئی اور گوبند نے اس میں حصہ بھی لیا۔لوگوں نے بارات کو
دیکھا۔گوبند نے بارات کا سواگت کیا۔روشن بھی ایک امیر ماں باپ کا
بیٹا ہے۔روشن اور گوپانی کی نئی زندگی شروع ہوگئی۔خوشی اور محبت کی
زندگی۔''۴۸

اس کے بعد گوبند ایک آشرم کھولتا ہے۔جہاں وہ یتیم بچوں اور بیوہ عورتوں کو پناہ دیتا ہے۔ان کی خدمت کرتا ہے اور خدمت خلق اپنا پیشہ بنا لیتا ہے۔کچھ عرصے کے بعد وہ گوپالنی کو دیکھتا ہے اور شکر کرتا ہے کہ اس کی شادی اس سے نہیں ہوئی کیونکہ وہ اپنی غربت کی وجہ سے اپنے آپ کو گوپالنی کے قابل نہیں سمجھتا۔وہ محسوس کرتا ہے کہ گوپالنی ایک امیر گھرانے کی لڑکی تھی اگر اس سے اس کی شادی ہوگئی ہوتی تو وہ اسے نہ سنبھال سکتا۔

افسانے میں جہاں ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ ہمارے سماج میں بہت ساری ایسی لڑکیاں ہیں جو ایک غریب لڑکے سے کچھ وقت کے لئے رشتہ استوار کر لیتی ہیں لیکن زندگی بھر اس کا ساتھ نبھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتی۔ جبکہ دوسری طرف ان غریب لوگوں کی عکاسی کی گئی ہے جو تمام تر قربانیوں کے باوجود اپنی غریبی اور مفلسی کی وجہ سے اپنا پیار کھو دیتے ہیں۔ نیز افسانے سے ایک درس یہ بھی ملتا ہے کہ عصر حاضر میں ہماری نوجوان نسل کس طرح اپنے انجام کو بھول کر لڑکیوں کے لئے دیوانہ وار پھرتے ہیں۔ اپنا سب کچھ کھو دیتے ہیں اور بالآخر ناکام ہو کر ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہیں۔ اپنے اصل مقصد سے دور ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض ذہنی توازن کھو جاتے ہیں۔

ہمارے سماج میں نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنی غریبی کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے فیصلے سماج کے بڑے لوگوں پر چھوڑنے پڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے بچوں کی زندگی کے فیصلے بھی وہی لوگ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو اپنی انا کے لئے دوسروں کی زندگی کی تمام خوشیاں اور خواہشیں ختم کر دیتے ہیں۔ افسانہ ''عشق کی ہار'' میں آنند لہر نے اسی طرح کی ایک کہانی پیش کی ہے۔ جس میں گاؤں کے سرپنچ اور دیگر بڑے لوگ مل کر اپنی انا کی تسکین کے لیے اور اپنی پگڑی اونچی رکھنے کے لیے دو جسموں کی آپسی محبت ناکام بنا دیتے ہیں۔ ایک غریب باپ کی بچی کو اپنے من پسند انسان کے لڑ لگا دیتے ہیں۔ جس سے نہ وہ بچی راضی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے ماں باپ لیکن انہیں مجبوراً یہ سب قبول کرنا پڑتا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں اکثر یوں ہوا کرتا تھا بلکہ آج بھی بہت سارے علاقوں میں ہے کہ گاؤں کے نمبردار کا گاؤں میں بڑا رعب دبدبہ ہوتا ہے۔ اور اکثر غریب لوگ نہ صرف ان کی غلامی کرتے ہیں بلکہ اپنے ذاتی فیصلے بھی نمبردار سے کراتے ہیں۔ نمبردار کے من پسند فیصلے ہوا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ماں باپ کے مشورے کے بغیر بلکہ ان کو خبر دیئے بغیر کئی غریبوں کی بچیوں کے رشتے اپنے چاہنے والوں سے طے کر دیتے ہیں جسے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی قبول کر لیتے تھے۔ ''عشق کی ہار'' میں آنند لہر نے بھی ایک ایسے ہی گاؤں کی کہانی پیش کی ہے۔ جہاں گاؤں کا نمبردار اپنی عزت، اپنی انا کے لیے ایک غریب کی بچی کی شادی ایک شخص سے اس کی مرضی کے خلاف کرا دیتا ہے۔

کہانی مختصر یہ ہے کہ تیرتھ نامی ایک لڑکا جو کہ فٹ بال کا کھلاڑی ہوتا ہے منیشا نامی لڑکی سے عشق کرتا ہے۔ تیرتھ اور منیشا دونوں کا تعلق غریب خاندان سے ہے۔ دونوں کا تعلق الگ الگ گاؤں سے ہوتا ہے۔ کچھ دیر ان کی محبت کا یہ سلسلہ چلتا ہے اس کے بعد دونوں گاؤں کے درمیان فٹ بال کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جس میں تیرتھ فٹ بال

کھلاڑی کے طور پر حصہ لیتا ہے اور منیشا شائقین کے طور پر۔میچ کے دوران منیشا تیرتھ کے اچھے کھیلنے پر اسے داد دیتی ہے۔ کیونکہ تیرتھ فٹ بال کا بہت بڑا کھلاڑی ہے۔منیشا کو داد دیتے ہوئے دیکھ کر اس کے گاؤں والے یہ بات برداشت نہیں کر سکتے کہ منیشا دوسرے گاؤں کے کسی لڑکے کے لیے تالیاں بجائے۔وہ گاؤں کے نمبردار کو شکایت کرتے ہیں نمبردار کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی ہے اور وہ منیشا اور اس کے باپ کو خوب ڈانٹتا ہے۔بات آگے بڑھتی ہے اور مقابلہ صرف کھیلنے والوں کے درمیان نہیں رہتا بلکہ دو گاؤں کے درمیان، نمبرداروں اور سرپنچوں کے درمیان ہو جاتا ہے۔جس کی تصویر کشی کرتے ہوئے افسانہ نگارہ یوں رقمطراز ہیں۔

> ''کیونکہ اب یہ مقابلہ صرف کھیلنے والوں کے درمیان نہ رہا تھا بلکہ نمبردار وں کا مقابلہ ہو گیا تھا۔سرپنچوں کا مقابلہ ہو گیا تھا۔مونچھیں رکھنے والوں کی مونچھوں کا مقابلہ ہو گیا تھا۔شاخوں سے گرنے والے پتے کہہ رہے تھے کہ یہ گاؤں جیتے یا دوسرا مگر فٹ بال کبھی نہیں جیتا۔لوگ کھیلنے والوں کی تعریف کرتے ہیں فٹ بال نے ہمیشہ ہارنا ہوتا ہے۔''۴۹

دونوں گاؤں کے درمیان کشمکش بڑھ جاتی ہے۔تب منیشا کے گاؤں کا نمبردار اپنی فٹ بال ٹیم کے ایک کھلاڑی کے نامدیو سے یہ شرط لگاتا ہے کہ اگر وہ میچ جیتا کر گاؤں کا نام روشن کرے گا، نمبردار کی پگڑی اونچی کرے گا تو اس کے بدلے اس کی شادی منیشا سے کرا دی جائے گی۔کھیل شروع ہوتا ہے منیشا کے گاؤں کی ٹیم جیت جاتی ہے۔لیکن اسی کے ساتھ ساتھ منیشا اور تیرتھ کی محبت ہار جاتی ہے۔منیشا کی شادی نمبردار کے فیصلے کے مطابق نامدیو سے کرا دی جاتی ہے اور یوں عشق ہار جاتا ہے۔افسانے میں جہاں دو روحوں کی آپسی محبت اور ناکامی کو پیش کیا گیا ہے وہیں ہمارے سماج میں بڑے بڑے لوگوں کے ہاتھوں غریبوں کے استحصال کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

## جنگ

جنگ تباہی و بربادی کا نام ہے۔جنگ نہ صرف انسان بلکہ ہر جاندار کے لئے موت کا پیغام لے کر آتی ہے۔دنیا کے مختلف ممالک کے درمیان وقتاً فوقتاً جنگیں ہوئی ہیں۔جن کے نہ صرف وقتی بلکہ دیرپا اثرات ثابت ہوئے۔جنگ کئی نسلوں کو مفلوج کر دیتی ہے۔قدرتی ذخائر کا خاتمہ کر دیتی ہے۔عصر حاضر میں انسان نے جنگ کے لیے ایسے ہتھیار تیار کر لیے ہیں جو جانداروں کی جان لینے کے ساتھ ساتھ زمین کو بھی ناکارہ کر دیتے ہیں۔ہتھیار بنا

کر اور جنگ کر کے انسان خود اپنے لئے موت کے اسباب تلاش کرتا ہے۔جنگوں سے ماحولیاتی کثافت ،قدرتی ذخائر کا خاتمہ اور جانداروں کا قتل عام ہوتا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ جنگ موت کا ننگا ناچ ہے۔اس سے انسانی نسلوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔مختلف ممالک جنگ کے اسباب پیدا کرنے میں ہمہ تن جٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے مختلف جنگوں اور ان کے نتائج کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور جنگ کے خلاف صدا بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔آنند لہر کے یہاں بھی بعض افسانے ایسے دیکھنے کو ملتے ہیں جن میں جنگ کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اس کے نتائج کو پیش کیا گیا ہے۔اس ضمن میں ان کے افسانے ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے''''سپیرے''اور''انوکھی دعا'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

افسانہ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' میں آنند لہر نے سیاسی مفاد کے لیے ملک کی تقسیم ،سرحدوں کا قیام جنگ اور اس کے نتائج کو پیش کیا ہے۔ملک کی تقسیم ہو یا جنگ متاثر عام لوگ ہی ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کوئی عوامی فیصلہ نہیں تھا اور نہ ہی اس میں عوام کی یا ملک کی کوئی بہتری تھی۔ بلکہ یہ ایک سیاسی فیصلہ تھا جس کی حصولیابی کے لیے ملک کی تباہی کے ساتھ ساتھ دوطرفہ عوام کی خواہشوں اور امنگوں کا قتل کیا گیا۔زیر نظر افسانہ بھی تقسیم ہند اور سرحدوں کے قیام کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ سرحدوں کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ہونے والی جنگوں کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔

روشن اور حمید اس کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ جو دو الگ ملکوں کے سپاہی ہیں۔دونوں سرحد پر تعینات کیے جاتے ہیں ۔ جہاں ایک دوسرے کے ساتھ ان کی پہچان ہوتی ہے اور مسئلہ دوستی تک پہنچ جاتا ہے۔دونوں، کمانڈروں سے چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔روشن اور حمید اپنا فرض نبھانا چاہتے ہیں لیکن جنگ نہیں چاہتے ،قتل وغارت نہیں چاہتے۔حمید بانو نامی ایک لڑکی سے پیار کرتا ہے جبکہ روشن سریشٹا کو چاہتا ہے۔ دراصل حمید اور روشن ایک دوسرے سے جنگ کے متعلق باتیں کرتے ہیں کہ جنگ کے اثرات برے ہوتے ہیں اس لئے جنگ نہیں ہونی چاہیے۔ان دونوں کی معشوقائیں بھی ان سے جنگ کے اثرات کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں اور انھیں جنگ کرنے اور دوسرے ملک کے فوجیوں کے قتل وغارت کرنے سے منع کرتی ہیں۔ دونوں حمید اور روشن کو جنگ سے منع کر کے اپنی اپنی ڈیوٹی پر روانہ کرتی ہیں۔جس کی منظرکشی آنند لہر نے یوں کی ہے۔

''بانو بہت خوبصورت ہے۔ میں اسے چاہتا ہوں وہ اب بھی میرا انتظار

کر رہی ہے۔ وہ اکثر کہتی ہے کہ جنگ بری چیز ہے جس میں لوگوں کے
گھر اجڑتے ہیں۔ سہاگ اجڑتے ہیں۔ بچے یتیم ہو جاتے ہیں۔'' اس
پر نریش نے کہا، ''سریشٹا بھی یہی کہتی ہے اور یہاں تک کہتی ہے کہ
جنگ بیماری لاتی ہے۔ غریبی لاتی ہے۔'' ۵۰؎

دراصل لہر نے دونوں ملکوں کے سپاہیوں کا انتخاب کر کے جہاں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عام سپاہی خواہ وہ کسی بھی ملک کا ہو جنگ وجدال نہیں چاہتا۔ وہ قتل وخون نہیں چاہتا کیونکہ اسے بھی جان عزیز ہوتی ہے۔ اور بانو اور سریشٹا کے کردار عام لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ جہاں سرحد کے ایک طرف بانو حمید کو منع کرتی ہے کہ جنگ نہ کرنا دوسرے ملک کے فوجیوں کو قتل نہ کرنا اس سے ان کے بچے یتیم ہو جائیں گے، عورتیں بیوہ ہو جائیں گیں۔ وہیں سرحد کی دوسری طرف سریشٹا بھی روشن سے یہی کہتی ہے۔ افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''حمید نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ بانو نے اپنے خط میں لکھا
ہے۔ ''تم پار والے ہر جوان کو روشن سمجھنا اور یاد رکھنا کہ ایک گولی جو کسی
سینے پر لگتی ہے بے شمار رشتوں کو تحس نحس کرتی اور دکھ و درد کسی سرحد کو نہیں
مانتے اور یہ بھی نہیں ہوتا ہے کہ سرحد کے اس پار مرنے والے سپاہی کی
عورت بیوہ ہوگی اور سرحد کے اس پار مرنے والے سپاہی کی عورت بیوہ
نہیں ہوگی۔'' ۵۱؎

حمید اور روشن کی دوستی دو ملکوں کے سپاہیوں کی ایک دوسرے کے تئیں خیالات کو ظاہر کرتی ہے۔ جس سے آنند لہر نے یہ بتانے کی سعی کی ہے کہ دونوں ملکوں کے سپاہی ایک دوسرے کا خون کرنا نہیں چاہتے بلکہ حکم کے مطابق مجبوراً انہیں ایسا کرنا پڑتا ہے۔ حمید اور روشن کی دوستی کا راز جب اعلیٰ حکام کے سامنے آشکار ہوتا ہے تو انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔ یہ الزام لگا کر کہ یہ دونوں جاسوس ہیں۔ انہیں اپنے اپنے ملک کے ہی افسر قتل کر دیتے ہیں۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ سرحدوں کو قائم رکھنا، دو ملکوں کے درمیان کشیدگی برقرار رکھنا یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ جسے دونوں ملکوں کے سیاسی لیڈروں نے قائم کیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ہمیشہ قائم رہیں۔ عوام اس کے حق میں نہیں ہے۔ اور اگر کوئی عام انسان یا کوئی سپاہی دوستی بڑھانا چاہے تو اسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ جس سے یہ بات صاف ظاہر

ہوتی ہے کہ یہ سب سیاسی مفاد کے لئے ہے اور انہوں نے اپنے اس مفاد کے لیے ان سب جرائم کو برقرار رکھنا ہے۔جس کے لیے عوام کی قربانیاں لگتی ہیں۔لیکن ان لوگوں پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

افسانہ ’’انوکھی دعا‘‘ میں جنگ کے اسباب وعلل اور اس کے نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔افسانہ نگار نے بیانیہ انداز میں ایک سپاہی کی زندگی کو پیش کرتے ہوئے جنگ کے متعلق عام لوگوں کے تاثرات، نیز جنگ سے ہونے والی تباہی و بربادی کا بیانیہ پیش کیا ہے۔دراصل انسان، جنگ انسان کی تباہی کے لیے کرتا ہے لیکن اس کے اثرات صرف انسان تک محدود نہیں رہتے بلکہ روح زمین پر ہر چیز اس سے متاثر ہوتی ہے۔زمین بنجر ہو جاتی ہے، ہوا آلودہ ہو جاتی ہے، پانی گندا ہو جاتا ہے، جانور اور چرند پرند بھی مفلوج ہو جاتے ہیں۔جس کا ذکر کرتے ہوئے افسانہ نگار افسانے میں یوں لکھتے ہیں۔

> ’’زمین کے گڈھے ظاہر کر رہے تھے کہ دلوں پر کتنے زخم ہیں۔کہیں پر جانوروں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ہوا کافی گرم تھی۔کچھ لوگ کہتے تھے کہ موسم گرم ہے اس لئے ہوا گرم ہے مگر دوسروں کا کہنا تھا کہ ہوا کا مزاج گرم ہو گیا ہے کیونکہ اسے انسانوں کے مرنے کا غم ہے۔ایک سوال ہوا ضرور پوچھتی تھی کہ جانور جو جنگ میں شامل نہ تھے پھر ان کا قتل کیوں ہوا۔‘‘ ۵۲

آنند لہر نے منجیت سنگھ نامی ایک فوجی کی کہانی بیان کی ہے جو اپنی ڈیوٹی دیتے ہوئے گرفتار ہو جاتا ہے۔ گرفتاری کے بعد اسے طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں، اس پر ظلم کیا جاتا ہے۔ بعد میں اس کے ملک کے فوجی حملہ کر کے اسے چھڑانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔اس کے بعد منجیت سنگھ اپنے گاؤں واپس جاتا ہے۔گاؤں کے تمام لوگ خوشی مناتے ہیں۔سبھی لوگ اس کی بہتری کی دعا کرتے ہیں۔لیکن اچانک کچھ عرصہ بعد منجیت سنگھ کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔اسے جو اذیتیں دی گئیں تھیں ان کی وجہ سے وہ ایک لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جس کے پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور ڈاکٹر اسے الگ رکھنے کے لئے مشورہ دیتے ہیں۔اس کے بعد تمام لوگ اس سے نفرت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی بیوی اور بچے بھی اس سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔جس کا ذکر افسانہ نگار نے یوں کیا ہے۔

''منجیت سنگھ اور بیمار ہو گیا یا پھر اس کی چارپائی ایک درخت کے نیچے لگا دی گئی۔کوئی بھی شخص اس کے پاس جانے کو تیار نہ ہے اور اس کے جسم سے نکلنے والی بدبو چند طرف پھیل رہی ہے۔اب لوگوں کو خطرہ ہو گیا ہے کہ یہ سارا گاؤں ہی بیمار ہو جائے گا۔ایک نے کہا۔'' کیوں نہ منجیت سنگھ کو مار دیا جائے۔'' دوسرے نے کہا'' کیوں نہ اس کو قتل کر دیا جائے'' تیسرے نے کہا'' ہم نے پہلے ہی غلط دعا کی تھی جس کی وجہ سے یہ بچ گیا اور اب سارے گاؤں کو خطرہ ہے۔''۵۳

منجیت سنگھ کو گھر سے نکال دیا جاتا ہے یہاں تک کہ لوگ اس کے قتل کرنے کا مشورہ کرتے ہیں اور وہ تمام لوگ جو اس کی زندگی کے لئے دعا کرتے تھے آخر کار اس کی موت کے لیے دعا کرتے ہیں اور اسی دعا کو افسانہ نگار نے انوکھی دعا کہا ہے۔کیونکہ لوگ جس کی لمبی عمر کے لئے دعا کرتے تھے۔وقت بدلنے پر اسی کی موت کے لئے دعا کرنے لگے۔

دراصل اس افسانے میں آنند لہر نے زہر آلود ہتھیاروں اور بارود کی طرف اشارہ کیا ہے جو نہ صرف وقتی طور پر تباہی و بربادی کا ذریعہ بنتے ہیں اور لوگوں کے قتل کا ذریعہ بنتے ہیں۔بلکہ ان کے دیرپا اثرات ثابت ہوتے ہیں۔ان کے زہریلے دھوئیں سے کئی نسلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔یہ اس قدر زہریلا ہوتا ہے کہ انسان کی آنے والی کئی پشتوں کو مفلوج کر دیتا ہے۔ماحول میں ایسی کثافت پیدا کرتا ہے جن سے آنے والی کئی نسلیں متاثر ہوتی ہیں۔ایسی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جن کے پھیلنے اور پشت در پشت منتقل ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔

افسانہ''ہتھیار'' میں آنند لہر نے ہتھیاروں سے ہونے والی تباہی کو پیش کرتے ہوئے ملک کے سیاسی نظام اور ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو ہتھیار بناتے ہیں۔آنند لہر ایک صاف ذہن اور امن پسند شخصیت کے مالک تھے۔وہ جیو اور جینے دو کے قائل تھے۔ہتھیار ایک ایسی چیز ہے جس کا نتیجہ تباہی و بربادی اور قتل و غارت ہے۔جو کسی مذہب کو نہیں دیکھتا،سرحد کو نہیں دیکھتا۔دراصل لہر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر موت ایک قدرتی عمل ہے اور یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے تو پھر انسان موت کے وسائل کیوں تلاش کر رہا ہے۔اللہ نے اگر انسان کو زندگی دی ہے اور آرام و آسائش کے لئے سامان فراہم کیا ہے تو پھر انسان زندگی جینے،اس کو خوبصورت بنانے اور

قدرتی وسائل سے لطف وانبساط حاصل کرنے کے بجائے ان کی تباہی کے ذرائع کیوں تلاش کر رہا ہے۔

ہتھیار اور جنگ قدرتی وسائل تباہ کرتے ہیں۔نفرت وظلم سکھاتے ہیں۔اس لیے ہمیں ہتھیاروں کے بجائے پھول کھلانے چاہئے۔تاکہ آنے والی نسلیں ان سے فیضیاب ہوسکیں اور تباہی و بربادی سے بچ سکیں۔لہر کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کو تباہی و بربادی کے ذرائع تلاش کرنے کے بجائے ایسے کام کرنے چاہئے جو آنے والی نسلوں کے لیے آرام وآسائش اور محبت واخوت کا سبب بنیں بلکہ ہتھیاروں کی طرح جنگ وجدال، تباہی و بربادی اور نفرت کا باعث نہ بنیں۔

## عدالتی نظام

عدالتی نظام کا مقصد انصاف کو برقرار رکھنا ہے۔ہر ملک کا اپنا قانون ہوتا ہے اور قانون کی حفاظت کرنے کے لئے عدالتی نظام کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے۔نیز ملک میں ہونے والی ناانصافیوں اور جرائم کو روکنے کے لیے عدلیہ نظام کام کرتا ہے۔عدالت کا کام عوام کو انصاف دلانا ہے اوران کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے۔عصر حاضر میں بعض وجوہات کی بنا پر عدالتوں میں بھی حق اور سچ کو دبایا جارہا ہے۔خواہ وہ رشوت خوری کی وجہ سے ہو، سیاسی جماعتوں کی وجہ سے ہو، یا عدالتوں میں تعینات ملازمین کی وجہ سے۔عصر حاضر میں رشوت ہمارے ملک میں اس قدر عروج پکڑ چکی ہے کہ زندگی کے لگ بھگ ہر شعبے کو اس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ایسے میں ہمارا عدالتی نظام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔اس کے علاوہ سیاسی جماعتوں کے عمل دخل کی وجہ سے بھی عدالتوں میں حق وانصاف کو کچلا جارہا ہے۔اس میں شک نہیں کہ ابھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو رشوت اور سفارشوں سے بالاتر ہوکر حق وانصاف کی پیروی کررہے ہیں تاہم بہت سارے معاملات آئے روز اس طرح کے پیش آرہے ہیں جن میں عدلیہ نظام کو شک و شبہات کی نگاہوں سے دیکھا جارہا ہے۔کئی بے گناہوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلا جارہا ہے جبکہ کئی مجرم سر بازار گھوم رہے ہیں۔بہت سارے قلم کاروں نے ان موضوعات کو اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔آنند لہر چونکہ پیشے سے وکیل تھے انہوں نے عدالتوں میں زندگی کا بیشتر حصہ گزارا تھا۔مختلف النوع مقدمات کی پیروی کی۔عدالتوں میں ہونے والے معاملات کو انہوں نے قریب سے دیکھا تھا۔کسی بھی محکمے کے مسائل اور معاملات کو اس کے اپنے ملازم سے زیادہ کون پرکھ سکتا ہے۔آنند لہر لگ بھگ چالیس سال تک عدالت سے منسلک رہے۔عدالتوں میں ہونے والی ناانصافیوں پر انھوں نے بھی قلم اٹھایا۔یہ ان کی بے باک شخصیت کا خاصہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہم پیشہ

لوگوں اور اپنے پیشے سے جڑے مسائل کو بے باک طریقے سے پیش کیا ہے۔ان کے افسانے’’انصاف‘‘’’جج صاحب‘‘’’رام سنگھ کی خودکشی‘‘اور’’نارودیوی کے بازو‘‘بہترین افسانے ہیں جن میں عدالتی نظام اور عدالتوں میں عوام کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو بے باک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

افسانوی مجموعہ’’بٹوارہ‘‘میں شامل افسانہ’’جج صاحب‘‘ایک مختصر لیکن دلچسپ افسانہ ہے۔کیلاش ناتھ جوشی جو کہ ایک جج ہے افسانے کا مرکزی کردار ہے۔اس کردار کے سہارے آنند لہر نے عدالتی نظام کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ رشوت ایک ایسی لعنت ہے جس نے زندگی کے تمام شعبوں کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔سچائی اور حق وانصاف کا گلا گھونٹ دیا ہے۔افسانہ’’جج صاحب‘‘میں آنند لہر نے رشوت خوری اور اس کے ساتھ ساتھ دیگر کئی وجوہات کا احاطہ کیا ہے۔جس کی وجہ سے عدالتوں میں جج سچائی کا گلا گھونٹ کر کئی بے گناہوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیتے ہیں۔جبکہ جرم کرنے والوں کو رشوت لے کر آزاد کر دیا جاتا ہے۔لہر نے یہ واضح کیا ہے کہ عدالتوں میں آجکل فیصلے لگ بھگ غلط ہی ہوتے ہیں اور کچھ فیصلے جو صحیح کئے جاتے ہیں ان کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی ججوں کی بے ایمانی کارفرما ہوتی ہے۔جیسا کہ وہ لکھتے ہیں کہ چند فیصلے عدالتوں میں صرف اس لئے ٹھیک کیے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کا یقین عدالتوں سے نہ اٹھ جائے۔اس کے علاوہ سفارشات کا سلسلہ بھی اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ نہ جانے کتنے فیصلے جج اپنے چاہنے والوں کو راضی کرنے کے لیے غلط کر دیتے ہیں۔جس کی تصویر کشی لہر نے یوں کی ہے۔

> ’’کیلاش ناتھ بھی کچھ مقدموں کا فیصلہ بالکل ٹھیک کیا کرتا ہے۔تاکہ لوگوں کو عدالتوں کے نظام پر یقین رہے اور کچھ فیصلے اپنی بیٹی کے کہنے پر کیا کرتا ہے،کچھ بیٹے کے کہنے پر اور کچھ فیصلے اپنی بیوی کے کہنے پر اور سال میں کبھی کبھی بہنوں کو بھی خوش کر دیا کرتا ہے۔مگر کچھ مقدموں میں بالکل اڑ جایا کرتا ہے گویا یہ پیغام دے رہا ہو کہ وہ انصاف کے معاملے میں کسی کی بھی نہ سنے گا۔‘‘ ۵۴

سفارشوں کی بنیاد پر حقوق تلفی کا سلسلہ لگ بھگ ہر محکمے میں عروج پر ہے۔اپنے چاہنے والوں اور رشتہ داروں کو خوش کرنے کے لئے آئے روز کئی حق داروں کے حقوق غسق ہو جاتے ہیں۔یہی سلسلہ عدالتوں کا بھی ہے۔

دراصل لہر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ عدالتوں میں جج اپنے چاہنے والوں کی معمولی خوشی کے لیے کئی لوگوں کی زندگیاں تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جبکہ کئی فیصلے کسی سے عداوت رکھنے کی بنا پر انتقام لینے کے لیے صادر کیے جاتے ہیں۔ بعض جج اپنے رشتہ داروں کے خلاف فیصلے عداوت کی وجہ سے انتقام لینے کے لیے کرتے ہیں۔ جبکہ لوگ اس کو جج کی ایمانداری اور انصاف پسندی سمجھ لیتے ہیں۔ افسانے سے اس ضمن میں یہ اقتباس دیکھیں۔

> ''پچھلے برس اس نے ایک دور پار کے رشتے دار کے خلاف فیصلہ کر کے اپنی ایمانداری کو اور مضبوط کر دیا تھا۔ حالانکہ سچائی یہ تھی کہ اس رشتے دار کے ساتھ اس کے تعلقات بہتر نہ تھے۔ کیلاش ناتھ نے اپنی ایمانداری ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ اس رشتہ دار سے بدلہ بھی لے لیا تھا۔'' ۵۵

مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدالتوں میں کس کس طرح لوگوں کے ساتھ ناانصافیاں ہوتی ہیں۔ جو فیصلے بظاہر صحیح لگتے ہیں ان کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی جرم کارفرما ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض دیگر نکات کو بھی سامنے لایا ہے۔ جو عدالتوں میں سچائی کو دبانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ایک جج ٹیچر کے رشتے دار کو چوری کے مقدمے میں اس لیے بری کر دیتا ہے تاکہ ٹیچر اس کی بچی کو اچھے نمبر دے اور وہ جماعت میں اول آجائے۔ اس کی تصویر کشی افسانہ نگار نے یوں ہی ہے۔

> ''وکیلوں کی کتابیں دھری کی دھری رہ گئیں اور دلیلیں بھی وہیں کی وہیں رہ گئیں اور وہ چور بری ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ سامان بھی اسے مل گیا، حالانکہ جج صاحب کی لڑکی یہ نہ چاہتی تھی کہ سامان ملے۔ مگر جب ایک سو میں سے ایک سو ایک نمبر ہو سکتے ہیں تو چور کے بری ہونے کے ساتھ سامان بھی مل سکتا ہے۔'' ۵۶

غرض افسانہ ''جج صاحب'' عدالتوں میں ہونے والی ناانصافی، بے ایمانی اور رشوت خوری کی عمدہ عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ لہر نے یہ واضح کیا ہے کہ جج انصاف کا نام ہے اور کسی جج سے انصاف تب تک ممکن نہیں جب تک وہ اپنے آپ کو رشوت سے دور نہ رکھے اور اس کے ضمیر میں انصاف اور ایمانداری موجود نہ ہو۔ عصر حاضر میں مختلف عناصر کی وجہ سے عدالتوں میں ہو رہی کاروائی کی فنکارانہ انداز میں عکاسی کی ہے۔

افسانہ’’ دوسری بے انصافی‘‘ میں بھی عدالتوں میں ہونے والی ناانصافیوں کو بیان کیا گیا ہے۔اس میں آنندلہر نے یہ بتایا ہے کہ جن لوگوں پر ظلم ہوتا ہے ان کو انصاف ملنے کے بجائے ان کے ساتھ دوہری ناانصافیاں ہوتی ہیں۔کئی بے گناہ قتل ہوجاتے ہیں۔عدالتوں میں ان کا مقدمہ چلے یا مجرموں کو بری کردیا جائے لیکن ان کے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ان کی بیواؤں اور یتیموں کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔کئی قاتلوں کو رہا کردیا جاتا ہے اور پھر اگر انہیں سزا مل بھی جائے تو اس سے مقتول کے خاندان میں ہونے والی پریشانیوں کا حل نہیں کیا جاسکتا۔افسانہ’’ دوسری بے انصافی‘‘ میں آنندلہر نے اجیت سنگھ نامی ایک شخص کو مرکزی کردار بنایا ہے۔اجیت سنگھ ایک بہت بڑا دولتمند اور طاقت ور شخص تھا۔جس کا ہر طرف چرچا تھا۔ایک دن گاڑی تیز چلاتے ہوئے پرم جیت نامی ایک شخص کا قتل کردیتا ہے۔عدالت میں مقدمہ درج ہوتا ہے اور اجیت سنگھ اپنی طاقت اور دولت کے بل بوتے رہا ہوجاتا ہے۔اسے کوئی سزا نہیں ملتی۔جس کا ذکر کرتے ہوئے افسانہ نگار لکھتے ہیں۔

> ’’ایک لمحے میں اس نے ماردیا مگر لگتا تھا کہ اب سزا یگوں کو بھوگنی پڑے گی۔مگر فکر تھی کہ کہیں اس کو سزا نہ ہوجائے۔پولیس والوں کو اجیت سنگھ سے اپنی ہمدردی دکھانے کا موقع ملا۔پھر ایک دن وہی ہوا، وکیلوں کی بحث ہوئی، دلائل ہوئے اور اجیت سنگھ بری ہوگیا۔‘‘ ۵۷

عدالت قاتل اجیت سنگھ کو بری کردیتی ہے لیکن اجیت سنگھ کے دل کو سکون نہیں آتا کیونکہ وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا ہے۔اسے لگتا ہے کہ اس نے کسی کا قتل کیا ہے اور جھوٹی گواہی اور دلائل سے وہ رہا تو ہوگیا لیکن جرم سے پاک نہیں ہوا۔اس کے بعد اجیت سنگھ پرم جیت کے خاندان سے اپنی ہمدردی ظاہر کرتا ہے اور ماہوار ان کو خرچے کے لیے رقم واگزار کرتا ہے۔وہ ان کی دیکھ بھال کرتا ہے، ان کے اخراجات کی ذمہ داری سنبھالتا ہے۔لیکن پندرہ سال بعد اچانک عدالت اس کے خلاف اس مقدمے کی کاروائی شروع کرتی ہے جس میں اسے سزا ہوجاتی ہے۔جس سے پرم جیت کے کنبے کو ایک بار پھر جھٹکا لگتا ہے۔کیونکہ اب اجیت سنگھ ان کے لیے قاتل نہیں بلکہ آمدنی کا ذریعہ تھا۔ایک بار پھر پرم جیت کے گھر کا نقشہ بدلتا ہے۔اس کے خاندان کے ساتھ دوبارہ ناانصافی ہوتی ہے۔جس کی منظرکشی افسانے میں یوں کی گئی ہے۔

> ’’پرم جیت سنگھ کی بیوی نے کہا جب اجیت سنگھ بری ہوا تھا اس وقت

ہمارے ساتھ پہلی بے انصافی ہوئی تھی۔ آج اسے سزا ہوئی تو یہ ہمارے

ساتھ دوسری بے انصافی ہے۔'' ۵۸؎

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو افسانہ نگار یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عدالتوں میں سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ قرار دیا جاتا ہے۔ جس سے لوگوں کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے۔ اجیت سنگھ نے قتل کیا اس وقت اسے سزا ملنی چاہئے تھی لیکن اسے رہا کر دیا گیا جبکہ بعد میں وہ مجبور اور بے بس کنبے کا سہارا بنا تو اسے سزا سنا دی گئی۔ جس سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ جب وہ مجرم تھا تو اسے رہا کر دیا گیا اور جب اس نے لوگوں کی فلاح و بہبودی کا کام شروع کیا تو اسے سزا سنا دی گئی۔ اس طرح عدالت کی طرف سے بار بار ناانصافی ہوتی ہے۔

## سیاسی نظام

ہمارا ملک اس وقت سیاسی بحران کا شکار ہے۔ سیاسی لیڈروں نے ہمیشہ عوام کا غلط استعمال کیا ہے۔ اپنے اقتدار کے لیے عوام کا استعمال کیا ہے۔ سیاسی مفاد کے لئے کئی دھنگے اور فساد کرائے جاتے ہیں۔ جن میں بے گناہ شہریوں کا قتل وخون ہوتا ہے۔ کئی مسائل کو مذہبی رنگ دے کر لوگوں کے درمیان پھوٹ ڈالی جاتی ہے، نفرت پھیلائی جاتی ہے۔ کئی غریبوں کا قتل کروا کے سیاست کا رخ بدلا جاتا ہے۔ لوگوں کو مذہب وملت اور فرقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ معصوم عورتوں کی عصمت دری ہوتی ہے۔ سیاسی بدحالی اور لوٹ کھسوٹ کو جن تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے ان میں آنند لہر کا نام بھی شامل ہے۔ آنند لہر نے ''دوسری سوچ''، ''ووٹ بنک'' اور ''موقع'' جیسے افسانوں میں ہمارے ملک کے سیاسی نظام کی عکاسی کی ہے۔

''دوسری سوچ'' آنند لہر کا ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ جس میں لہر نے ملک کے سیاسی نظم کو پیش کرتے ہوئے عوامی استحصال کی عمدہ عکاسی کی ہے۔ راجہ اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔ جس کے ارد گرد کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ راجہ کی غربت اور سیاسی مفاد کی خاطر اس کا قتل سیاسی نظام کی عمدہ نقاب کشائی کرتا ہے۔ سیاسی مفاد کے لیے ملک میں دھنگے فسادات کرانا، غریبوں کا خون خرابہ اور نفرت وتفریق کا بیج بونا کوئی نیا کام نہیں۔

افسانہ ''دوسری سوچ'' بھی اسی موضوع پر محیط ہے۔ جس میں آنند لہر نے بیانیہ انداز میں راجہ نامی ایک مزدور کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ راجہ مزدوری کر کے اپنے گھر کا خرچہ چلاتا ہے۔ ایک دن وہ بازار جا رہا تھا کہ ایک جلوس میں اس کو گولی لگ جاتی ہے اور وہ مر جاتا ہے۔ بڑے بڑے لیڈر اپنے بیانات دینے کے لیے جلوس نکالتے ہیں۔

سیاست کا رخ بدلنے کے لیے جلوس نکالے جاتے ہیں لیکن غریب لوگوں پر اس کے کیا اثرات پڑھتے ہیں اس کی انہیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے آنند لہر افسانے میں یوں لکھتے ہیں۔

''جلوس کی خبر تب تک نہیں آتی جب تک اس پر گولی نہ چلے، لاٹھی نہ چلے۔ جلوس لوگوں کو خبر دیتا ہے۔ لیڈروں کو بیان دینے کا موقع دیتا ہے۔ جلوس کی وجہ سے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ لڑکپن سے جوانی کی طرف بڑھتی ہوئی لڑکیوں کے جسموں کو چھیڑا جاتا ہے۔ لوگوں کو جلوس میں شامل کر کے ان کے گھروں میں چوریاں کروائی جاتی ہیں۔'' ۵۹

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لیڈر لوگ جلوس کیوں نکلواتے ہیں۔ غریبوں کا قتل کروا کے ان کے حق میں بیان دیتے ہیں۔ اپنے مفاد کے لیے لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔ پہلے ان کا قتل کرواتے ہیں اور پھر ان کے حق میں بیان دے کر ووٹ بٹورتے ہیں۔ غریبوں کی موت الیکشن کا مدعا ضرور بنتی ہے لیکن اس سے ان کا خاندان اجڑ جاتا ہے، بچے یتیم ہو جاتے ہیں، بیویاں بیوہ ہو جاتی ہیں، آمدنی کا سلسلہ رک جاتا ہے۔ جس سے نہ جانے کتنی عورتیں اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہیں لیکن لیڈروں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد کرسی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جلوس میں راجہ کی موت ہونے کے بعد سیاسی صورتحال کیا رہتی ہے اور اس کے پریوار پر کیا گزرتی ہے اس کا تذکرہ آنند لہر نے یوں کیا ہے۔

''ایک معمولی سا واقعہ رونما ہوا کہ راجہ مر گیا۔ بھاگنے والوں کو موقع مل گیا۔ خبر ڈھونڈنے والوں کو خبر مل گئی۔ لیڈروں نے خوب مذمت کی۔ پولیس والوں نے ضروری بتایا اور جلوس روکنے کے لیے کچھ لوگوں کی پرموشن کی سفارش بھی کی گئی۔ اگلے الیکشن میں اس کی موت بھی چناؤ کا مدعا بنی۔ مگر اس کی بیوی بیوہ ہوگئی، بچے یتیم ہو گئے، ماں باپ بے سہارا ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے لوگوں کے گھروں میں کام کرنا شروع کیا۔ گھروں سے بچا ہوا کھانا اور سبزیاں بچوں کو کھلاتی تھی۔'' ۶۰

راجہ کی موت چناؤ کا مدعا بنتی ہے۔ لیڈروں کو اپنے مقصد کے لیے ایک موضوع مل جاتا ہے۔ وہ اپنی

تقریروں میں راجہ کا ذکر کرتے ہیں ۔ان سے ہمدردی جتاتے ہیں لیکن اس کے پریوار کا کوئی پرسان حال نہیں رہتا۔اس کی موت کے بعد اس کی بیوی در بدر کی ٹھوکریں کھاتی ہے۔اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہے۔بالآخر بے بسی کے عالم میں جب اسے کوئی امید نظر نہیں آتی تو اپنے بھائی کے گھر جاتی ہے۔وہاں بھی اسے ایک کام پر لگا دیا جاتا ہے۔غرض کہ وہ ہر طرح سے اپنی عزت کھو جاتی ہے اور پھر اسے پتہ چلتا کہ وہ جس امید سے بھائی کے گھر آئی تھی وہ نہیں بلکہ ان کی سوچ دوسری ہے۔

افسانے میں آنند لہر نے یہ واضح کیا ہے کہ سیاست کا رخ بدلنے کے لیے کروائے جانے والے دھنگے فساد کئی لوگوں کے گھر اجاڑ دیتے ہیں۔یہ بظاہر ایک جلوس نظر آتا ہے لیکن اس کے پیچھے کئی معصوموں کی جانیں سسک رہی ہوتی ہیں۔

افسانہ ''ووٹ بنک'' بھی ہمارے سیاسی نظام پر ایک بھرپور طنز ہے۔جس میں آنند لہر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ لیڈروں کا مقصد ووٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔انہیں عوام کی فلاح و بہبودی یا ان پر ہو رہے ظلم وعتاب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ووٹ حاصل کرنے والے لوگوں کا احساس اور ضمیر ووٹ ہوتا ہے۔وہ ہر چیز، ہر مسئلے کو ووٹ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔کسی کا قتل ہو یا کسی معصوم بچی کا بلاتکار ہو وہ اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ووٹ بٹورنے کی کوشش کرتے ہیں نہ کہ ان کو حق دلانے کی۔ہماری سیاست اس قدر گر چکی ہے کہ ہر کوئی اپنے اقتدار کے لیے مظلوموں پر ظلم کرنے اور اپنے ضمیر کا سودا کرنے پر تلا ہوا ہے۔

چناؤ کے قریب عوام کو خوش کرنے اور انہیں بے وقوف بنانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کئے جاتے ہیں۔یہاں تک کہ سیاسی لیڈر انہیں لوگوں کا قتل کروا کے پھر انہیں کے حق میں بیان دے کر ان سے ووٹ وصول لیتے ہیں۔لوگوں کو دھرم اور ذات کی بنیاد پر تقسیم کرتے ہیں۔رشوت خوری عروج پر ہے۔لیڈر لوگ رشوت کھاتے ہیں لیکن ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوتی۔اگر ایک لیڈر چوری کرتا ہے تو اس کی جماعت کے پچاسوں اس کے دفاع کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔غرض ہر جگہ عام انسان ہی متاثر ہوتا ہے،ظلم کا شکار ہوتا ہے۔افسانہ ووٹ بنک میں ایک لڑکی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کا پانچ لوگ مل کر بلاتکار کرتے ہیں۔اس کو کسی بھی صورت انصاف نہیں ملتا۔لیکن سیاسی لیڈروں کو سیاست کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔اپوزیشن والے اس کا ذمہ دار حکومت وقت کو ٹھہراتے ہوئے ان کے خلاف مظاہرہ کرتے ہیں۔جبکہ حکومت اس کو اپوزیشن کی سازش قرار دیتی

ہے۔جس پر مختلف پارٹیوں کو بیان بازی کا موقع مل جاتا ہے۔ ہر سیاسی جماعت اپنے اپنے حساب سے اس واقعے کو استعمال کرتے ہوئے اپنا ووٹ بنک بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔جس کی منظر کشی کرتے ہوئے آنند لہر یوں رقمطراز ہیں۔

> ''یہ اپوزیشن کی سازش ہے''ایک پارٹی کے لیڈر نے کہا،حضور اس لڑکی کے گھر چلتے ہیں۔ یہ ووٹ بنانے کا بہترین موقع ہے۔اس سے ووٹ ملیں گے اور پورے علاقے میں ہماری عزت بڑھے گی۔اس کی صلاح مانتے ہوئے اور اسے شاباش دیتے ہوئے وہ بڑی لیڈر وہاں گئی۔ریڈیو میں خوب خبریں آئیں،جلوس نکلے مگر جس کا بلاتکار ہوا تھا اس لڑکی کو اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔''[۶۱]

لڑکی کے بلاتکار کے خوب چرچے ہوئے لیکن اس کو انصاف نہیں ملا۔ایک پارٹی اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس موضوع پر خوب بیان بازی کرتی ہے اور لڑکی والوں سے ہمدردی جتا کر ان کا دل جیت کر اپنے ووٹ مکمل کر لیتی ہے۔اور جب دوسری پارٹی کو یہ خبر ملتی ہے تو وہ الگ حربہ استعمال کرتے ہوئے یہ مشورہ کرتے ہیں کہ ہمیں ملزموں سے ہمدردی جتا کر ان سے حمایت حاصل کرنی چاہئے کیونکہ وہ تعداد میں زیادہ ہیں۔جبکہ دوسری طرف وہ اکیلی لڑکی ہے جس کا بلاتکار ہوا تھا۔کیونکہ اس کی ماں بلاتکار کی خبر سن کر خودکشی کر جاتی ہے اور باپ پہلے ہی مر چکا ہوا ہوتا ہے۔اور بالآخر وہ یہی طے کرتے ہیں کہ مظلوم کی نسبت ملزموں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے ہمیں ان کی حمایت کرنی چاہئے۔کیونکہ اس سے ہمارا ووٹ بنک بڑے گا۔

اسی موضوع پر ان کا ایک اور افسانہ ''موقع'' بھی قابل ذکر ہے۔جس میں انہوں نے چناؤ کے دوران سیاسی لیڈروں کی جانب سے عوام کے ساتھ کیے جانے والے جھوٹے وعدوں کو بیان کیا ہے۔ نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس دوران ہر ایک سیاسی جماعت جھوٹے منشور تیار کرتی ہے اور عوام کو بیوقوف بناتی ہے۔لوگ اپنی سادگی کی وجہ سے ان کے بہکاوے میں آجاتے ہیں۔کوئی بھی سیاسی جماعت ہو اپنے مفاد کے لیے سب کچھ کرتی ہے۔ ہر پارٹی کا منشور اس کے ذاتی مفاد کے لئے اور عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے بنایا جاتا ہے۔جس پر کامیاب ہونے کے بعد کوئی عمل پیرا نہیں ہوتا۔

## دنیا کی بے ثباتی

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا میں آنے والی ہر جاندار چیز کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ دنیا کی زندگی عارضی ہے۔ اس لیے یہاں زیادہ دل لگانا عقلمندی نہیں ہے۔ بعض لوگ موت کو بھول کر اس قدر دنیاداری میں مگن ہو جاتے ہیں کہ انہیں اس کا دھیان ہی نہیں رہتا۔ انسان کی حقیقت فناہ ہو جانا ہے۔ آنند لہر نے دنیا کی بے ثباتی پر چند افسانے لکھے ہیں۔ ''انحراف'' ان کے تجریدی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں انہوں نے زندگی کی مختلف حقیقتوں کو اشارتی انداز میں پیش کیا ہے۔ انحراف کے بیشتر افسانے دنیا کی بے ثباتی پر محیط ہیں۔ ان کا ایک افسانہ ''پانی کی لکیر'' ہے۔ جس میں دنیا کی بے ثباتی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسانی زندگی دراصل پانی کی لکیروں کی طرح ہے۔ جس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی اور اس کا سدا قائم رہنا ممکن نہیں ہے۔ جس طرح پانی کی لکیروں کی کوئی حقیقت اور کوئی معیار نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کی زندگی بھی فناہ ہو جانے والی ہے۔ جس طرح ریت کے گھر کا مقدر بکھرنا اور پتھر کے گھروں کا ٹوٹنا ہے اسی طرح انسانی زندگی نے بھی ختم ہونا ہے۔ یہاں لہر نے یہ واضح کیا ہے کہ انسان کو ہر وقت آخری زندگی کی فکر میں رہنا چاہیے۔ جس کی منظرکشی وہ یوں کرتے ہیں۔

> ''ریت کے گھروں کا مقدر بکھرنا ہے اور پتھر کے گھروں کو ٹوٹنا ہے۔ اس لئے جہاں بھی ہو سامان باندھ کر تیار رہو۔ بکھرے پتے جوان درختوں کے جسم پر زخم ہیں اور ان کی وہ کہانیاں ہیں جو وہ دوسروں کو سناتے رہتے ہیں۔ جس زخموں کی مرہم تو نہ بنے مگر داغدار ہو گئے اور شبنم ٹہنی کے داغوں کو بھی دھو نہ سکے گی۔ کیونکہ اس کے دل میں تو خودروشنے کے زخم ہیں لیکن سلسلہ پھر بھی جاری رہنا چاہیے۔'' ۶۲

غرض آنند لہر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انسان جہاں بھی ہو جس حال میں ہو اس کا مقدر مٹ جانا ہے۔ اس لیے انسان کو ہر وقت دنیا کی لالچ و حرص سے پاک رہ کر اپنے اگلے سفر کی تیاری میں رہنا چاہیے۔

''دائرہ'' ایک مختصر سا افسانہ ہے۔ جس میں آنند لہر نے انسانی زندگی کی حقیقت کو پیش کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی زندگی ایک دائرے کی مانند ہے۔ جو جہاں سے شروع ہوتا ہے وہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے انسان کو فضول بحثوں سے نکل کر اپنی حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔

افسانہ ’’الجھن‘‘ میں افسانہ نگار نے انسانی حرص وطمع کو بیان کرتے ہوئے انسانی زندگی کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔انسان کی کوشش رہتی ہے کہ وہ دنیا کی تمام تر آسائشوں کو اپنے نام کرلے لیکن ایسا ہوتا نہیں۔لہر نے زندگی کو ماضی، حال اور مستقبل سے تعبیر کیا ہے۔اور یہ واضع کیا ہے کہ زندگی کا مستقبل بڑھاپا ہے اور ماضی بچپن۔جس کے لیے انسان کو پچھلی عمر میں افسوس ضرور ہوتا ہے لیکن وہ واپس نہیں لوٹتا۔

’’ریت کا چشمہ‘‘ افسانہ نہیں بلکہ افسانچہ ہے۔جس میں لہر نے یہ بیان کیا ہے کہ قدرت کے کارنامے انسان کے بس میں نہیں ہیں۔دنیا کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔افسانہ نگار نے قیامت کے روز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس دنیا میں جن لوگوں کو بے گناہ قتل کیا گیا ہے انہیں اس دن انصاف ملے گا اور جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں ان کا بھی حساب ہوگا۔جو معصوم لوگ اس دنیا میں چین کی زندگی نہیں گزار سکے انہیں حساب کے روز ضرور انصاف ملے گا۔

اس کے علاوہ بھی آنند لہر نے بہت سارے موضوعات کو اپنے افسانوں میں سمیٹا ہے۔جن میں مذہبی تفرقات، ذات پات، تہذیبی کشمکش، ماحولیاتی کثافت، بے جوڑ شادی اور لالچ وحرص وغیرہ شامل ہیں۔بٹوارے میں شامل ایک افسانہ ’’زمین کی ضرورت‘‘ ہے۔جس میں لہر نے بڑھتی ہوئی آبادی، ماحولیاتی کثافت اور جدید طرز زندگی کو پیش کیا ہے۔دراصل لوگ ماڈرن بننے کی خوشی میں اپنی اصل کو بھول گئے ہیں۔نئی دنیا بسانے کی خوشی میں وہ پرانی کو کھودیتے ہیں۔جدید تہذیب کی پیروی کرتے کرتے اخلاقی قدروں کو بھول گئے ہیں۔مقدس مقامات کو تباہ کر دیا گیا ہے اور زمین اس قدر آلودگی سے بھر گئی ہے کہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

افسانہ ’’اور پتھر رو پڑا‘‘ انسان کی بے حسی، نفرت اور عداوت کی عکاسی کرتا ہے۔اس افسانے میں آنند لہر نے عصر حاضر کے انسان کی بڑھتی ہوئی لالچ اور خواہشات کو پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہر انسان زندگی کی تگ ودو میں آگے بڑھنے کی کوشش میں لالچی اور خود غرض ہو گیا ہے۔جس کی وجہ سے انسانیت دم توڑ رہی ہے اور احساس مر گیا ہے۔لوگ اتنے لالچی ہو گئے ہیں کہ ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو گئے ہیں۔افسانہ ’’اور پتھر رو پڑا‘‘ سے اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ’’ہر کوئی ایک دوسرے سے آگے نکلنا چاہتا تھا۔بھیڑ کا حصہ بننے کے
> بعد وہ ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ کا حصہ بن گئے۔دوڑ جو نہ آگے دیکھتی

ہے اور نہ پیچھے جس کا مقصد صرف ایک دوسرے سے آگے نکلنا ہوتا ہے
اور اس آگے نکلنے کی کشمکش میں لوگ ایک دوسرے کے پیچھے ہو جاتے
ہیں اور انہیں ایک دوسرے کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا موقع مل جاتا
ہے۔ پھر وہ اتنا تیز دوڑنے لگے کہ ان کی رفتار پیچھے رہ گئی اور تہذیب
پاؤں کا ساتھ نہ دے سکی۔'' ۶۳؎

لوگوں کے اندر آہستہ آہستہ جنم لینے والی نفرت بڑھ گئی۔ مذہبی تفرقات نے مشترکہ تہذیب کا خاتمہ کر دیا ہے۔ جس سے دھنگے فساد شروع ہوئے اور رشتوں ناطوں کا قتل ہو گیا۔ ذات پات اور مذہب وملت کے سانپ نے لوگوں کو اس قدر ڈسا کہ احساس، ہمدردی اور پیار ومحبت کا خاتمہ ہو گیا۔ لوگ اس کا شکار ہو کر حق اور انصاف کو بھول گئے۔ جس سے ہر طرف قتل وغارت کا سلسلہ شروع ہوا۔ انسان اتنا سنگ دل ہو گیا کہ اسے دوسرے کا قتل بھی نظر نہیں آتا۔ جس کی منظر کشی کرتے ہوئے افسانہ نگار یوں لکھتے ہیں۔

''اور پتھر رو پڑا۔ پھر کہنے لگا میں پتھر ہوں نا اس لیے روتا ہوں۔ مجھ میں
درد ہے۔ اور تم نسان ہونا اس لئے محسوس نہیں کر سکتے۔ قتل ہوتے
ہوئے دیکھتے ہو، بہتے ہوئے خون میں تمہارے پاؤں لت پت
ہیں۔'' ۶۴؎

مندرجہ بالا اقتباس سے انسان کی بے حسی ،نفرت اور سنگ دلی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ انسان اتنا بے رحم ہو گیا ہے کہ پتھر بھی اس کی بے حسی پر روتے ہیں۔ اسی طرح ان کا ایک اور افسانہ ''چڑیوں کی بارات'' بھی بڑا دلچسپ ہے۔ جس میں طنزیہ انداز میں پرندوں اور جانوروں کے ذریعے انسان کی نفرت، دشمنی اور بے حسی کو بیان کیا گیا ہے۔ دراصل انسان ذات پات اور مذہب وملت میں اتنا بکھر چکا ہے کہ ہر طرف نفرت ہی نفرت نظر آتی ہے۔ ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کی قدر انسان کے پاس نہیں رہی۔ لہر نے طنزیہ انداز میں چڑیوں کی بارات کو چرند پرند کے اتحاد کے لئے پیش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ انسانوں میں اتحاد اور محبت نہیں رہی۔ انسان مذہب، ذات، رنگ، زبان اور علاقے کی بنیاد پر بٹ گئے ہیں۔ جس کی بنا پر دشمنی بڑھ گئی ہے اور انسان کی دشمنی اور فسادات کی وجہ سے پرندے اور جانور بھی متاثر ہوئے ہیں۔ وہ انسان کے شر سے محفوظ نہیں رہے۔ اسی لئے افسانہ

نگار نے انسان کی بے حسی اور ظلم و اتحاد کو پیش کرتے ہوئے جانوروں اور پرندوں کے لیے ایک الگ ملک کی تمنا ظاہر کی ہے تاکہ وہ سکون سے محفوظ زندگی گزار سکیں۔ جس کو لہر نے پرندوں کی بارات میں یوں پیش کیا ہے۔

''اسی طریقے سے سب کوؤں پرندوں کی باتیں سن کر نیچے جانوروں نے اعلان کیا کہ اگر انسان الگ زبان مذہب کے نام پر الگ ملک و الگ صوبہ قائم کرسکتا ہے تو ہم بھی یہ مانگ کریں گے کہ جانوروں کو بھی ایک الگ صوبہ ہونا چاہئے۔ جہاں وہ اپنے قائدے کے مطابق جی سکیں۔ جس کے آسمان کے اوپر چڑیاں اور دوسرے پرندے بلاخوف اڑ سکیں اور نیچے جانور زمین کو زمین سمجھ کر رہ سکیں اور کوئی جنگ نہ ہو، کوئی سرحد نہ ہو۔''۶۵

افسانہ ''ان کے بچے'' میں مصنف نے مذہبی تصادم کو موضوع بنایا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور دلوں میں دشمنی پالنا شروع کر دیتے ہیں۔ زیر بحث افسانے میں افسانہ نگار نے روشن لعل اور سلیم خان کے مابین تصادم اور کشمکش کو پیش کیا ہے جو الگ مذہبوں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ روشن لعل اور سلیم خان کو ایک دوسرے سے بے حد نفرت ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کو چڑانے کے لیے نفرت کرتے ہیں اور زندگی کے ہر کام میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے مذہب سے نفرت کرتے ہیں اور ستائش دینے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ جس کی تصویر کشی افسانے میں یوں کی گئی ہے۔

''روشن لعل صبح اٹھ کر خوب گھنٹیاں بجاتا اور اتنے زور سے پوجا پاٹ کرتا کہ سلیم خان ضرور سنے اور سلیم خان بھی زور زور سے قرآن خوانی کرتا۔ روشن لعل کا مقصد یہ ہوتا کہ سلیم خان کی نماز میں خلل پڑے اور سلیم خان کا مقصد بھی یہی ہوتا کہ روشن لعل اچھی طرح پرارتھنا نہ کر سکے۔ وہ اس کی نماز کو اپنا دشمن سمجھتا تھا اور وہ اس کی پوجا کو۔''۶۶

ان کی دشمنی کا سلسلہ چلتا رہتا ہے اور بالآخر اس نفرت اور دشمنی کے غلط نتائج سامنے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ آخر ایک دن روشن لعل کے بچے کو کوئی اغوا کر لیتا ہے اور کچھ ہی دن بعد سلیم خان کا بچہ بھی گم ہو جاتا ہے۔ ان کی

نفرت کا کوئی تیسرا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان دونوں کے گھر اجاڑ دیتا ہے۔تب انہیں ایک دوسرے کا احساس ہوتا ہے، انہیں لگتا ہے کہ جو کام کرنے چاہیئے تھے وہ نہیں کیے بلکہ وہ ایک دوسرے کے مذہب کو گالی دیتے رہے اور ان کے بچے قتل ہو گئے۔دراصل آنند لہر نے واضح کیا ہے کہ عصر حاضر میں لوگ مذہبی تفرقات پیدا کر کے مشترکہ تہذیب اور انسانیت کا خون کر رہے ہیں۔جس کا انسان کو پتا نہیں لگتا اور وہ اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔لہر نے مذہبی تفرقات کی بنا پر ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے نتائج کو بڑی خوبصورتی سے یوں پیش کیا ہے۔

''ایک دن شہر میں بچوں کی ہڈیاں ملیں ،نعشیں ملیں۔وہ دونوں
بھاگے۔انہیں معلوم ہوا کہ ان کے بچوں کا قتل ہو گیا ہے۔وہ چپ
چاپ یہ سب سہتے گئے۔انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے کی
پوجا و نماز پر اعتراض کرنے میں مصروف رہے اور ان کے گھروں سے
ان کے بچے چوری ہو گئے اور پھر قتل ہو گئے۔''۶۷

''الگ صوبہ'' ایک مختصر اور دلچسپ افسانہ ہے۔جس میں جانور اور پرندے انسان کے کارناموں سے تنگ آ کر اپنے لئے الگ صوبے کی مانگ کرتے ہیں۔تاکہ انسان سے محفوظ رہ کر اپنی زندگی سکون سے گزار سکیں۔لہر نے انسانی زندگی کی حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔افسانے میں جانوروں کو کردار بنایا گیا ہے جو طنزیہ انداز میں انسان کی نفرت ،حماقت، دشمنی ،بے ایمانی اور بے وفائی کے بارے میں آپس میں محو گفتگو دکھائے گئے ہیں۔انسان کو اللہ نے اشرف المخلوقات کا درجہ بخشا۔اسے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت بخشی لیکن انسان آہستہ آہستہ اپنے مقصد سے ہٹتا گیا۔جن اوصاف کے لیے وہ جانا جاتا تھا وہ ان سے دور ہوتا گیا اور نتیجتاً اتنا جرائم پیشہ ہو گیا کہ جانور بھی اس کی حماقت کا ماتم منانے پر مجبور ہو گئے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ لڑائی وفساد کے نتائج برے ہوتے ہیں،اس کا انجام خوفناک ہوتا ہے۔انسان بغیر کسی مقصد کے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں،فساد کرتے ہیں،قتل و خون کرتے ہیں اور اپنی ذاتی دشمنی کی وجہ سے دیگر مخلوقات کو بھی مارتے ہیں۔قدرتی ذخائر جو قدرت نے انسان کی آسائش کے لئے تخلیق کئے ان کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔جس کا ذکر افسانہ نگار نے یوں کیا ہے۔

''جانور کبھی درخت نہیں اجاڑتے ،زمین پر دھواں نہیں پھیلاتے ،جنگ
نہیں کرتے ،بغیر بھوک کے ایک دوسرے کو مارتے نہیں مگر انسان

> جانور کی اولاد ہونے کے باوجود یہ سب کچھ کر رہا ہے۔اس بات کی تائید کرتے ہوئے لومڑی نے کہا’’ کہ انسان مکاری میں مجھ سے اوپر ہو گیا ہے۔کاغذوں پر درخت اگانے کے فیصلے کرتا ہے مگر حقیقت میں درخت اجاڑنے کے منصوبے بناتا ہے۔امن کی بات کرتا ہے مگر اندر ہی اندر سے جنگ کی تیاری کرتا ہے۔زمین سے تمام دھاتیں لے کر اسے زخمی کر چکا ہے۔‘‘ ۶۸

دراصل افسانہ نگار نے انسان کے دوغلے پن کو ظاہر کیا ہے کہ آج انسان اس قدر لالچی اور بے ایمان ہو چکا ہے کہ اس کے قول و فعل میں تضاد آ چکا ہے۔زبان سے کچھ کہتا ہے جبکہ دل میں کچھ ہوتا ہے۔بظاہر امن و شانتی کی بات کرتا ہے لیکن اندر ہی اندر جنگ کی تیاریاں کرتا ہے۔مکاری، جھوٹ، بے ایمانی اور بے وفائی میں اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اشرف المخلوقات کا درجہ ہونے کے باوجود وفاداری کے لیے کتے کی مثال دیتا ہے۔انسان کے کارناموں کی وجہ سے دنیا میں عذاب آتے ہیں، سیلاب اور زلزلے آتے ہیں۔افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ’’انسان کی وجہ سے ہماری نسل ہی ختم ہو جائے گی۔‘‘ ’’وہ کیسے‘‘ شیر نے چوہے سے وضاحت کرنے کو کہا، ’’وہ اس طریقے سے کہ ہم انسان کے گھر سے اناج کھاتے ہیں۔سبزیاں کھاتے ہیں مگر وہاں تو ہر چیز میں ملاوٹی ہے اور ہمارے بچے چوہے کمزور پیدا ہو رہے ہیں اور ہمیں بھی کئی بیماریاں لگ رہی ہیں‘ اس پر تمام بلیوں نے چوہوں کو عجیب انداز سے دیکھا مگر اچانک چیتے نے کہا، ’’انسان کو معلوم نہیں ہے یہ ملاوٹ اس کے لیے بھی موت ہے۔‘‘ ۶۹

انسان کے اندر اس قدر زہر پیدا ہو چکا ہے کہ وہ باتوں کے ذریعے بھی دوسروں کو ڈنک مارتا ہے۔مکاری اور غداری کی اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ دوستی کا لبادہ اوڑھ کر دوسرے کی بہو بیٹی کے جسم کو ڈسنا چاہتا ہے۔دولت کی لالچ میں تمام انسانی اقدار کو بھول چکا ہے۔نفرت اور حسد اس قدر بڑھ چکا ہے کہ ہر انسان دولت اور دنیا کی تمام تر

آسائشیں صرف اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہے۔دوسرے کی خوشی اسے برداشت نہیں ہوتی۔عصر حاضر میں انسان اس قدر بے حسی کا شکار ہو چکا ہے کہ غریب و بے بس لوگ بھوک سے تڑپ رہے ہیں لیکن وہ دولت اکٹھی کر کے سانپ کی طرح اس پر بیٹھ گیا ہے۔اپنی اصلیت سے ہٹ گیا ہے۔ ہر چیز میں ملاوٹ کر رہا ہے، بے ایمانی کر رہا ہے۔جس کو آنند لہر نے افسانے میں یوں پیش کیا ہے۔

> ''اتنی دیر میں بلی نے کہا''زمین بہت پریشان ہے،اب یہ بولتی ہے سیلابوں کے ذریعے ،زلزلوں کے ذریعے۔''سانپ نے اپنی بات کرتے ہوئے کہا،''میرے تمام ڈنک بے کار ہو گئے ہیں اور میں اگر اب کسی کو ڈنک مارتا بھی ہوں تو اثر نہیں ہوتا۔اب تو میرا ڈر بھی لوگوں میں ختم ہو گیا ہے کیونکہ انسان بات کرتا ہے تو لگتا ہے ڈنگ مار رہا ہے۔دوست بن کر اس کے گھر کے کونے میں چھپ کر اس کی لڑکیوں کی جوانی کو ڈسنے کی کوشش کرتا ہے۔دولت اکٹھی کر کے میری طرح اس پر بیٹھ گیا ہے۔کسی کو بھی وہ دولت استعمال نہیں کرنے دیتا۔''[۵۰]

لالچ اور ہوس نے انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیا ہے اور اس کے سوچنے کی صلاحیت ختم ہو گئی ہے۔اسی لئے وہ خود اپنے لئے تباہی و بربادی کے ذرائع تلاش کر رہا ہے۔ایسے ہتھیار بنا رہا ہے جس سے انسانی نسل کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔انسان کی انسانیت ختم ہو چکی ہے۔جس کی وجہ سے جانور بھی اس سے دور بھاگ رہے ہیں۔انسان ایسے ایسے کارنامے کر رہا ہے جن پر جانور بھی شرمندہ ہیں۔مختصر طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''الگ صوبہ''ایک خوبصورت افسانہ ہے۔جس میں انسانی زندگی کی حقیقتوں کو بڑی ہنر مندی اور تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔مصنف نے انسانی لالچ،ہوس،ظلم و بربریت ،مکاری،جھوٹ، بے ایمانی، بے حسی اور نفرت وحسد کو بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔بلاشبہ یہ عمدہ افسانہ ہے جس میں آنند لہر نے فنی مہارت کے ساتھ کئی حقیقتوں کو آشکار کیا ہے۔

### پلاٹ

پلاٹ سے مراد واقعات کی ترتیب ہے۔کہانی میں پیش کئے جانے والے واقعے کے مختلف اجزاء کو ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کا نام پلاٹ ہے۔کہانی میں وحدت تاثر کو برقرار رکھنے کے لیے فنی ترتیب ضروری ہے۔کہانی

میں پیش آنے والے واقعات کا ایک دوسرے سے منطقی جوڑ لگانا پلاٹ ہے۔افسانے کے پلاٹ کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی لکھتے ہیں۔

''کہانی میں پیش آنے والے واقعات یا جزئیات کو منطقی طور پر جوڑے رکھنے کا نام پلاٹ ہوتا ہے۔پلاٹ کا بنیادی مقصد کہانی کا آغاز، بتدریج پھیلاؤ اور انجام کے درمیان ربط و تسلسل کی برقراری ہوتا ہے تا کہ کہانی میں وحدت تاثر پیدا ہو سکے۔''[1]

افسانے میں قاری کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے حالات و واقعات کی ترتیب و تنظیم ضروری ہے۔اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ افسانے میں غیر ضروری تفصیلات سے بچا جا سکتا ہے۔بعض لوگ پلاٹ کو کہانی کے لئے ضروری تسلیم نہیں کرتے۔جدیدیت کے زیر اثر لکھنے والے قلم کاروں نے بغیر پلاٹ کے بھی کہانیاں لکھی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ اگر انسان کی زندگی میں ترتیب و تنظیم نہیں منتشر خیالات ہیں تو پھر زندگی کی عکاسی کرنے والے افسانے میں ترتیب و تنظیم کیوں کر ہو سکتی ہے۔کئی افسانہ نگاروں نے بغیر پلاٹ کے کہانیاں لکھیں۔جو علامتی اور تجریدی کہانیوں کے زمرے میں آتی ہیں۔یہ کہانیاں چونکہ عام قاری کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔لیکن زیادہ تر افسانہ نگاروں نے پلاٹ کو کہانی کے لیے لئے ضروری سمجھتے ہوئے اپنی کہانیوں میں پلاٹ کی ترتیب و تنظیم کا خاص خیال رکھا ہے۔کہانی میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنا اور اسے الجھن سے بچائے رکھنا، نیز بھٹکنے سے بچانا ضروری ہے۔اور یہ تبھی ممکن ہو سکتا ہے جب کہانی میں پلاٹ کی ترتیب کا خاص خیال رکھا جائے۔

آنند لہر کے اکثر افسانوں کے پلاٹ چست اور منظّم ہیں۔افسانوں میں پیش آنے والے مختلف حالات و واقعات کو آنند لہر نے فنی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں کے آغاز، وسط اور انجام میں تسلسل برقرار رہتا ہے۔افسانے کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ ختم ہوتے وقت ایک تاثر قاری کے ذہن پر چھوڑے۔پلاٹ کی کئی قسمیں ہیں جیسے سادہ، پیچیدہ، مبہم یا ضمنی پلاٹ۔جہاں تک لہر کے افسانوں کا سوال ہے تو آنند لہر نے زیادہ تر سادہ پلاٹ کا استعمال کیا ہے۔وہ براہ راست زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرتے ہیں۔بعض کہانیاں ایسی ہیں جن میں آنند لہر نے مبہم اور پیچیدہ پلاٹ کا استعمال کیا ہے۔ان کے علامتی اور تجریدی افسانے کے پلاٹ پیچیدہ اور مبہم ہیں۔دیگر افسانوں میں انھوں نے سادہ پلاٹ کا استعمال کیا ہے۔ان کے اکثر افسانوں کے پلاٹ مربوط اور لچک دار

ہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی کے مسائل ان کی کہانیوں کے موضوع ہیں۔انہوں نے اپنے گردوپیش کے ماحول سے افسانوں کے پلاٹ لیے ہیں۔افسانوں میں وحدت تاثر کو بڑی کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ان کے افسانے تندور ،جسم بستی، سرحد کے اس پار، اب تھانہ چل پڑے گا، لکیر، گوتم بدھ سڑک، بٹوارہ، دوسری بے انصافی، جج صاحب، عشق کی ہار، ایک اور ہجرت، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، کئی رنگ، انوکھی دعا، ووٹ بنک، دو دوست، بڑا آدمی، صرف ایک شام سنگھ اور تارو دیوی کے بازو وغیرہ کا پلاٹ مربوط اور لچکدار ہے۔جن میں آنندلہر نے مختلف واقعات و حالات کوفنی ترتیب و تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔جبکہ افسانہ سولھواں برس، پانی کی لکیر، دائرہ، بے چہرہ لوگ، ریت کا چشمہ، سورج کا قتل، گولائی، بکھرے لفظ، زخم، عمر اور رفتار ایسے افسانے ہیں جن میں بعض افسانوں کے پلاٹ مبہم اور پیچیدہ ہیں جبکہ بعض افسانے اینٹی پلاٹ کے زمرے میں آتے ہیں۔

### کردارنگاری

کردار نگاری بھی افسانے کا لازمی جز ہے۔آنند لہر کے افسانوں کے کردار بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔انہوں نے اپنی کہانیوں کے لیے کہیں دور پار نہیں بلکہ اپنے اردگرد کے ماحول سے کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔افسانوں کے مطالعے سے قاری کو لگتا ہے کہ یہ کردار بالکل ہمارے سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔انہوں نے مختلف قسم کے کردار استعمال کیے ہیں۔ ہر کردار میں جیتا جاگتا اور حقیقی زندگی کے بالکل قریب نظر آتا ہے۔ان کی کردار نگاری کا ذکر کرتے ہوئے انور کمال حسینی لکھتے ہیں۔

> ’’مجھے کہنے دیجئے کہ ان کے افسانے زندگی کی قاشیں ہوتے ہیں جو زندگی کی طرح کھٹے، میٹھے، کڑوے، تیکھے اور تیز ہوتے ہیں اور ان افسانوں کے کردار کسی دور دیس کے اجنبی نہیں ہوتے بلکہ ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے افراد ہوتے ہیں۔ان کے افسانے زندگی کے کسی نہ کسی کمزور پہلو یا مسئلہ کو سامنے لاتے ہیں مگر تفہیم پر ان کی گرفت کی وجہ سے وہ قاری کے ذہن پر بھار نہیں بنتے۔آنند لہر کے افسانے مختصر ہوتے ہوئے بھی زندگی پر محیط ہوتے ہیں۔‘‘ ۲؎

بعض ناقدین نے کردارنگاری کو افسانے کا لازمی جز قرار نہیں دیا ہے۔ بلاشبہ کرداروں کے بنا بھی افسانہ

لکھا جا سکتا ہے لیکن کردار قصے کو جاندار اور مؤثر بناتے ہیں۔ کردار افسانے میں پیش آنے والے واقعات کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ وقار عظیم افسانے میں کرداروں کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''افسانے کے وجود کے لئے افسانے کی تحریک، اس کے موضوع اور مواد، اس مواد کی فنی ترتیب اور پلاٹ کو جتنا ضروری اور اہم بتایا گیا ہے اس سے انکار ممکن نہیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے اس سے بھی زیادہ ضروری خود افسانوی کردار ہیں۔ اس لئے کہ گو پلاٹ اور اس کی فنی ترتیب کا کہانی کے فن سے بڑا گہرا تعلق ہے لیکن اس فن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہمیں حقیقت کا دست نگر ہونا پڑتا ہے۔ ہم اس فن کی بنیاد کسی نہ کسی دنیاوی حقیقت پر رکھتے ہیں۔ یہ حقیقتیں انسانی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں اس لئے افسانوی فن کو تحریک میں لانے اور پلاٹ کی منظّم اور مربوط شکل دینے کے لئے ہمیں کرداروں کی ضرورت ہوتی ہے۔''۳ے

دراصل افسانہ ہماری زندگی کے کسی پہلو کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے اس کے کردار بھی ہمارے معاشرے سے لیے جاتے ہیں۔ افسانے میں داستان کی طرح خیالی کردار نہیں برتے جاتے بلکہ یہ ہمارے سماج سے لیے گئے گوشت پوست کے جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں۔ افسانے میں پیش کیے جانے والے کرداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہماری روزمرہ زندگی کی ترجمانی کرتے ہوں۔ اس لیے حقیقی کرداروں کا ہونا لازمی ہے۔

کرداروں کا موضوعات سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ آنند لہر نے اپنے افسانوں میں سماجی مسائل کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے ہماری زندگی کی حقیقتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے افسانوں میں ایسے کردار استعمال کیے ہیں جن کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے۔ لہر نے سماج اور انسانی زندگی کے کئی پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ جن میں غربت، رشوت چوری، جنسی استحصال، طبقاتی کشمکش، ذات پات، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، اخلاقی اقدار کی گراوٹ اور کئی دیگر موضوعات شامل ہیں۔ جن کی پیشکش کے لئے انہوں نے ہر طرح کے کرداروں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ دراصل سماج مختلف قسم کے لوگوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ جس میں چور، بدکار، لالچی بے ایمان،

رشوت خور، ظالم، ایماندار، حساس، با اخلاق، محبت وشفقت کے پیکر غرض ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔آنند لہر نے مختلف موضوعات کے ذریعے کئی طرح کے کرداروں کو پیش کرتے ہوئے بہت سارے مسائل کو پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔لہر چونکہ پیشے سے وکیل تھے اس لیے تجزیاتی ذہن رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ کرداروں کی پیشکش میں بھی تجزیاتی طریقہ کار اپنایا ہے۔ تجزیاتی کردار نگاری میں دو طریقے اپنائے جاتے ہیں۔ایک بیانیہ جس میں مصنف راوی کی حیثیت سے کرداروں کی شخصیت کا سادہ بیانیہ یا علامتی انداز میں انکشاف کرتا ہے جبکہ دوسرا طریقہ مرکزی کردار کے ذریعے کہانی بیان کرنے کا ہے۔آنند لہر کے افسانوں میں دونوں طریقے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

افسانہ ’’پھول والی‘‘ میں مصنف نے راوی کی حیثیت سے کنول نامی ایک غریب لڑکی کی کہانی بیان کی ہے۔ جونہایت غربت میں زندگی بسر کرتی ہے اور پھول بیچ کر اپنا گزارا کرتی ہے۔اسی دوران گلاب نام کے لڑکے سے کنول کو محبت ہو جاتی ہے جو نہایت خوبصورت ہوتا ہے لیکن اس کا تعلق بھی ایک غریب گھرانے سے ہوتا ہے۔ کچھ دن یہ سلسلہ چلتا ہے اس کے بعد کنول کی شادی سخت سنگھ سے اس لئے ہو جاتی ہے کہ وہ اس سے پھول لے کر بیچتی تھی اور اس کی رقم ادا نہیں کر سکتی تھی۔ کنول کا کردار ان معصوم اور خوبصورت بچیوں کی نمائندگی کرتا ہے جو مفلسی اور سماج کی بے راہ روی کی وجہ سے معمر اور پھوڑ طبیعت کے لوگوں کے ہاتھوں بک جاتی ہیں۔ان لڑکیوں کی نازکی، خوبصورتی اور جوانی کو مدنظر رکھتے ہوئے لہر نے کنول جیسے خوبصورت اور نازک پھول کے نام سے لڑکی کا نام رکھا ہے۔ جبکہ دولت اور طاقت کی بنیاد پر معمر اور بداخلاق مرد جوان غریب لڑکیوں کی مفلسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں حاصل کر لیتے ہیں ان کے لیے سخت کا لفظ استعمال کرتے ہوئے سخت سنگھ کا کردار پیش کیا ہے۔ یہ دونوں کردار کنول اور سخت سنگھ اسم بامسمیٰ ہیں۔

افسانہ ’’زندگی‘‘ میں دو مرکزی کردار رمیش اور دھرم چند کردار نگاری کی عمدہ مثال ہیں۔رمیش ایک اعلیٰ آفیسر کا کردار ہے جبکہ دھرم چند ایک چپراسی کا کردار ہے۔رمیش کا کردار گھمنڈی، ظالم، بداخلاق اور بے حس انسان کی ترجمانی کرتا ہے۔رمیش اعلیٰ عہدے پر فائز ہوتا ہے تو اسے اپنے عہدے کا گمان ہوتا ہے وہ اپنے ماتحت ملازموں اور عام لوگوں سے نفرت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ ہر کسی سے برے طریقے سے پیش آتا ہے۔جس کی تصویر کشی آنند لہر نے یوں کی ہے۔

’’دھرم چند نے جوں ہی اندر جھانکا تو دیکھ کر حیران ہو گیا کہ رمیش

پریشانی کے عالم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔اسے دیکھتے ہی چلا کر
بولا ’’کیابات ہے سالے۔‘‘
دھرم چند نے گالی یوں برداشت کی جیسے ڈاکٹر نے کڑوی، دوا پلا دی
ہو۔پھر جلدی سے بولا ’’جناب آپ کے دوست گر دھاری آئے
ہیں۔‘‘
’’کہانا دومنٹ کے بعد آنا۔‘‘
دم چند باہر چلا گیا اور سمجھ گیا رمیش اپنے دوست پر اپنی افسری کا رعب
دکھانے کے لیے ایسا کر رہا تھا۔‘‘ ۴۷ے

رمیش ہر کسی پر اپنی افسری کا رعب جما تا ہے لیکن گھر میں اس کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔وہ چونکہ رشتوں کے تقدس سے بے بہرہ ہو گیا تھا اور اس کی بیوی اور بچے بھی ماڈرن دور کی ترجمانی کرتے ہوئے رشتوں کی اہمیت کو نہیں جانتے۔بیوی اور بچے اس کی عزت نہیں کرتے۔جس کی وجہ سے وہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔اس کے گھر کا ماحول بگڑ جاتا ہے۔جبکہ اس کے ماتحت کام کرنے والا دم چند معمولی تنخواہ پر خوش رہتا ہے اور گھر میں اس کی خوب عزت ہوتی ہے۔اس کا گھر امن وشانتی اور خوشحالی کا گہوارہ بن جاتا ہے۔رمیش اعلیٰ عہدہ اور دولت ہونے کے باوجود سکون کی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔اپنے گھر میں توازن برقرار نہیں رکھ سکتا۔دراصل رمیش کا کردار عہد حاضر کی عمدہ عکاسی کرتا ہے۔نیز ان لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے جو صرف عہدے اور دولت کو اہمیت دیتے ہیں اور اخلاقی قدروں کی اہمیت اور رشتوں کے تقدس کو بھول جاتے ہیں۔جس کے نتیجے میں رسوائی اور پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔

افسانہ ’’جسم بستی‘‘ کا مرکزی کردار ثریا ہے۔جو ایک دلچسپی کردار ہے اور افسانے کے مطالعے سے لگتا ہے کہ یہ بالکل فطری کردار ہے اور ہمارے سماج کا حصہ ہے۔ثریا کا کردار ایک باعزم،غیرت مند،حساس اور دلیر عورت کا کردار ہے۔ثریا کا کردار ان عورتوں کی ترجمانی کرتا ہے جو مفلسی اور حالات کی ستم ظریفی اور بے رحم سماج کے ظلم وعتاب کا شکار ضرور ہوتی ہیں لیکن حالات کے سامنے جھکتی نہیں۔ثریا کا باپ اس کے بچپن میں مر جاتا ہے۔جس کے بعد اس کا چچا اسے ایک ہزار روپے کے عوض فروخت کر دیتا ہے تاکہ اس کے باپ کی جائیداد کا وارث بن سکے۔افسانے سے اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''ثریا کے باپ کی جائیداد نے اس کے چچا کا اس سے رشتہ توڑا اور پھر ایک نیا رشتہ بنا وہ تھا عورت اور مرد کا اور اس رشتے کی وجہ سے اسے ایک ہزار روپے کی عوض بیچ دیا گیا مگر اس سودے میں ثریا کو کچھ نہیں ملا۔ یہ یک طرفہ سودا تھا۔ ایک ہزار روپے اس کے چچا نے لیے اور ثریا کا بدن کسی اور کے حوالے ہو گیا یہ کہانی صرف اتنی سی ہے۔'' ۵۷

ثریا کو بچپن میں بیچ دیا جاتا ہے اور جب وہ بڑی ہوتی ہے تو اسے ایک چکلے کی رونق بنایا جاتا ہے۔ جہاں ہر کوئی آتا ہے اور اس کے بدن کو نچوڑتا ہے۔ اپنی ہوس مٹانے کے لیے اسے طرح طرح کے فقرے سناتا ہے تم میری رانی ہو، میری جان ہو، بہت خوبصورت ہو وغیرہ۔ کچھ عرصہ یہ سب سہنے کے بعد ثریا کو لگا کے یہاں ہوس کا شکار ہونے والی ہر لڑکی اس کی طرح تنگ ہے۔ اسے لگا کہ عورت جہاں بھی ہو وہ صرف عیش کا سامان ہے۔ آخر کار ثریا تنگ آ جاتی ہے اور وہ بغاوت کرنا چاہتی ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اسے اس کے لئے آواز بلند کرنی چاہیے تا کہ اس کی طرح شکار ہونے والی دوسری لڑکیوں کی آواز بھی بلند کی جا سکے۔

بالآخر ثریا یہ طے کرتی ہے کہ وہ الیکشن لڑ کر ممبر اسمبلی بن کر ان عورتوں کی نمائندگی کرے گی جو چکلے پر ہوس کے پجاریوں کی ہوس کا شکار ہو رہی ہیں۔ ثریا الیکشن میں حصہ لیتی ہے اور تمام سیاسی لیڈر اس لیے اس کی مخالفت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ بھی ہوس مٹانے کے لئے چکلے پر جاتے تھے اور انہیں ڈر تھا کہ ثریا کہیں ان کا راز افشاں نہ کرے۔ ثریا الیکشن میں کامیاب ہو جاتی ہے لیکن الیکشن کے فوراً بعد اس کی تمام تر امیدوں پر پھر سے پانی پھر جاتا ہے۔ جب مختلف پارٹیاں اپنے اقتدار کے لیے اسے خریدنے کی لالچ دیتی ہیں۔ تب اسے لگتا ہے کہ عورت چاہے منسٹر بھی بن جائے لیکن حوالہ سسٹم ختم نہیں ہوتا۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ یہاں بھی ضمیر بکتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ثریا کا کردار ایک فعال عورت کا کردار ہے جو حالات کا ماتم کے سامنے جھکتی نہیں بلکہ حالات کو بدلنی کی کوشش کرتی ہے۔ سریا کا کردار خوبصورت کردار ہے جسے اللہ نے سماجی حقیقت کو پیش کرنے کے لئے بڑی ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔

افسانہ ''اب تھانہ نہ چل پڑے گا'' میں کام چند کا کردار بہت اہم ہے جو محکمہ پولیس میں حوالدار کے عہدے پر فائز ہوتا ہے اور اس محکمے کی ترجمانی کرتا ہے۔ آنند لہر نے کام چند کے ذریعے محکمہ پولیس کی رشوت خوری کی عمدہ

عکاسی کی ہے۔رشوت خوری کو پیش کرنے کے لئے اور لوگوں کے دلوں میں رشوت سے نفرت پیدا کرنے کے لیے جس ہنرمندی سے آنند لہر نے کام چند کا کردار پیش کیا ہے وہ بے مثال ہے۔رشوت آجکل ہر محکمے میں عروج پر ہے لیکن محکمہ پولیس اس ضمن میں زیادہ بدنام ہے۔کیونکہ یہاں رشوت قاتل کو مقتول اور مقتول کو قاتل بنا دیتی ہے۔کان چند ایک ظالم حوالدار تھا اور محکمے میں رشوت خوری اور ظلمیت کے لیے جانا جاتا تھا۔محکمہ کے آفیسران اس سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ وہ ان کے آمدنی کا ذریعہ ہے۔کام چند لوگوں سے رشوت وصول کرتا ہے اور افسروں تک حصہ پہنچاتا ہے۔اسے ایک نئی پولیس چوکی پر تعینات کیا جاتا ہے جہاں وہ لوگوں سے رشوت بٹورنے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتا ہے۔بالآخر ظلم اور بے حسی کی انتہا اس وقت پار کرتا ہے جب ایک لاوارث عورت کی موت پر گاؤں والے رپورٹ درج کروانے آتے ہیں تو وہ ان سے رشوت طلب کرتا ہے۔گاؤں والے بتاتے ہیں کہ یہ ایک لاوارث عورت ہے جس کا انتقال بجلی گرنے سے ہوا ہے اور اس کا کوئی جائز وارث نہیں ہے جو رشوت دے سکے۔کان چند یہ سن کر انہیں جواب دیتا ہے کہ مرنے والا کون ہے اور وہ کس طرح سے مرا ہمیں اس سے کوئی مقصد نہیں ہمارا چائے پانی ہر حالت میں قائم رہتا ہے۔تب گاؤں والے پریشان ہوتے ہیں اور بالآخر یہ طے کرتے ہیں کہ اس عورت کے جسم پر آدھا کفن ڈالا جائے اور آدھے کفن کی رقم کان چند کو دی جائے۔بالآخر وہ ایسا ہی کرتے ہیں اور کان چند وہ رقم وصول کر کے اپنے افسروں کو اطلاع دیتا ہے کہ بونی ہوگئی ہے اب تھانہ چل پڑے گا۔کان چند کا کردار ظالم و جابر، بے حس اور مردہ ضمیری کی عمدہ مثال ہے۔آنند لہر کا مقصد دراصل محکمہ پولیس کی رشوت خوری کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے دلوں میں رشوت سے نفرت پیدا کرنا تھا۔لہذا اس کے کردار کی پیشکش میں آنند لہر نے بڑی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

افسانہ ''دادی اماں'' میں عورت کی وفاداری اور ممتا کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔دادی اماں کا کردار عورت کی اپنی اولاد کے تئیں محبت اور ایثار وقربانی کے جذبے کو پیش کرتا ہے۔دادی اماں اپنے دو بچوں کی پرورش کرتی ہے جن کی ماں کا بچپن میں انتقال ہو جاتا ہے اور باپ دوسری شادی کر کے انہیں چھوڑ کے چلا جاتا ہے۔پوتوں کی پرورش دادی اماں بڑی محنت ومشقت اور لاڈ پیار سے کرتی ہے وہ ماں سے بھی زیادہ ان کا خیال رکھتی ہے۔دادی کی محبت کی تصویر کشی کرتے ہوئے آنند لہر یوں رقمطراز ہیں۔

''وہ ان کے کپڑے دھوتی نہلاتی کھانا پکاتی اور اسکول بھیجتی۔دادی

انہیں دنیا کی سب سے مضبوط ترین چیز لگتی اور حقیقت میں وہ مضبوط
ثابت ہوئی تھی ۔رات کو انہیں بستر پر سلا دینا اور خود فرش پر سونا انہیں گرم
کپڑے پہنانا اور خود سردی میں ٹھٹھرنا انہیں تازہ کھانا دینا اور خود بچا کھچا
کھانا یہ سب اس عورت کی مضبوطی کی علامتیں تھیں۔''۶۷

دادی اماں اپنے پوتوں کی پرورش میں کوئی کمی نہیں چھوڑتی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پوتوں کے دلوں میں اس کے لئے نفرت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔دادی کے انتقال سے پہلے جائیداد ان کے نام نہیں ہوسکتی اس لیے وہ دادی کو قتل کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔طرح طرح کی تراکیب سوچتے ہیں لیکن انہیں پھر دادی کی بے لوث محبت یاد آ جاتی ہے اور وہ اسی شش و پنج میں ہوتے ہیں کہ ایک دن اچانک دادی کی موت ہو جاتی ہے۔

دادی اماں کا کردار عورت کی اپنی اولاد کی تئیں بے لوث محبت اور قربانی کے جذبے کی عکاسی کرتا ہے۔جو زندگی بھر ہزار پریشانیاں جھیل کر ان کے لیے آرام و آسائش کا سامان فراہم کرتی ہے۔ان کی نیت کو پرکھے بغیر بے لوث خدمت کرتی ہے اور جب اسے اپنی موت کے آثار نظر آتے ہیں تب بھی اسے اپنی جان کی فکر نہیں ہوتی بلکہ اپنے بوتوں کی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔اس سے زیادہ محبت اور قربانی کیا ہوسکتی ہے کہ مرتے وقت بھی دادی ماں اپنے بچوں کے کپڑے دھو کر اور خوبصورت مشورہ دے کر ان کی فکر کو اپنے سینے میں دفن کرتی ہوئی دنیا سے چلی جائے۔ایک عورت کی اپنے بچوں سے محبت کو پیش کرنے کے لئے دادی اماں کا کردار بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔جس کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

''انہوں نے دیکھا کہ وہ مری پڑی ہے، جیسے صدیوں سے سو رہی ہو
۔پھر نیچے ایک کاغذ کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا،جس پر ٹوٹے ہوئے لفظوں میں لکھا
تھا۔''پیارے بچو، کپڑے کچھ دنوں کے لیے دو چکی ہوں ۔سویٹر
دوسرے بڑے ٹرنک میں ہیں۔راجا تمہیں کہہ دوں کہ بدیش جا کر اپنی
صحت کا خیال رکھنا اور کھانا بنانا پڑا ہے۔جب مجھے جلا کر آنا تو فوراً کھا
لینا،بھوکے نہ رہنا۔''۶۸

افسانہ''جج صاحب'' میں جج کیلاش ناتھ کا کردار بڑا دلچسپ کردار ہے۔کیلاش ناتھ کا کردار رشوت

خور، بے ایمان اور ظالم جج کا کردار ہے۔ جو رشوت لے کر قانون کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ کیلاش ناتھ قانون، انصاف و رسچائی کو بالکل نظر انداز کر کے بعض فیصلے اپنے رشتے داروں کے کہنے پر سنا تا ہے جبکہ بعض ان لوگوں کی منشا پر جن سے اس کی کوئی ذاتی دشمنی ہو، جبکہ دیگر رشوت لے کر۔ غرض کیلاش ناتھ بے ایمانی اور حرام خوری کی انتہا پار کر جاتا ہے۔ جس سے لوگ ظلم و جبر کا شکار ہوتے ہیں۔ کیلاش ناتھ کا کردار عدالت میں بیٹھے ان تمام رشوت خور، بے ایمان اور جھوٹے لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے جو قانون کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور ان کی وجہ سے حق اور سچ دب جاتا ہے اور لوگ ناحق جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیے جاتے ہیں۔

افسانہ ''دو دوست'' میں شام لعل اور رام لعل دو مرکزی ہیں۔ دونوں متضاد صفات کے مالک ہیں۔ انسانی زندگی کے دو الگ الگ پہلو کی ترجمانی کرتے ہیں۔ شام لعل جو کہ رشوت خور اور رام لعل ایک ایماندار شخص کا کردار نبھاتا ہے۔ شام لعل خوب رشوت لیتا ہے اور پیسوں کی لالچ میں اس قدر مگن ہو جاتا ہے کہ رشتوں کی اہمیت اور اخلاقی قدروں کو بھول جاتا ہے۔ وہ انجینئر کے عہدے پر فائز ہوتا ہے اور سروس کے دوران صرف رشوت بٹورنا، بے ایمانی کرنا اور لوگوں کو تنگ کرنا اپنا شیوہ بنالیتا ہے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد سماج میں اس کی کوئی عزت نہیں رہتی یہاں تک کہ اس کے گھر والے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ جبکہ رام لعل ملازمت کے دوران ایمانداری اور ہمدردی سے کام لیتا ہے اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد معاشرے میں اس کی خوب عزت ہوتی ہے اور گھر میں بھی عزت اور عیش کی زندگی گزارتا ہے۔ دونوں بالکل فطری کردار معلوم ہوتے ہیں۔

افسانہ ''بڑا آدمی'' کا کزی کردار گوگل چند بھی قاری کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ گوگل چند کی ایک ہی تمنا ہے کہ وہ بڑا آدمی بنے۔ جس کے لیے پیار و محبت اور اخلاقی اقدار کو بھول جاتا ہے۔ اس کے پاس بے حد دولت ہے اور اس کی تمنا ہے کہ ہر شخص اسے بڑا آدمی سمجھے۔ وہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں اس کے برابر کوئی بھی نہ ہو۔ مال و دولت پر فخر کرتا ہے اور غریبوں کا استحصال کرتا ہے، اپنے سوا کوئی بھی اسے انسان نظر نہیں آتا۔ مال و دولت کے نشے میں مست زندگی انانیت میں گزارتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے بعد گھر میں گوگل چند کی اہمیت کھو جاتی ہے۔ گھر میں کوئی بھی اسے عزت و قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ تب اسے اپنی دولت بیکار لگتی ہے اور رسوائی و بے چینی کے سوا اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یہاں تک کہ گھر کے افراد اس کے مرنے کا انتظار کرتے ہیں۔ ایک مغرور انا پسند اور ظالم شخص کے کارناموں کے انجام کو افسانہ نگار نے یوں پیش کیا ہے۔

''کوئی اس کا انتظار نہ کر رہا تھا۔مگر شراب کے عالم میں اس کی بہو نے کہہ دیا''نہ جانے کب وہ بوڑھا مرے گا اور جائیداد ہمیں ملے گی۔'' دوسری بہو نے کہا ''ہم تو فیکٹری اپنی مرضی سے چلائیں گے۔'' گوگل چند کی بیوی کسی کلب میں گئی ہوئی تھی۔کسی نے گوگل چند کو کھانے کے لیے نہیں کہا، بیٹھنے کے لیے نہیں کہا۔رکشے والے کے منہ سے اچانک نکل گیا سیٹھ جی مجھے جانے دو میری بیوی بچے اور میرے ماں باپ میرا انتظار کر رہے ہیں۔گوگل چند کو اچانک ایک دھکا لگا اور وہ اپنے آپ کو دنیا کا ایک غریب شخص محسوس کرنے لگا کیونکہ اس کے پاس رکشے والے کو دینے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔'' ۸ے

گوگل چند کا کردار ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو دولت وشہرت کے لیے اخلاقی قدروں کو بھول جاتے ہیں۔دوسروں کا اپنی انا کی تسکین کے لیے غلط استعمال کرتے ہیں۔کسی کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور بالآخر خود رسوائی اور بے چینی کا شکار ہوتے ہیں۔جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خوشگوار زندگی گزارنے کے لئے صرف مال و دولت کافی نہیں بلکہ اخلاق، پیار اور عزت کمانا ضروری ہے۔

اس کے علاوہ آنند لہر نے بعض ایسے افسانے بھی تخلیق کیے ہیں جن میں انسانوں کے بجائے جانوروں اور پرندوں کو کردار بنایا ہے۔جبکہ بعض ایسے افسانے بھی ہیں جن میں مصنف نے خود راوی کی حیثیت سے کہانی بیان کی ہے اور کوئی بھی کردار استعمال نہیں کیا۔افسانہ ''الگ صوبہ'' اور چڑیوں کی بارات ایسے افسانے ہیں جن میں جانوروں اور پرندوں کو کردار بنایا گیا ہے۔دراصل آنند لہر نے انسانی عقل اور اس کی عادات واطوار پر طنز کرنے کے لئے ایسے کردار استعمال کیے ہیں۔عصر حاضر میں انسان اس قدر بے حسی، ظلم، نفرت، حسد اور ناانصافی کا شکار ہو چکا ہے کہ جانور بھی اس کی عقل سے مایوس ہیں۔

افسانہ ''الگ صوبہ'' میں آنند لہر نے ہاتھی، چوہا، لومڑی، بلی، سانپ، شیر، ہرن اور کتا وغیرہ کو کردار کے طور پر استعمال کیا ہے۔دراصل ایسا انھوں نے انسان کی مکاری، جھوٹ، ظلم، بے ایمانی اور ناانصافی کو پیش کرنے کے لئے کیا ہے۔ان کرداروں کے سہارے لہر نے انسان کی مختلف خامیوں کو طنزیہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی

ہے۔انسان کی عادتوں سے تنگ آ کر جانور الگ صوبے کی مانگ کرتے ہیں کہ انسان اتنا بے حس، ظالم، بے ایمان اور مکار ہو چکا ہے کہ جانور بھی اس کے ساتھ رہنے سے کتراتے ہیں۔

افسانہ ’’چڑیوں کی بارات‘‘ میں بھی پرندوں اور جانوروں کو کردار بنایا گیا ہے۔کوئی بھی انسانی کردار لہر نے نہیں استعمال کیا۔ چڑیوں کی بارات‘‘ سے لہر نے پرندوں کی یکجہتی اور اتحاد کا درس دیا ہے کہ جانور اور پرندے مل جل کر رہتے ہیں،ان میں اتفاق ہے۔جبکہ انسان نے باہمی اتفاق اور بھائی چارے کو ختم کر دیا ہے۔ پرندے اور جانور خودغرض ،مکار، چھوٹے اور بے ایمان نہیں ہوتے اور اسی خوبی کی بنا پر ان کے درمیان اتفاق ہے جبکہ انسان ان لعنتوں کی وجہ سے بٹ گیا ہے۔ مذہب میں ،مسلکوں میں، ذاتوں میں ،شہروں اور سرحدوں میں ۔جس کی وجہ سے انسانوں کے درمیان محبت و اخوت اور بھائی چارے کے بجائے نفرت اور کشیدگی نے جنم لے لیا ہے۔اور انسان کی نفرت اور کشیدگی صرف انسان کے لیے نہیں بلکہ جانوروں اور پرندوں کے لیے بھی جان لیوا ہے۔اس لئے پرندوں اور جانوروں کو زندگی گزارنے کے لئے الگ صوبہ درکار ہے۔اس ضمن میں افسانے سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ’’اسی طریقے سے سب کوؤں پرندوں کی باتیں سن کر نیچے جانوروں نے اعلان کیا کہ اگر انسان الگ زبان مذہب کے نام پر الگ ملک وا لگ صوبے قائم کرسکتا ہے تو ہم بھی یہ مانگ کریں گے کہ جانوروں کو بھی ایک الگ صوبہ ہونا چاہئے۔ جہاں وہ اپنے قائدے کے مطابق جی سکیں۔جس کے آسمان کے اوپر چڑیاں اور دوسرے پرندے بلاخوف اڑ سکیں اور نیچے جانور زمین کو زمین سمجھ کر رہ سکیں اور کوئی جنگ نہ ہو،کوئی سرحد نہ ہو۔‘‘ ۹ے

انسان کی بری خصلتوں کو بیان کرنے کے لیے آنند لہر نے جس خوبی کے ساتھ طنزیہ انداز میں جانوروں اور پرندوں کے کردار استعمال کیے ہیں وہ ان کی فنی مہارت کا ثبوت ہیں۔اوران تمام بری خصلتوں سے قاری کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا کرنے میں آنند لہر کافی حد تک کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

لہر کے بعض افسانے اینٹی پلاٹ اور اینٹی کردار بھی ہیں۔انہوں نے تجریدی افسانے بھی لکھے ہیں۔جن میں علامتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔افسانوی مجموعہ ’’انحراف‘‘ کے افسانوں میں علامتی کرداروں کا استعمال کیا

ہے۔ جیسے دائرہ، سوچ، ہوا، الف ،س، گولائی، وغیرہ۔ انحراف میں شامل افسانہ ’’راستے کا پہاڑ‘‘ ہے جس میں اس طرح کے کرداروں کا استعمال کیا گیا ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیں۔

’’لیکن تم زخمی کیسے ہوئے۔ تمہاری شکل تو ’’الف‘‘ سے ملتی جلتی ہے اور الف تو ہر چیز کی ابتدا ہے۔

’’س‘‘ نے سوال کیا۔

’’دوست !الف کو الف نہیں رہنے دیا گیا۔ اسے لفظوں کے بیچ اس طرح گرفتار کیا گیا کہ اس کا وجود ہی بگڑ گیا۔ اس کی انفرادیت ختم ہوگئی اور جب کسی چیز کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے تو وہ زندہ رہتے ہوئے بھی مر جاتی ہے۔ یہی بات ہے کہ کسی شخص نے آج تک الف کو نہیں دیکھا اور تم نے بھی اسی لیے کہا ہے کہ میری شکل الف سے ملتی جلتی ہے۔‘‘ ۸۰

اسی طرح ایک اور افسانہ ’’زخم‘‘ میں بھی لہر نے اسی طرح کے علامتی کرداروں کا استعمال کیا ہے۔ جبکہ افسانہ ’’الفاظ‘‘ میں بھی الف، ب، ج، س وغیرہ کردار استعمال کیے ہیں۔ جس کی مثال افسانہ ’’زخم‘‘ سے ملاحظہ کریں۔

’’سڑک سے دشمنی مول مت لو۔‘‘ الف نے کنکر توڑتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن میرے پاؤں تو اس نے زخمی کر دیے ہیں اور اس قدر بے وفا ہوگئی ہے کہ اب مجھے موڑ کاٹنے پڑتے ہیں اور یہ قائم و دائم رہتی ہے۔‘‘ ب نے ریت کا گولا بناتے ہوئے جواب دیا۔‘‘ ۸۱

## مکالمہ نگاری

مکالمہ بھی افسانے کا اہم جز ہے۔ قصہ افسانے کا لازمی جز ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ افسانوی ادب کی بنیاد قصے پر ہے۔ قصہ بیان کرنے کے لیے کیونکہ افسانہ نگار کو کرداروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کرداروں کے بغیر بھی کہانیاں لکھی جاتی ہیں تاہم زیادہ تر کہانی کاروں نے کہانی بیان کرنے کے لئے کرداروں کا سہارا لیا ہے۔ کرداروں کی باہمی گفتگو کے ذریعے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ کرداروں کی یہی گفتگو مکالمہ کہلاتی ہے۔ افسانے میں چونکہ اختصار سے کام لیا جاتا ہے۔ یہاں بے جا طوالت کی گنجائش بالکل نہیں ہوتی۔ افسانہ نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بات

کاعلم رکھتا ہو کہ کیا کہنا ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اسے اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ کیا نہیں کہنا ہے۔ بے جا طوالت افسانے میں قاری کی دلچسپی کو ختم کرتی ہے۔ جس طرح کرداروں کے لیے ضروری ہے کہ بالکل فطری معلوم ہوں اسی طرح مکالموں کا حقیقی ہونا بھی ضروری ہے۔ تا کہ قاری کو محسوس ہو کہ دو انسان بالکل ہماری طرح ہی بات کر رہے ہیں۔ مکالموں کے سلسلے میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ مکالمے کردار کی فطرت و معیار کے عین مطابق ہوں۔ افسانہ نگار کو اس بات کا علم ہونا ضروری ہے کہ کس موقع پر کونسے کردار سے کیا مکالمہ ادا کروانا ہے۔ مکالمے کے لئے افسانہ نگار کو کردار کے تعلیمی، سماجی اور اخلاقی معیار کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ مکالمے ایسے ہونے چاہئے جیسا کہ اصل زندگی میں ہوتے ہیں۔ تا کہ حقیقت اور اصلیت ان سے ظاہر ہوتی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ قاری انہیں ناممکن سمجھے۔ مکالمہ ادا کرواتے وقت کرداروں کے معیار کو ملحوظ رکھنا بے حد ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ایک جاہل اور غیر مہذب انسان سے عالمانہ گفتگو کرائی جائے اور عالم سے غیر مہذب۔ افسانوں میں مکالمہ نگاری کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے وقار عظیم لکھتے ہیں۔

> ''مکالمے کے لئے بھی دوسری چیزوں کی طرح ضروری ہے کہ وہ حقیقی معلوم ہوں۔ افسانہ نگار دو کرداروں میں مکالمہ کرائے تو وہ بالکل ویسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ اصل زندگی میں۔ اسے کم از کم ایسا ضرور ہونا چاہئے کہ پڑھنے کے بعد پڑھنے والا اسے غیر ممکن نہ سمجھے۔ اس کے ایک ایک لفظ سے حقیقت اور اصلیت کی بو آتی ہو۔'' ۸۲؎

جہاں تک آنند لہر کے افسانوں کا تعلق ہے تو ان کے افسانوں میں مکالمہ نگاری کے عمدہ نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اختصار ان کے افسانوں کا خاصہ ہے۔ اختصار کی بنیاد پر اگر دیکھا جائے تو ان کے افسانوں کو افسانچے کہنا مناسب ہوگا۔ کم لفظوں میں مکمل بات کہنے کا ہنر لہر کو خوب آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اکثر افسانے بہت مختصر ہیں۔ اسی لئے انور کمال حسینی ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''لفظوں کی جمع پونجی کے لحاظ سے افسانے مختصر ہیں لیکن معنویت کے لحاظ سے سمندر ہیں۔ کم لفظوں میں بھرپور بات کہنا ان کا مزاج بھی ہے اور فن بھی۔'' ۸۳؎

آنند لہر نے کرداروں کے معیار کے مطابق مکالمے لکھ کر مکالمہ نگاری کی خوبصورت مثالیں پیش کی ہیں۔افسانہ ’’زندگی‘‘ سے ایک مثال دیکھیں جس میں ایک ایسے خاندان کی کہانی بیان کی گئی ہے۔جو دولت وشہرت کے بھوکے اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہوتے ہیں۔جدید طرز پر زندگی جینا چاہتے ہیں۔جس کی وجہ سے اخلاقی اقدار اور گفتگو کے آداب وہ معیار کو بھول جاتے ہیں۔رمیش افسانے کا مرکزی کردار ہے۔وہ ایک خاندان کا سربراہ بھی ہے۔جس کے افراد اعلیٰ اخلاق اور رشتوں کے تقدس سے بالکل بے بہرہ ہیں۔رمیش سے اس کی بیوی اور بچے یوں گفتگو کرتے ہیں۔

’’آج لیٹ کیو آئے ہو،تمھیں معلوم نہیں کلب جانا ہے‘‘

’’آفس میں لیٹ ہو گیا‘‘

’’آفس ۔۔۔آفس سن کر میں تنگ آ گئی ہوں تمہارے آفس۔جتنی تنخواہ تم لیتے ہو،اتنے روپے میرے پتا جی ہر مہینے اپنے نوکروں میں بانٹ دیتے ہیں۔‘‘

رمیش کا بڑا لڑکا آیا کہنے لگا’’پتا جی جلدی سے دو ہزار روپیہ نکالو‘‘

چھوٹا لڑکا پاس سے گزر گیا۔اس نے باپ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔‘‘

۸۴؎

عصر حاضر میں لوگ اپنی تہذیب کو بھول گئے ہیں۔رشتوں کا تقدس برقرار نہیں رہا،چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں رہی۔گفتگو کے آداب باقی نہیں رہے۔مندرجہ بالا اقتباس سے جدید دور کے مطابق جینے کے خواہش مند، آداب واقدار کی قدر نہ کرنے والے کرداروں کی گفتگو بالکل ان کے حسب حال معلوم ہوتی ہے۔اسی طرح ایک اور افسانے ’’کرائے کا مریض‘‘ سے چند مکالمے ملاحظہ کریں جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔

’’نہیں تم اس وقت یہ کام نہیں کر سکو گے‘‘

کیوں؟ راجا نے پوچھا

’’اس لیے کہ تمہیں ٹریننگ نہیں ہے۔‘‘

’’ٹریننگ؟‘‘

''ہاں بھائی اس کام کے لیے بھی ٹریننگ جائے خاص کرالیکشن کے
موقع پر۔''
''وہ کیسے؟'' راجہ نے پوچھا
''بھائی صبح اٹھنا ہوتا ہے، پہلے دفتر جانا ہوتا ہے، بریک فاسٹ کرنا ہوتا
ہے، پھر جلسے والی جگہ جانا اور نعرے مارنا۔۔
''نیتا جی آگے بڑھو ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''۔۔۔
عورتوں کا مسیحا۔ ہمارا لیڈر ،دیش کا نیتا کیسا ہو۔ ہمارے نیتا جیسا
ہو۔''۸۵؎

لہر نے کرداروں کے معیار کے بالکل مطابق مکالمے کہلوائے ہیں۔ جو حقیقت اور اصلیت سے بالکل نزدیک نظر آتے ہیں۔ بے جا طویل مکالمہ سے انہوں نے گریز کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مکالمے فطری معلوم ہوتے ہیں اور انہیں پڑھنے کے بعد قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی بلکہ وہ ان سے لطف وانبساط حاصل کرتا ہے۔ مثال کے لئے ان کے افسانوں سے چند اور خوبصورت مکالمے پیش نظر ہیں۔

سانپوں کا کھیل بڑا خطرناک ہے اسے صرف دیکھنا چاہئے۔
صاحب، بونی ہوگئی ہے، لگتا ہے تھانا چل پڑے گا۔
ہر چیز ملنے کے بعد بے مطلب کیوں ہو جاتی ہے؟
حضور عورت کی عزت بچانا بھگوان کا حکم ہے اور سرحد کی حفاظت
کرنا انسان کا حکم۔
ایک جرم دوسرے جرم کو مضبوط کرتا ہے۔
کیا بات ہے، کہیں بے ایمانی میں بے ایمانی تو نہیں ہو رہی۔
بڑے ملزم کا مقدمہ لینے سے چھوٹے ملزم خود بخود آجاتے ہیں۔۸۶؎

مندرجہ بالا مکالموں سے آنند لہر کی فن مکالمہ نگاری پر دسترس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ لہر نے بے جا طوالت سے گریز کرتے ہوئے کرداروں کی فطرت کے مطابق حقیقت اور اصلیت پر مبنی مکالمے استعمال کیے

ہیں۔جنہیں پڑھنے کے بعد قاری کو کہیں پر بھی کوئی بات ناممکن نظر نہیں آتی۔ایک ایک لفظ کرداروں کی فطرت اور معیار کے مطابق استعمال کیا ہے۔

## نقطہ نظر

نقطہ نظر افسانے کا لازمی جز ہے۔ ہر تخلیق کار اپنا اپنا نقطہ نظر ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بہتر ہوگا کہ نقطۂ نظر کے بغیر کوئی بھی تخلیق وجود میں نہیں آسکتی۔فنکار اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے لیے تخلیق کا کرب جھیلتا ہے۔مصنف کیونکہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے وہ کسی بھی چیز کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کرتا ہے۔وہ جب کسی چیز سے متاثر ہوتا ہے، کوئی خامی اسے سماج میں نظر آتی ہے تو وہ کہانی کی صورت میں لوگوں کے سامنے اسے اس طرح منکشف کرتا ہے تا کہ لوگ اس خامی سے نفرت شروع کریں اور سماج سے اس کا خاتمہ کیا جاسکے۔بعض افسانہ نگار کسی واضح مقصد کے لئے افسانے تخلیق کرتے ہیں۔جیسے ترقی پسند افسانہ نگاروں نے ایک مقصد کے حصولیابی کے لئے افسانے تخلیق کیے۔ان کا مقصد اجتماعی زندگی کو بہتر بنانا تھا۔وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔جبکہ جدیدیت کے زیراثر لکھنے والوں کا نقطہ نظر ان کے برعکس تھا۔مثال کے طور پر افسانہ نگار غریبی کی عکاسی اس طریقے سے کرتا ہے کہ قاری کو غریبی سے نفرت اور غریبوں سے ہمدردی پیدا ہو جائے۔اسی طرح سماج میں ہونے والی بدکاریوں پر ایسے افسانے تخلیق کرتے ہیں کہ انہیں پڑھ کر ہمارے دل میں ان سے نفرت پیدا ہو جائے۔فنکار حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔اس کا ایک واضح نقطہ نظر ہوتا ہے۔لیکن ایک بڑے فن کار کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کو تخلیق میں کھل کر واضح نہیں کرتا۔یہی اس کا کمال ہے۔

آنند لہر ایک حساس طبیعت کے مالک تھے اور بقول جگن ناتھ آزاد صاف ذہن کے مالک تھے۔اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنے آپ کو کسی خاص تحریک یا رجحان تک محدود نہیں رکھا۔روایت سے بغاوت کرتے ہوئے افسانے لکھے ان معنوں میں وہ جدیدیت پسند نظر آتے ہیں لیکن بہت جلد اس کو ترک کر کے انہوں نے معاشرے کی اصلاح کے لیے ادب تخلیق کرنا شروع کیا۔اپنے افسانوں میں اجتماعی زندگی کے مسائل کو پیش کیا۔اپنے سماج سے جڑے مسائل کو پیش کیا۔وہ حالات کا ماتم نہیں کرتے بلکہ ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ان کے افسانے پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ ادب برائے زندگی کے قائل تھے۔گو ان کے افسانوں سے کوئی مخصوص نقطہ نظر واضح نہیں ہوتا تاہم مختلف سماجی مسائل کو جس طرح سے انہوں نے پیش کیا ہے۔قاری پر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور واضح ہو جاتا ہے۔جیسا کہ افسانہ

''سنہرا کفن''، میں انہوں نے غربت کی عکاسی اس طرح کی ہے کہ قاری کو غربت سے نفرت اور مفلسوں سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔اسی طرح افسانہ'' یہ سرحدیں'' پڑھ کر ہمارے دل میں سرحدوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔سرحدوں پر انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔سرحدوں کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کے مسائل سے وہ بخوبی واقف تھے۔لوگوں پر ہونے والے ظلم و جبر کو انہوں نے قریب سے دیکھا تھا۔اسی لئے آنند لہر اپنی تخلیقات میں سرحدوں کی مذمت کرتے ہوئے اور ان کے خاتمے کے لئے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔یہاں ان کا نقطہ نظر سرحدوں کا خاتمہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔افسانہ'' اب تھانہ چل پڑے گا''میں مصنف کا نقطہ نظر سماج سے رشوت کا خاتمہ ہے۔زیر بحث افسانے میں بڑی خوبصورتی سے رشوت خوری کی عکاسی کی گئی ہے۔جس سے ان کا نقطہ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ سماج سے رشوت کا خاتمہ اور رشوت خوروں سے دوری اختیار کرنا ہے۔افسانہ'' تندور، جسم بستی، چند لمحے اور گوتم بدھ سڑک میں آنند لہر کا نقطہ نظر سماج میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا خاتمہ اور ان کے حقوق کی ادائیگی ہے۔اسی طرح ان کے افسانے ووٹ بنک اور موقع کو اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مصنف کا نقطہ نظر لیڈروں کے ہاتھوں ہونے والے عوامی استحصال کا خاتمہ ہے۔افسانہ بیراگن، کئی رنگ اور اس روز میں آنند لہر کا نقطہ نظر خوشگوار ازدواجی زندگی ہے۔مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو آنند لہر کے افسانوں کا مقصد مختلف سماجی مسائل کا حل اور انسانی زندگی کی حقیقتوں کی پہچان نظر آتا ہے۔

### وحدت تاثر

وحدت تاثر کو افسانے کی اساس کہا جاتا ہے۔افسانے میں وحدت تاثر کا ہونا ضروری ہے۔یہی وہ وصف ہے جو افسانے کو ناول سے الگ کرتا ہے۔ناول انسانی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے جبکہ افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو پیش کرتا ہے۔افسانہ مختصر ہوتا ہے اسے ایک ہی نشست میں ختم کیا جاسکتا ہے۔وحدت تاثر کے بارے میں بعض لوگوں نے مخالفت بھی کی کہ یہ افسانے کے لیے ضروری نہیں۔اگر انسانی زندگی میں انتشار اور بکھراؤ ہے تو افسانے میں یہ کیفیت کیسے پیدا کی جاسکتی ہے۔بہر حال پھر بھی یہ افسانے کا لازمی جز ہے۔وحدت تاثر سے مراد ہے کہ کہانی میں ایک سی کیفیت رہے۔یعنی شروع سے آخر تک ایک سا تاثر قائم رہے۔یہ نہ ہو کے شروع میں خوشی کی کیفیت ہو اور تھوڑا آگے بڑھ کر غم کی کیفیت طاری ہو جائے۔آنند لہر کے افسانوں میں وحدت تاثر کی بہترین مثالیں ملتی ہیں۔اگر چہ ان کے بعض افسانے ایسے بھی ہیں جن میں منتشر واقعات کو پیش کیا گیا ہے۔جیسے ان کی علامتی اور

تجریدی کہانیوں کا اگر ہم ذکر کریں تو ان میں اس کا فقدان نظر آتا ہے۔تاہم ان کے علاوہ اکثر و بیشتر کہانیوں میں وحدت تاثر کی فضا قائم رکھنے میں آنند لہر کامیاب نظر آتے ہیں۔افسانہ زندگی ،ہتھیار ،ایک اور ہجرت، بیراگن، عشق کی ہار، پھول والی، رام سنگھ کی خودکشی اور چھوٹے لوگ اس کی عمدہ مثال ہیں۔

## منظر نگاری

منظر نگاری سے مراد افسانے میں پیش آنے والے مختلف حالات و واقعات کی تصویر کشی کرنا ہے۔منظر نگاری کا تعلق فنکار کی حساس طبیعت اور اس کی زبان و بیان پر دسترس سے ہے۔فنکار جتنا حساس ہوگا اور جتنی زبان پر اسے دسترس ہوگی، اس فن میں اتنی کامیابی حاصل کرے گا۔افسانے میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنے کے لئے خوبصورت منظر نگاری ضروری ہے۔افسانے میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھنا فنکار کے لئے ضروری ہے اور یہ تبھی ممکن ہے کہ جب وہ کسی واقع یا منظر یا کسی کردار کی منظر کشی فنی مہارت سے کرے گا۔منظر کشی کے لیے لازمی ہے کہ جس چیز جگہ، واقعہ یا کردار کی منظر نگاری کی جارہی ہو اس کا نقشہ اس انداز سے کھینچا جائے تاکہ اس کی جیتی جاگتی تصویر قاری کی نظروں کے سامنے پھر جائے اور قاری اسے پڑھتے ہوئے محسوس کرے کہ وہ خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

آنند لہر کے افسانوں میں منظر نگاری کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔اگر چہ چند افسانے ایسے بھی ہیں جو فنی نقطہ نظر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تاہم بہت سارے ایسے افسانے ہیں جن میں مختلف حالات و واقعات کی تصویر کشی کرتے ہوئے آنند لہر نے فنی مہارت دکھائی ہے۔لہر کو زبان و بیان پر دسترس حاصل تھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ افسانوں میں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔افسانہ پھول والی میں ایک لڑکے کے حسن کی تصویر کشی یوں کی گئی ہے۔

> ’’گلاب کالج میں پڑھتا تھا ،خوبصورت تھا اس کی جوانی پھولوں کی طرح کھلی ہوئی کوئی اور عمر کے درخت کے اوپر پندرہ سولہ برس کی خواہشوں کی شاخیں، امیدوں کی خوشبوؤں کو بکھیر رہی تھیں۔گلاب کا وہاں آنا معمول بن گیا۔کالج کی کتابوں سے لفظوں کی خوشبو غائب ہوگئی لگا کے ہر کتاب کے اندر چناب بہہ رہا ہے اور بچے کچے گھروں کی

کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔'' ۸۷؎

افسانہ ''جسم بستی'' میں ان لڑکیوں کی کہانی بیان کی ہے جو سماج اور حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہیں اور ہمارے سماج سے تعلق رکھنے والے ہر طرح کے لوگ ان کے جسم کو اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں۔ کوٹھے پر جسم بیچنے والی ان لڑکیوں کی زندگی اور کوٹھے کی منظر کشی یوں کی ہے۔

''مگر ثریا کا بدن ہر راز کو جانتا تھا اور پھر کوٹھے پر جسم بیچتی یہ لڑکیاں بھی ماؤں کی جنمی تھیں۔ راکھیوں کے رشتوں میں بھی کبھی بندھی تھیں۔ کھلی ہواؤں میں بھی کبھی انھوں نے سانس لی تھی۔ باعزت جینے کی خواہش ان کے دل سے ابھی ختم نہ ہو سکی تھی۔'' ۸۸؎

افسانوی مجموعہ ''کورٹ مارشل'' میں شامل افسانہ ''گوتم بدھ سڑک'' میں بھی منظر نگاری کی بہترین مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ زیر بحث افسانے میں ایک ایسی لڑکی کی زندگی کی منظر کشی کی گئی ہے جو غریبی کی وجہ سے اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اپنے نفس کی آگ بجھانے کے لئے بدکاری کے اڈے پر جسم کا سودا کرتی ہے۔ اس منظر کو آنند لہر نے یوں پیش کیا ہے۔

''صاحب ہمارا کام کم ہو گیا ہے کیونکہ چھوٹے آفیسروں کے گھروں میں بڑے آفیسروں کا آنا جانا ہے ترقی کے لئے اور تبادلوں کے لئے اور چھوٹے آفیسروں کے گھروں میں ان سے چھوٹے آفیسروں کا ۔سب جگہوں پر ایسا ہی ہے۔ نہ لائسنس کی ضرورت اور نہ ہی پولیس کو مہینہ دینا اور پھر آپ اس اس رکشے والے کو دیکھ رہے ہو نا''

''ہاں'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کے جانے کے بعد آئے گا اور کہے گا کہ آپ اس کے گھر کہیں اور ادھر وہ پولیس والے ہیں کہ ہفتہ بھی لیتے ہیں اور جسموں کو بھی نچوڑ تے ہیں۔'' ۸۹؎

افسانہ ''کلفیاں'' ایک غریب خاندان کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ جس کی کفالت دھنیا کرتا ہے جو

کلفیاں بیچ کر اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے۔ مفلسی کی وجہ سے بڑے لوگوں کے استحصال کا شکار ہوتا ہے۔ اس کی غریبی اور بے بسی کی وجہ سے اس کی بچیوں اور بیوی کو ہر کوئی غلط نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنی عیش کا سامان سمجھتا ہے۔ دھنیا کی بیوی اور بچیوں پر سماج کے ہوس پرست لوگوں کی ہوس بھری نگاہوں کی منظر کشی آنند لہر نے بڑے خوبصورت انداز میں یوں کی ہے۔

''بڑی لڑکی پر جوانی کی دہلیز پر ہے بہاری کے لڑکے جگو کی نظر ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نظروں سے اسے چبانا چاہتا ہے اور کپڑے اتارنے کا انتظار کرنے کا بھی اس کے پاس وقت نہ ہے۔ دوسری لڑکی پر بابو مٹھائی والے کے لڑکے بسنت کی نظر ہے جو سانپ کی طرح اس کے جسم پر رینگنا چاہتا ہے اور اس کے انگ انگ کو ڈسنا چاہتا ہے۔ وہ لڑکی ابھی لڑکپن کو چھوڑ کر آگے بڑھنے ہی والی ہے۔ اس کی بیوی پر گلو پان والے کی نظر ہے جو پان کی طرح کھا کر اسے چبانا چاہتا ہے۔'' ۹۰

اسی طرح ایک اور افسانہ ''بیراگن'' میں لہر نے ایک دوشیزہ کے حسن کی تصویر کشی بڑی مہارت سے یوں کی ہے۔

''وہ ناچتی تو لگتا کہ وہ نہیں بلکہ گھنگھرو ناچ رہے ہیں۔ بات کرتی تو لگتا کہ لفظ اس کے منہ سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ دیکھتی تو لگتا کہ نظارے اس کی آنکھوں کے ذریعے دیکھنا چاہتے ہوں۔'' ۹۱

افسانہ ''اپنا گھر'' میں لہر نے ایک ایسے مرد کی کہانی پیش کی ہے جو اپنی خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر دوسری عورتوں میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اس کی بیوی فرماں بردار اور خوبصورت ہوتی ہے لیکن اسے اپنی بیوی کی خوبصورتی نظر نہیں آتی۔ کچھ عرصہ ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد رسوائی کا شکار ہو کر وہ بیوی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی اپنی بیوی ہی سب عورتوں سے زیادہ حسین اور وفادار ہے۔ اس کی بیوی کی خوبصورتی کا نقشہ آنند لہر نے یوں کھینچا ہے۔

''اس کے ڈھکے ہوئے بدن کے اندر پھولوں کے باغ ہیں۔ اس کی زلفوں کے خموں میں دنیا کی آرام

گاہیں ہیں۔اس کی زلفوں کا ایک ایک بال قیمتی ہے۔اس کے گھر سے ایک خوشبو آتی ہے مگر بد قسمتی سے اس نے کبھی بھی اس خوشبو کو نہ سونگھا ہے۔راجہ کو اپنا گھر سب سے خوبصورت نظر آیا۔‘‘

اس کے علاوہ بھی بہت سارے افسانوں میں منظر نگاری کی خوبصورت مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں لیکن طوالت کے باعث یہاں چند ایک پیش کرنا ہی مناسب ہے۔اس لئے مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنند لہر کے افسانوں میں منظر نگاری کی عمدہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فن منظر نگاری پر عمدہ دسترس رکھتے تھے۔

## آغاز واختتام

آغاز اور اختتام پر بھی افسانے کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہوتا ہے۔خاص کر آج کے دور میں جب اردو پڑھنے والوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔داستانوں کا رواج تو ختم ہو گیا اور لوگوں کی مصروفیات کا یہ عالم ہے کہ ناول پڑھنے کے لئے بھی ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ایسے میں صرف مختصر افسانہ بچتا ہے۔افسانے میں قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے اس میں تاثر پیدا کرنا ضروری ہے۔جہاں تک آغاز وانجام کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ضروری ہے کہ افسانے کا آغاز ایسا کیا جائے گا تا کہ دیکھنے کے ساتھ ہی قاری فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔اگر آغاز پر اثر ہو گا تو وہ قاری کو پورا افسانہ دلچسپی سے پڑھنے پر آمادہ کرے گا۔افسانہ نگار کو یہ ہنر ضرور آنا چاہئے تا کہ وہ افسانے سے قاری کی توجہ کو ہٹنے نہ دے۔بلکہ ہر لحظہ یہ تجسس برقرار رہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔اختتام کی جہاں تک بات ہے تو افسانے کا اختتام اس طرح کرنا چاہئے تا کہ افسانہ کاغذ پر ختم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ قاری کے ذہن میں چلنا شروع ہو جائے۔افسانہ قاری پر ایک خاص اثر چھوڑے اور جب کہانی ختم ہو تو پڑھنے والا مدتوں اس کی گرفت سے نہ نکل سکے۔

آنند لہر نے اپنے افسانوں کا آغاز اور انجام بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ان کے افسانے بہت مختصر ہیں۔افسانوں کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ قاری فوراً اس طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور افسانے کو آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔افسانوں کا شروعاتی اقتباس پڑھ کر قاری کے اندر وہ تجسس پیدا ہو جاتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔جیسا کہ افسانہ ’’سرحد کے اس پار‘‘ کی اگر بات جائے تو اس افسانے کا آغاز سرحد کے دونوں طرف کے دو گھروں کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح کیا ہے کہ قاری کو لگتا ہے کہ افسانے میں آگے کچھ خاص ہونے والا ہے

اور یہ تجسس افسانے کے اختتام تک برقرار رہتا ہے اور آخر میں افسانہ ایک پیغام دے کر ختم ہوتا ہے۔ افسانے کی شروعات آنند لہر نے یوں کی ہے۔

''دونوں طرف وہ دو گھر تھے اور بیچ میں ایک سرحد۔ دونوں گھروں میں آرزوئیں تھیں، خواہشیں تھیں، امنگیں تھیں۔ دونوں طرف کے لوگ ایک ہی طرح ہنستے تھے ایک ہی طرح روتے تھے۔ لڑکیاں بھی ایک ہی انداز سے جوان ہوئی تھیں۔ بھوک بھی ایک ہی ڈھنگ سے لگتی تھی اور پیاس بھی ایک ہی طریقے سے۔'' ۹۲

افسانے کا پہلا ہی جملہ قاری کو اپنی طرف راغب کر لیتا ہے۔ دونوں طرف وہ دو گھر تھے۔ یہاں لہر نے دو گھروں کا ذکر چھیڑا ہے لیکن یہ بات واضح نہیں کی کہ ان گھروں میں کیا تھا اور یہی راز افسانے میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ جس کے بارے میں جاننے کے لیے قاری دلچسپی سے افسانہ پڑھنا شروع کرتا ہے۔ افسانے کے پہلے ہی جملے سے لگتا ہے کہ آگے کچھ خاص ہونے والا ہے۔ اور یہی جستجو قاری کو افسانہ آخر تک پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی طرح ایک اور افسانہ ''جسم بستی'' بھی قابل ذکر ہے۔ جس میں ایک غریب اور بے بس لڑکی کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ جو مفلسی کی وجہ سے اپنا پیٹ پالنے کے لیے جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس افسانے کا آغاز بھی افسانہ نگار نے اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ پہلا ہی جملہ پڑھنے سے قاری کی دلچسپی افسانے کے مرکزی کردار ثریا کے ساتھ بڑھ جاتی ہے اور وہ کہانی ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ افسانے کا آغاز مصنف نے یوں کیا ہے۔

''ثریا بائی اپنے جسم کی تجارت سے تنگ آ گئی تھی۔ کئی برس بیت گئے تھے اسے ایسا کرتے ہوئے یا یوں کہا جائے کہ اب جسم بھی اوب گیا تھا۔ ہر روز سج دھج کر تیار ہونا ایک ہی طرح کے لوگوں کا آنا ایک ہی طرح کی باتیں سننا اور پھر ایک ہی طرح سے سونا۔ رات چاندنی ہو یا اندھیری، باہر بارش ہو یا برف باری مگر اس کی آنکھوں کے اندر کسی تبدیلی کا انتظار بس گیا تھا۔ بجھی بجھی سی آنکھیں۔ اسے لگتا کہ ان آنکھوں کو چھوڑ دے اور کسی اور چیز سے دیکھنا شروع کر دے۔'' ۹۳

افسانہ ''اب تھانا چل پڑے گا'' رشوت خوری کے موضوع پر محیط ہے۔جس میں رشوت خوری کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ پولیس والے لوگوں کے کفن تک کو معاف نہیں کرتے اور لوگ اپنی مردہ بیٹیوں کے کفن بیچ کر پولیس کو رشوت دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔جس سے ان کے جسم ننگے ہو جاتے ہیں۔لہرنے ''اب تھانہ چل پڑے گا '' کے آغاز میں لڑکیوں کے جسم ننگا ہونے کا ذکر اس طرح چھیڑا ہے کہ قاری فوراً متوجہ ہو جاتا ہے اور اس تجسس کے ساتھ افسانے میں آگے بڑھتا ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے،لڑکیوں کے جسم ننگے کیوں ہیں۔وہ اس بات کو جاننے کے لیے بڑی دلچسپی سے افسانہ پڑتا ہے جبکہ افسانے کے آخر میں جا کر یہ راز قاری پر منکشف ہوتا ہے۔افسانے کا آغاز اس طرح سے کیا گیا ہے۔

''شولہ پور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو اس بات کے لئے مشہور ہے کہ
یہاں کی لڑکیوں کے جسم ننگے ہیں گو انہوں نے کپڑے پورے پہنے
ہوئے ہیں۔حالانکہ یہاں پر کپڑے کی مل بھی ہے اور پولیس کا ہیڈ
کوارٹر بھی مگر اس کے باوجود یہاں کا ہر نوجوان جرم کرتا ہے۔'' ۹۴

پولیس دراصل عوام کی سرکشا کے لئے تائنات کی جاتی ہے لیکن رشوت کے لیے وہ ہر ناجائز کام کرنے والے کی تائید کرتے ہیں اور سماج میں لوگوں کو بدکاریوں پر آمادہ کرتے ہیں تاکہ ان سے رشوت بٹوری جاسکے۔خوبصورت آغاز کے طور پر ان کا ایک اور افسانہ ''انصاف'' بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔جس کا آغاز آنند لہر نے بڑے خوبصورت انداز میں کچھ اس طرح کیا ہے۔

''ہر طرف شور مچ گیا کہ سزا ہو گئی ہے۔سارے میڈیا والے پریس
والے دوڑے۔یہ سزا اسے بلاتکار والے مقدمے میں ہوئی تھی۔وہ
بلاتکار جو کام دیو نے تقریباً سترہ برس پہلے کیا تھا مگر آج سماج میں
سامنے آیا تھا بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ اچھا ہوگا کہ سماج کے پیٹ میں
رہنے کے بعد سامنے آیا تھا اور پیدا ہوا تھا۔'' ۹۵

خوبصورت آغاز کے ساتھ ساتھ وہ افسانوں کو بڑی خوبصورتی سے اختتام کرنے میں بھی کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے افسانے سبق آموز ہوتے ہیں۔جو کوئی نہ کوئی قاری پر تاثر چھوڑ کر اور کوئی نہ کوئی سوال چھوڑ کر ختم ہوتے

ہیں۔افسانے کاغذ پر ختم ہونے کے ساتھ ہی بات ختم نہیں ہوجاتی بلکہ وہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے کاغذ پر ختم ہونے کے ساتھ ہی قاری کے ذہن میں چلنا شروع ہوجاتے ہیں۔اس ضمن میں چند افسانوں کے اختتامی اقتباس بطور مثال پیش کرتا ہوں ملاحظہ کریں۔

خوبصورت اختتام کے طور پر افسانہ ''تندور'' قابل ذکر ہے۔جس میں عورتوں کی بے بسی اور سماج کے مردہ ضمیر مردوں کی عیاشی اور ہوس کی تسکین کے لیے عورتوں کے استحصال کو پیش کیا گیا ہے۔ہمارے سماج میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو دوسروں کے کسی گناہ سے نفرت کر رہے ہوتے ہیں لیکن خود اس میں شامل ہوتے ہیں۔دوسروں کا استحصال کر رہے ہوتے ہیں لیکن بظاہر سماج میں ان کے ساتھ ہمدردی جتلاتے ہیں۔جن کی نقاب کشائی پر افسانے کا اختتام یوں کیا گیا ہے۔

> ''عورت ذات ہوتی ہی ایسی ہے گلی میں بات کرنے والے شخص کی
> آواز دیوار سے ٹکرائی اور اس عورت کے کانوں میں گئی جو یہ دعا کر رہی
> تھی۔اللہ مجھے اب کی بار لڑکا دینا۔پھر اس نے دیکھا کہ سماج کے بڑے
> بڑے ٹھیکیدار اس تندور کو جلائے رکھنے میں مصروف ہیں اور ان کی
> بیچارگی کا ماتم بھی کر رہے ہیں جنہیں اس تندور میں جلایا جا رہا ہے۔''۹۶

ایک حساس قاری کے لیے اس سے زیادہ متاثر کن اور فکر انگیز بات کیا ہوسکتی ہے کہ ہمارا سماج اس قدر گر چکا ہے کہ عورتیں بچیوں کو جنم دینا ہی نہیں چاہتی کیونکہ بچیاں ہمارے سماج میں محفوظ نہیں ہیں۔عورت کے لیے سماج میں جگہ اور عزت بچی ہی نہیں۔جس کے لیے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

افسانہ'' دادی اماں'' ایک خوبصورت افسانہ ہے۔جس میں دادی کی محبت اور وفاداری کو بیان کیا گیا ہے۔عصر حاضر میں اولاد کے لیے ماں باپ اور اپنے ورثہ کی قدر کم ہوتی جا رہی ہے۔دادی اماں جو اپنے دو پیسر پوتوں کی پرورش بڑے لاڈ پیار سے کرتی ہے یہاں تک کہ جب اسے اپنی موت کے آثار دکھائی دیتے ہیں تو اس وقت بھی بچوں کے لئے اس کی محبت و وفاداری کا مقام بہت بلند ہوتا ہے اور اسی پر افسانہ نگار نے افسانے کا اختتام کیا

ہے۔جس کو پڑھ کر قاری کے دل میں عورت کی عظمت ومحبت اور وفاداری کا جذبہ اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ افسانہ ختم ہونے کے ساتھ ہی اس کے دل پر چھاجاتا ہے۔آنندلہر نے افسانہ ''دادی اماں'' کا اختتام اس طرح کیا ہے۔

> ''کپڑے کچھ دیر کے لئے دھو چکی ہوں ۔سویٹریں دوسرے بڑے ٹرنک میں ہیں راجہ تمہیں کہہ دوں کہ بدلیش جا کر اپنی صحت کا خیال رکھنا اور کھانا بنا پڑا ہے۔جب مجھے جلا کر آنا تو فوراً کھا لینا ۔ بھوکے نہ رہنا۔'' ۹۷

افسانہ ''جج صاحب'' میں ججوں کی بے ایمانی اور رشوت خوری کو بیان کیا ہے۔جج جنہیں انصاف پسند، سچا اور بے باک تصور کیا جاتا ہے۔جن سے لوگوں کو حق اور انصاف کی امید ہوتی ہے۔وہ رشوت خوری اور بے ایمانی کی انتہا کو سر کر چکے ہیں۔ایک انسان جسے ججوں کے بارے میں اس طرح کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا جب وہ یہ سب ان میں دیکھتا ہے تو وہ حیران وپریشان ہو جاتا ہے۔افسانہ جج صاحب کا اختتام بھی آنندلہر نے ایسے ہی ایک جج پر کیا ہے جو ایک عام ملازم نیرج کمار کے پاس اپنی بچی کو امتحان پاس کرنے کی سفارش کرنے کے لئے جاتا ہے۔نیرج کمار جج کے منہ سے یہ غیر متوقع الفاظ سن کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔افسانے کا اختتام لہر نے اس طرح کیا ہے کہ قاری یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں ایک عام انسان کا کیا ہوگا۔افسانے کا اختتام یوں کیا گیا ہے۔

> ''نیرج کمار گھبرا گیا۔اس کو پسینہ آ گیا۔اس نے سمجھا کہ شاید اس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔جج صاحب اور اندر چلے گئے ۔ نیرج جھک کر کھڑا ہو گیا مگر جج صاحب نے اسے صرف اتنا کہا۔'' میری بیٹی کا خیال رکھنا۔۔۔۔''
>
> وہ بے ہوش ہو گیا۔'' ۹۸

مجموعی طور سے دیکھا جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ آنندلہر نے اپنے افسانوں کا آغاز یوں کیا ہے کہ افسانوں کے آغاز دیکھنے کے ساتھ ہی قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور وہ پورا افسانہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اس کے اندر افسانہ پڑھنے کا تجسس پیدا ہو جاتا ہے۔جبکہ افسانوں کا اختتام بھی اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی تاثر قاری پر چھوڑ کر ختم ہوتے ہیں۔کاغذ پر ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ قاری کے ذہن میں چلنا شروع ہو جاتے ہیں

اورقاری کوغور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔اس لیے یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ آنند لہر نے افسانوں کا آغاز اوراختتام بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

## اسلوب وبیان

کہا جاتا ہے کہ مختصر افسانے کا فن غزل کے فن سے بہت ملتا جلتا ہے۔مختصر افسانے میں اسلوب کی بڑی اہمیت ہے۔اس کا کہانی کی مقبولیت اورعدم مقبولیت کا بڑی حدتک واسطہ ہوتا ہے۔افسانے کا فن چونکہ اختصار کا متقاضی ہے۔اس کا کینوس بہت مختصر ہوتا ہے۔اس لئے افسانہ نگار کو کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ باتیں کہنے کا ہنر آنا چاہئے۔افسانے میں کیا لکھنا چاہئے سے زیادہ افسانہ نگار کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا نہیں لکھنا چاہئے۔بے جا طوالت کی یہاں گنجائش نہیں۔ایک ایک لفظ کہانی کو آگے بڑھانے کے لیے مددگار ثابت ہونا چاہئے اور جو نہیں ہے وہ غیر ضروری ہے۔افسانے کا اسلوب موقع کے مطابق ہونا چاہئے۔افسانے کے لئے کہا جاتا ہے کہ زبان سادہ اور رواں ہونی چاہئے۔لیکن سادگی کے ساتھ افسانے میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے دلکشی بھی ضروری ہے۔

جہاں تک آنند لہر کے افسانوں میں اسلوب و بیان کا تعلق ہے تو لہر چونکہ پیشے سے وکیل تھے اس لیے تجزیاتی ذہن رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ وہ مدلل طریقہ اظہار پر قدرت رکھتے تھے۔لہر کے افسانے بہت مختصر ہیں لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی زندگی پر محیط ہیں۔آنند لہر افسانے کے فنی رموز سے خوب واقف تھے۔ان کا اسلوب سادہ اور دلکش ہے۔جو قاری کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔وہ کم لفظوں میں مکمل بات کہنے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ان کے افسانوں میں دوڑتی،ابھرتی،سسکتی،جوجھتی زندگی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کچھ بھی زیب داستاں نہیں بلکہ قاری کو اپنی کہانی لگتی ہے۔آنند لہر نے اپنے افسانوں میں اپنے گردونواح میں جو کچھ دیکھا محسوس کیا اس کو بغیر لاگ لپیٹ کے صفحہ قرطاس پر اتارا ہے۔انور کمال حسینی ان کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ’’ان کا اسلوب رواں اور سادہ ہوتا ہے اور وہ تلخ سے تلخ اظہار برائے راست کر جاتے ہیں۔اس میں ارادی آرائش تو کیا حاشیہ آرائی بھی نہیں ہوتی۔کہا جاسکتا ہے کہ پر تکلف رنگ آمیزی سے دامن بچا کر وہ عام اور بڑھے سیدھے سادے بیان سے کام لیتے ہیں اور کرداروں کے تاریک ذہنوں میں بھٹکنے کے بجائے ان کے رویہ اور عمل کے سہارے

> اپنے افسانوں کی تشکیل کرتے ہیں۔اسی لئے ان کے افسانے زندگی سے قریب ہوتے ہیں اور کردار جیتے جاگتے افراد کی طرح اپنے آس پاس ہی معلوم ہوتے ہیں۔بات کہنے کا دوٹوک انداز ان کی انفرادیت بھی ہے اور ان کی پہچان بھی۔''99

لفظوں کے اعتبار سے ان کے افسانے بہت مختصر ہیں لیکن معنوی لحاظ سے سمندر ہیں۔کم لفظوں میں بھرپور بات کہنا ان کا مزاج تھا۔لہر نے موضوعات کے لحاظ سے اسلوب کا استعمال کیا ہے۔آنند لہر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ سادہ اسلوب میں سنجیدہ مسائل اور فکر انگیز خیالات نہایت دلچسپ انداز میں بیان کرتے ہیں۔وہ زیادہ دیر تک قاری کو الجھائے رکھنا نہیں چاہتے۔کم وقت میں اپنی بات کہہ کر قاری کو سوچنے اور سمجھنے کے لئے وقفہ فراہم کرتے ہیں تا کہ وہ ان کی کہانیوں سے زیادہ دیر تک لطف انداز ہو سکے۔

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنند لہر نے مختلف موضوعات پر افسانے لکھ کر اردو افسانہ نگاری کے باب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔اپنے گردو پیش کے مسائل پر لہر کی گہری نظر تھی۔انہوں نے روزمرہ زندگی کے مسائل کو بڑی ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔لہر کے ہاں موضوعات کی کمی نہیں بلکہ تنوع پایا جاتا ہے۔شہری زندگی کے ساتھ ساتھ انہوں نے دیہاتی زندگی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ہمارے سماج سے جڑے چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔سیاسی اور سماجی موضوعات کو انہوں نے خوش اسلوبی سے برتا ہے۔سماج میں ہو رہی برائیوں پر سے پردہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ان کے افسانوں میں جہاں مظلوموں، بے بسوں اور مفلسوں کا بیانیہ دیکھنے کو ملتا ہے وہیں سماج میں بھیڑیا صفت انسانوں کے چہروں سے پردہ اٹھانے کی بھی بھرپور سعی کی گئی ہے۔ہمارے سماج سے جڑے مسائل کو سادہ اور سلیس اسلوب میں بالکل فطری کرداروں کے سہارے حقیقی مکالموں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ان کے افسانے مختلف سماجی برائیوں کے خلاف قاری کو صدا بلند کرنے کی تحریک بخشتے ہیں۔وہ حالات کا ماتم نہیں کرتے بلکہ ان کا حل تلاش کرنے پر آمادہ کرتے ہیں۔اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آنند لہر کے افسانے اردو افسانہ نگاری کے باب میں ایک قابل قدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں آنند لہر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔

## حوالہ جات


۱ نیاز فتح پوری، اسباق، پونہ، مہاراسٹر، اکتوبر، نومبر، دسمبر۲۰۱۳، ص۔۱۶

۲ آنند لہر، سرحد کے اس پار، سیمانت پرکاشن نئی دہلی، ۲۰۰۱، ص۔۹

۳ فدا کشتواڑی، آنند لہر شخصیت اور فن، اردو نیشنل ڈیولپمنٹ سوسائٹی، کشتواڑ، ص۔۱۳۸

۴ آنند لہر، انحراف، ملک بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۲، ص۔۴۔۵

۵ ایضاً، ص۔۷

۶ نذیر فتح پوری، اسباق، پونہ، مہارشٹر، اکتوبر، نومبر، دسمبر۲۰۱۳، ص۔۱۸

۷ آنند لہر، بٹوارہ، اردو بک سوسائٹی دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۹، ص۔۱۳

۸ آنند لہر، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۵، سرورق

۹ آنند لہر، سرحد کے اس پار، سیمانت پرکاشن دریا گنج نئی دہلی، ۲۰۰۱، ص۔۱۵

۱۰ ایضاً، ص۔۱۲

۱۱ ایضاً، ص۔۱۵

۱۲ آنند لہر، بٹوارہ، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۹، ص۔۱۴

۱۳ ایضاً، ص۔۲۷

۱۴ ایضاً، ص۔۴۷

۱۵ آنند لہر، سرحد کے اس پار، سیمانت پرکاشن نئی دہلی ۲۰۰۱، ص۔۵۱

۱۶ ایضاً، ص۔۵۳

۱۷ ایضاً، ص۔۶۶

۱۸ ایضاً، ص۔۶۷

۱۹ ایضاً،ص۔۶۸

۲۰ ایضاً،ص۔۱۷

۲۱ ایضاً،ص۔۷۲

۲۲ آنندلہر،کورٹ مارشل،مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں،۲۰۰۵،ص۔۶۶

۲۳ ایضاً،ص۔۱۷

۲۴ ایضاً،ص۔۷۸

۲۵ آنندلہر،ص۔۱۴۵

۲۶ آنندلہر،سریشٹانے بھی یہی لکھا ہے،روشن پرنٹرس نئی دہلی،۲۰۱۵،ص۔۱۰۶

۲۷ آنندلہر،کورٹ مارشل،مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں،۲۰۰۵،ص۔۴۴

۲۸ ایضاً،ص۔۴۹

۲۹ ایضاً،ص۔۵۷

۳۰ آنندلہر،بٹوارہ،اردو بک سوسائٹی نئی دہلی،۲۰۰۹،ص۔۱۰۸

۳۱ آنندلہر،سرحد کے اس پار،سیمانت پرکاشن نئی دہلی،۲۰۰۱،ص۔۵۸

۳۲ آنندلہر،کورٹ مارشل،مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں،۲۰۰۵،ص۔۱۷

۳۳ ایضاً،ص۔۱۸

۳۴ آنندلہر،سریشٹانے بھی یہی لکھا ہے،روشن پرنٹرس نئی دہلی،۲۰۱۵،ص۔۹۷

۳۵ ایضاً،ص۔۱۳۹

۳۶ ایضاً،ص۔۱۲۵

۳۷ ایضاً،ص۔۱۳۲

۳۸ ایضاً،ص۔۱۳۵

۳۹ آنندلہر،بٹوارہ،اردو بک سوسائٹی نئی دہلی،۲۰۰۹،ص۔۱۴۴

۴۰ ایضاً،ص۔۱۴۵

۴۱ آنندلہر، سریشٹا نے بھی لکھا ہے، روشن پرنٹرس نئی دہلی، ۲۱۰۵، ص۔ ۲۸

۴۲ آنندلہر، بٹوارہ، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۹، س۔ ۱۷۹

۴۳ ایضاً، ص۔ ۱۷۹

۴۴ ایضاً، ص۔ ۶۵

۴۵ آنندلہر، کورٹ مارشل، مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں، ۲۰۰۵، ص۔ ۱۳۰

۴۶ آنندلہر، بٹوارہ، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۹، ص۔ ۱۰۶

۴۷ ایضاً، ص۔ ۱۱۷

۴۸ آنندلہر، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، ۲۰۱۵، ص۔ ۸

۴۹ ایضاً، ص۔ ۱۰

۵۰ ایضاً، ص۔ ۴۹

۵۱ ایضاً، ص۔ ۵۰

۵۲ آنندلہر، بٹوارہ، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۹، ص۔ ۹۴

۵۳ ایضاً، ص۔ ۹۴

۵۴ ایضاً، ص۔ ۹۵

۵۵ آنندلہر، بٹوارہ، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۹، ص۔ ۴۸

۵۶ ایضاً، ص۔ ۵۱

۵۷ بٹوارہ، ص۔ ۱۷۴

۵۸ ایضاً، ص۔ ۱۷۵

۵۹ آنندلہر، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، روشن پرنٹرس نئی دہلی، ۲۰۱۵، ص۔ ۷۴

۶۰ ایضاً، ص۔ ۷۴

۶۱ آنندلہر، انحراف، ملک بک ڈپو نئی دہلی، ۲۰۰۲، ص۔ ۲۳

۶۲ آنندلہر، سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، روشن پرنٹرس نئی دہلی، ۲۰۱۵، ص۔ ۵۲

۶۳ ایضاً،ص۔۵۴

۶۴ ایضاً،ص۔۶۲

۶۵ آنند لہر،بٹوارہ،اردو بک سوسائٹی نئی دہلی،۲۰۰۹،ص۔۱۳۳

۶۶ ایضاً،ص۔۱۳۵

۶۷ آنند لہر،سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے،روشن پرنٹرس نئی دہلی،ص۔۴۱

۶۹ ایضاً،ص۔۴۲

۷۰ ایضاً،ص۔۴۲

۷۲ ایضاً،ص۔۴۳

۷۳ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی،ص۔۵

۷۴ فدا کشتواڑی،آنند لہر شخصیت اور فن،ص۱۰۲

۷۵ وقار عظیم،

۷۶ آنند لہر،سرحد کے اس پار،سیمانت پرکاشن نئی دہلی،۲۰۰۱،ص۔۵۵

۷۷ ایضاً،ص۔۷۰

۷۸ آنند لہر،بٹوارہ،اردو بک سوسائٹی،نئی دہلی،۲۰۰۹،ص۔۲۲

۷۹ ایضاً،ص۔۲۵

۸۰ آنند لہر،سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے،۲۰۱۵،ص۔۱۳۵

۸۱ ایضاً،ص۔۶۲

۸۲ آنند لہر،انحراف،ملک بک ڈپو نئی دہلی،۲۰۰۲،ص۔۱۱

۸۳ ایضاً،ص۔۵۸

۸۴ وقار عظیم،ص۔۱۷۹

۸۵ آنند لہر،انحراف،ملک نک ڈپو نئی دہلی،۲۰۰۲،ص۔۵

۸۶ آنند لہر،سرحد کے اس پار،سیمانت پرکاشن نئی دہلی،۲۰۰۱،ص۔۵۸

۸۷ آنند لہر،کورٹ مارشل، مانوی پر کاشن پنج ترتھی جموں۲۰۰۵ص۔۱۰۰

۸۸ آنند لہر،سرحد کے اس پار، سیمانت پر کاشن نئی دہلی،۲۰۰۱ص۔۵۲

۸۹ ایضاً،ص۔۷۲

۹۰ آنند لہر،کورٹ مارشل، مانوی پر کاشن پنج ترتھی جموں،۲۰۰۵ص۔۸۷

۹۱ آنند لہر،بٹوارہ، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی،۲۰۰۹ص۔۱۰۸

۹۲ ایضاً،ص۔۱۴۴

۹۳ آنند لہر،سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے،۲۰۱۵ص۔۱۳۰

۹۴ آنند لہر،سرحد کے اس پار، سیمانت پر کاشن نئی دہلی،۲۰۰۱ص۔۱۱

۹۵ ایضاً،ص۔۶۹

۹۶ آنند لہر،کورٹ مارشل، مانوی پر کاشن نئی دہلی،۲۰۰۵ص۔۱۳

۹۷ آنند لہر،بٹوارہ، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی،۲۰۰۹ص۔۷۵

۹۸ آنند لہر،سرحد کے اس پار، سیمانت پر کاشن نئی دہلی،۲۰۰۱ص۔۶۸

۹۹ آنند لہر،کورٹ مارشل، مانوی پر کاشن نئی دہلی،۲۰۰۵ص۔۲۵

# باب چہارم
# آنند لہر کی ناول نگاری

# آنند لہر کی ناول نگاری

ناول اطالوی زبان کے لفظ ''ناویلا'' سے نکلا ہے۔ جس کے معنی نیا کے ہیں۔ اردو میں ناول انگیزی زبان کے توسط سے آیا۔ اردو میں داستان کا چلن پہلے سے ہی موجود تھا۔ دراصل ناول داستان ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ قصہ جب تک خوابوں اور خیالوں کی دنیا میں گم رہا، اس میں فوق فطری قصے بیان کئے جاتے رہے تو یہ داستان کہلایا۔ جب خیالوں کی دنیا سے نکل کر حقیقی دنیا میں قدم رکھا تو ناول کے نام سے جانا گیا۔ ناول حقیقی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس میں فوق فطری عناصر کی گنجائش نہیں۔ ناول ایک ایسا قصہ ہے جس میں انسانی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر کشی کی جائے۔ ناول کی تعریف کرتے ہوئے علی عباس حسینی لکھتے ہیں۔

> ''کسی قصے کو دلچسپ بنانے کے لیے اصل حقیقت سے دور ہو جانا ایسی غلطی ہے جس سے لکھنے والے کی قلعی کھل جاتی ہے۔ فطرت میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان سے بہتر مثالیں ہم کو نہیں مل سکتی۔''[1]

حقیقت نگاری ناول کا اصل جز ہے۔ ناول کے لیے لازمی ہے کہ قصہ ہو، نثر میں ہو، زندگی کی تصویر ہو اور اس میں ربط و تسلسل ہو۔ جہاں تک ناول کے موضوعات کا تعلق ہے۔ ناول میں موضوعات کی کوئی قید نہیں۔ ناول نگاروں نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر طبع آزمائی کی ہے۔ اردو زبان میں جہاں تک ناول نگاری کا تعلق ہے تو اردو میں ناول نگاری کا آغاز انیسویں صدی میں ہوا۔ ڈپٹی نذیر احمد کو اردو کا پہلا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کے ناول ''مراۃ العروس'' کو اردو کا پہلا ناول ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں لکھا گیا اس کے بعد رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ نے اس روایت کو آگے بڑھایا۔ جموں و کشمیر میں اگر ناول نگاری کی بات کی جائے تو اس ضمن میں پنڈت سالک رام سالک اور محمد دین فوق کے نام لئے جا سکتے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے بیسویں صدی میں اردو ناول نگاری کی بنیاد ڈالی۔ سالک کا ''داستان جگت گرو'' اور فوق کا ''اکبر اور انارکلی'' اگر چہ ناول کے فن پر کھرے نہیں اترتے تاہم ناول کے نقوش ان میں مل جاتے ہیں۔ اس کے بعد پنڈت نندلال بے غرض نے ''تازیانۂ عبرت'' کے نام سے ایک ناول لکھ کر اس اس صنف کو فراغ

بخشا۔

آزادی کے بعد جموں کشمیر میں ناول نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔اس دوران کئی اہم ناول نگار ابھر کر سامنے آئے۔جنہوں نے اردو ناول نگاری کی طرف خصوصی توجہ دی۔ان ناول نگاروں میں ڈاکٹر برج پریمی، راما نند ساگر، نرسنگھ داس نرگس، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، تیج بہادر بھان، غلام رسول سنتوش، مدن موہن شرما، علی محمد لون، حامدی کاشمیری، نور شاہ، مالک رام آنند، شبنم قیوم، وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ان کے بعد کرن کاشمیری، فاروق رینزو، وجے سوری، جان محمد آزاد اور آنند لہر کے نام قابل ذکر ہیں۔

آنند لہر اگر چہ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں لیکن انہوں نے پانچ ناول لکھ کر اردو ناول نگاری کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ان کے سبھی ناولوں کو ادبی دنیا میں خاطر خواہ پزیرائی حاصل ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کی چند مشہور ومعروف شخصیات نے ان کے ناولوں پر تبصرے بھی کیے ہیں۔آنند لہر نے پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کہ عنوان سے لکھ کر ناول نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ان کا یہ ناول ۱۹۹۷ء میں جموں سے شائع ہوا۔ناول نگار نے ناول کا انتساب کشمیر کی لڑائی میں شہید ہونے والے لوگوں کے نام کیا ہے۔اس ناول کا دیباچہ اردو کے مشہور ومعروف محقق، استاد اور نقاد پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے لکھا ہے۔جس میں انہوں نے آنند لہر کی ادب کے تئیں دلچسپی کا ذکر کرتے ہوئے زیر نظر ناول پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔آنند لہر کا یہ ناول کشمیر کی درد بھری داستان کو بیان کرتا ہے۔۹۵ صفحات پر مشتمل یہ ناول بڑا دلچسپ ہے۔یہ ایک ایسا ناول ہے جس میں آزادی سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کے کشمیر کی عکاسی کی گئی ہے۔زیر بحث ناول میں آنند لہر نے کشمیر کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ناول میں جہاں کشمیر کا حسن نظر آتا ہے وہیں یہاں کی تباہی و بربادی کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔فوجیوں کے ساتھ ساتھ دہشت گردوں اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے فلسفہ حیات کو متاثر کن طریقے سے بیان کیا ہے۔ناول نگار نے مشترکہ تہذیب، ہندو مسلم فسادات، قبائلی حملے، نفرت اور ہجرت جیسے پراگندہ واقعات کو پیش کیا ہے۔ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں کہ۔

> ''اگلی عید سے پہلے سرزمین کشمیر کی ایک درد بھری داستان ہے۔جو مصنف نے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہے۔یہ داستان ہندستان کی آزادی سے شروع ہو کر آج تک پہنچی ہے یعنی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۶ء

تک، سرزمین کشمیر کی یہ درد بھری روداد جونصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے
ایک ایسی روداد ہے جس مین روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کے ساتھ
ساتھ چلتے ہیں ۔کہیں کہیں متصادم بھی ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً کہیں
اندھیری فتح یاب ہوتا اور کہیں روشنی لیکن انجام کار روشنی ہی کامران
ونصرت یاب ہوتی ہے۔''۲

''سرحدوں کے بیچ'' لہر کا دوسرا ناول ہے۔ جو۲۰۰۲ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوکر ادبی دنیا سے متعارف ہوا۔ یہ ۸۰ صفحات پر مشتمل ایک مختصر ناول ہے۔جس کے شروع میں ڈاکٹر سید معصوم رضا کا مضمون'' آنند لہر کا ناول سرحدوں کے بیچ ایک جذباتی تخلیق'' کے عنوان سے درج ہے۔جس میں سید معصوم رضا نے آنند لہر کی ناول نگاری کا ذکر کرتے ہوئے زیر بحث ناول پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔زیر بحث ناول میں لہر نے سرحدوں پر بسنے والے لوگوں کی زندگی اوران کی مشکلات کا ذکر کیا ہے۔لہر چونکہ تمام تر پریشانیوں کا سبب سرحدوں کو مانتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقات میں ہر جگہ سرحدوں کی مذمت کرتے ہوئے ان کے خاتمے کے لئے آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔زیر نظر ناول پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر سید معصوم رضا لکھتے ہیں۔

''آنند لہر نے اس ناول کے ذریعے دودلوں کو جوڑنے والی سرحد کی تمنا
کی ہے یا پھر ایسی کوئی سرحد ہی نہ ہو جس کا دل پر زور چلے۔ان کا یہ
ناول زندگی کی حقیقتوں سے بالکل قریب معلوم ہوتا ہے۔سرحد کا مسئلہ
آزاد ہندستان کا ایک اہم مسئلہ ہے۔''۳

'مجھ سے کہا ہوتا'' آنند لہر کا ایک دلچسپ ناول ہے جو ترتیب کے لحاظ سے تیسرے نمبر پر آتا ہے اور ۲۰۰۵ء میں اردو بک سوسائٹی دریا گنج ،نئی دہلی سے شائع ہوکر داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔ناول کا انتساب لہر نے اپنی چھوٹی بہن ببلی کے نام کیا ہے جو صرف دو برس جی سکی۔ناول کے شروع میں پروفیسر ظہورالدین کا مضمون'' ایک نئی آواز'' شامل ہے۔جس میں پروفیسر ظہورالدین نے آنند لہر کی ناول نگاری کا ذکر کرتے ہوئے ناول'' مجھ سے کہا ہوتا'' پر اپنی خصوصی رائے کا اظہار کیا ہے۔امریکہ کے ہاتھوں عراق کی تباہی کے پس منظر میں لکھے گئے اس ناول میں جنگ وجدل سے ہونے والی تباہ کاریوں ،طاقت کا بے جا استعمال ،انسانی رشتوں کا زوال ،نسلی امتیازات ،غریبوں کا

استحصال اورانسانی کم ظرفی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر کئی سیاسی اور سماجی برائیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس ناول میں کوئی انسانی کردار نظرنہیں آتا۔ناول نگار نے جانوروں اور پرندوں کی گفتگو کے ذریعے انسانی عقل پر طنز کرتے ہوئے انسانی مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔جس کے بارے میں پروفیسر ظہورالدین یوں رقمطراز ہیں۔

’’یہ ناول اگر چہ امریکہ کے ہاتھوں عراق پر نازل ہونے والی تباہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے لیکن یہ ایسے بہت سے انسانی مسائل کا بھی احاطہ کرتا ہے جو آفاقی نوعیت کے ہیں۔‘‘ ۴

’’یہی سچ ہے‘‘ آنندلہر کا چوتھا ناول ہے۔یہ ناول ۲۰۰۸ء میں اردو بک سوسائٹی دہلی سے شائع ہوا۔ناول کا انتساب ان لوگوں کی نظر کیا ہے جو ان کے ادبی قد کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کو عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ناول کے شروع میں سیّد احمد قادری کا لکھا ہوا دیباچہ بعنوان’’یہی سچ ہے کی سچائی‘‘ درج ہے۔جس میں انہوں نے زیرنظر ناول پر اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔اس ناول میں سچائی،رشوت خوری اور بے ایمانی کو آنندلہر فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔یہ ناول ااج کے عہد کی مکمل ترجمانی کرتا ہے۔آج ہر انسان ذہنی انتشار کا شکار نظر آتا ہے۔لہر نے مختلف انسانی مسائل کو پیش کیا ہے اور ان کے نتائج پر بھی نظر دوڑائی ہے۔’’یہی سچ ہے‘‘ کے بارے میں ڈاکٹر سید احمد قادری لکھتے ہیں۔

’’زندگی کے نشیب وفراز ،بدلتے وقت اور حالات،شوائد و الائم ،جذباتی بے کیفی،بے رحم ماحول کی سنگینی،ذات کا درد وکرب،خودغرضی اوراستحصال کے طلاطم میں آنندلہر کا یہ ناول عہد جدید کے فلسفۂ حیات کو موثر کیفیات سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہے۔’’یہی سچ ہے‘‘ در اصل زندگی کی سچائیوں کی بھرپور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔‘‘ ۵

آنندلہر کا آخری ناول’’نامدیوٗ‘‘ کے عنوان سے ہے۔یہ ناول ۲۰۱۲ء میں دہلی سے شائع ہوکر ادبی حلقوں میں مشہور ہوا۔اس ناول میں ناول نگار نے زمانے کی دھند اور زندگی کے نشیب وفراز کو تخلیقی پیکر میں ڈھال کر محبت کے نئے رنگ کو پیش کیا ہے۔ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ مغربی مفکرین کی نقل نہیں کرتے بلکہ اپنے مسائل،اپنے کردار

اور اپنی کائنات کو خلق کرتے ہیں۔

## ناولوں کے موضوعات

ناول کی مختصر تعریف پچھلے صفحات میں آ چکی ہے۔ یہاں ناول کے مختلف عناصر کی روشنی میں آنند لہر کے ناولوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ ناول میں جن چیزوں کا ہونا لازمی ہے یا جن کو ناول کے اجزائے ترکیبی تصور کیا گیا ہے ان میں قصہ، پلاٹ، کردار نگاری، نقطہ عروج، زبان و بیان اور نقطہ نظر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام اجزا کی روشنی میں آنند لہر کے ناولوں کا فنی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

ناول جس عہد میں لکھا جائے اس زمانے کی زندگی اور معاشرت کی سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ جہاں تک لہر کے ناولوں کے موضوعات کا تعلق ہے تو لہر کا تعلق چونکہ جموں و کشمیر سے تھا۔ جموں کشمیر جہاں اپنی خوبصورتی اور رعنائی کی وجہ سے شروع سے ہی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اس کی خوبصورتی کو جہاں شاعروں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا ہے وہیں دوسری طرف کشمیر میں پچھلی کئی دہائیوں سے ہو رہے ظلم و جبر اور سیاسی بدحالی کا منظر نامہ بھی کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ آنند لہر نے کشمیر میں ہو رہے ظلم و جبر، سیاسی بدحالی، ہتھیاروں کی تباہ کاریاں، ہجرت، رشوت خوری، سرحدی زندگی اور بٹوارہ سے پیدا شدہ حالات کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے محبت میں ناکامی، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، بے جوڑ شادی اور اخلاقی پستی جیسے موضوعات کو بھی ناولوں میں پیش کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ بٹوارہ اگرچہ آنند لہر کے دور سے بہت قبل ہو چکا تھا لیکن یہ ایک ایسا دل سوز واقع ہے کہ جب بھی اس کے متعلق سوچا یا پڑھا جائے انسان کا دل دہل جاتا ہے۔ آنند لہر کے ناولوں کے موضوعات کچھ اس طرح سے ہیں۔

''اگلی عید سے پہلے'' ان کا پہلا ناول ہے۔ جس میں انہوں نے کشمیر کی درد بھری داستان کو پیش کیا ہے۔ زیر بحث ناول میں وادیٔ کشمیر سے کشمیری پنڈتوں کی جموں ہجرت اور ان کی باز آبادکاری کا ذکر کیا ہے۔ کشمیر میں پچھلی کئی دہائیوں سے جو حالات بنے ہوئے ہیں وہ کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ ہر طرف ڈر اور خوف کا ماحول ہے۔ بے گناہوں کا قتل عام ہو رہا ہے۔ عورتوں کی عصمتیں لٹ رہی ہیں۔ نوجوانوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلا جا رہا ہے۔ لوگوں کو گھروں میں محصور کر کے ان کی زبانوں کو مقفل کر دیا گیا ہے۔ زیر بحث ناول میں آنند لہر نے آزادی ہند یعنی ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کے کشمیر کی منظر کشی کی ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد کشمیر میں امن و امان کا دور دورہ شروع ہوتا ہے۔ لوگ معمول کے مطابق زندگی جینا شروع کرتے ہیں۔ مشترکہ تہذیب کو فروغ ملتا ہے۔

لیکن کشمیر کی تاریخ ایک بار پھر رخ بدلتی ہے۔ جب سرحد کے اس پار سے قبائیلی کشمیر میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ یہاں کی مشترکہ تہذیب کو بگاڑنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں لیکن کشمیری عوام کا اتحاد ان کی ان سازشوں کو کامیاب نہیں ہو نے دیتا اور وہ بے بس و ناکام ہوکر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ علیحدگی پسند نوجوانوں کا ایک فرقہ ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ حالات کشیدہ ہوتے ہیں۔ قومی یکجہتی کمزور ہونے لگتی ہے۔ ہندو مسلم ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔ بالآخر ۱۹۹۰ء کے آس پاس جب حالات زیادہ کشیدہ ہوجاتے ہیں تو کشمیری پنڈت اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگتے ہیں ور انہیں مجبوراً ہجرت کرنی پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا گھر بار لٹ جاتا ہے، رشتے بکھر جاتے ہیں، برسوں پرانی مشترکہ تہذیب چور چور ہو جاتی ہے، ہندو مسلم اتحاد میں دراڑیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ آنند لہر نے اپنے اس ناول میں انہی حالات کو موضوع بنایا ہے۔ نیز یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جموں و کشمیر کے عوام ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم تھا اور آج بھی ہے لیکن بعض شر پسند عناصر کی وجہ سے کشمیری پنڈت بے گھر ہو گئے۔ جس کا احساس کشمیری مسلمانوں کو آج بھی ہے اور کشمیری مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ واپس آ کر اپنے گھر بسائیں۔ اس لیے زیر بحث ناول کا عنوان ''اگلی عید سے پہلے'' رکھا گیا ہے۔ کیونکہ یہ کشمیری مسلمانوں کا تاثر ہے کہ کشمیری پنڈتوں کا اگلی عید سے قبل گھر بسایا جائے تا کہ صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب پھر زندہ ہو سکے اور ہندو مسلم پھر سے ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوکر معمول کی زندگی جی سکیں۔

''سرحدوں کے بیچ'' آنند لہر کا دوسرا ناول ہے۔ اس ناول میں لہر نے سرحدوں کے وجود اور ان کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ آنند لہر کا تعلق چونکہ جموں کشمیر کے دورافتادہ ضلع پونچھ سے تھا جہاں ہر وقت گولی اور بارود کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ان کا آبائی گاؤں بھی سرحد کے بالکل قریب تھا۔ جہاں سے حالات کے پیش نظر ان کے آبا و اجداد کو ہجرت کرنی پڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آنند لہر نے سرحدی زندگی کو قریب سے دیکھا تھا اور سرحدوں کے آس پاس رہنے والے لوگوں کے مصائب و آلام سے وہ خوب واقف تھے۔ لہر سرحدوں کے سخت مخالف تھے۔ وہ اپنی تخلیقات میں کئی جگہوں پر سرحدوں اور ہتھیاروں کی مذمت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ زیر نظر ناول میں آنند لہر نے سرحدوں کے آس پاس بسنے والے لوگوں کی پریشانیوں اور ان پر ہو رہے ظلم و جبر کا ذکر کرتے ہوئے کئی دیگر سماجی برائیوں کی بھی نقاب کشائی کی ہے۔

ان کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کے عنوان سے ہے۔ یہ ایک علامتی ناول ہے۔ جس میں لہر نے علامتی انداز میں چرند پرند اور جانوروں کو کردار بنا کر ان کی زبانی انسان کی بے حسی، ظلم و بربریت، نفرت، حسد، تنگ نظری، لاعلمی، بداخلاقی اور ناشکری کو بیان کیا ہے نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کو اللہ پاک نے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا تھا لیکن انسان نے اپنی کم ظرفی کی وجہ سے دوسری مخلوقات کا جینا بھی حرام کیا ہوا ہے۔ اپنی نادانی کی وجہ سے انسان نہ صرف انسان کی بربادی بلکہ پرندوں جانوروں اور نباتات کی تباہی کے ذرائع بھی تلاش کر رہا ہے جو کہ اس کی زندگی کا اصل مقصد نہیں تھا۔ قدرت نے جن خوبصورت چیزوں کو انسان کی آسائش کے لئے تخلیق کیا تھا وہ ان سے لطف اندوز ہونے کے بجائے اپنی تباہ کاریوں کے ذریعے تلاش کر رہا ہے اور اس کے کارناموں سے پرندے اور جانور بھی شرمسار ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر ناول میں آنند لہر نے انسان کے انہی افعال کا احاطہ کیا ہے۔ جن کی وجہ سے انسانیت شرمسار ہے۔

آنند لہر کا چوتھا ناول ''یہی سچ ہے'' کے عنوان سے ہے۔ اس ناول میں آنند لہر نے زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں کردار و واقعات کے ارتباط سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ زیرِ نظر ناول میں مختلف سماجی مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جن میں رشوت خوری، غربت، اعلیٰ وادنیٰ کا امتیاز، پاپ و پن، اخلاقی قدریں، جھوٹ اور جہیز جیسی چیزیں شامل ہیں۔ شنکر اور شیو دو بھائیوں کو مرکزی کردار بنا کر زندگی کے دو متضاد پہلوؤں کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ شنکر جو کہ دنیا سے بالکل بے زار اور اگلے جنم میں سورگ کا متمنی ہے اور اسے یقین ہے کہ دنیا میں دکھ درد دیکھنے سے ہی اگلے جنم سورگ ملے گا۔ وہ اپنی دنیاوی زندگی کو بہتر بنانے نیز اپنی بیوی اور بچوں کے حقوق ادا کرنے میں بالکل ناکام ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی بیوی طویل بیماری کی وجہ سے زندگی سے جنگ ہار جاتی ہے اور اس کے بچے بالکل آوارہ ہو جاتے ہیں اور سماج میں بھی اس کی بالکل کوئی قدر نہیں ہوتی۔ جبکہ دوسرا بھائی شیو لوگوں سے رشوت لیتا ہے لیکن اپنی بیوی بچوں کی اچھی تربیت کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک احساس مند پڑوسی اور بااخلاق سماجی رکن ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ بھی اسے بے پناہ قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لہر کا ماننا ہے کہ اگر اس کو اپنے بچوں کا بہتر مستقبل بنانے کے لئے غلط کام انجام دینے پڑیں تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن اس کے بچوں کو اس طرح کے کام انجام نہ دینے پڑیں۔ بالآخر وہ اس میں کامیاب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اعلی عہدوں والے ان لوگوں کو بھی موضوع بنایا ہے جو اپنے عہدے کے غرور اور تکبر کی وجہ سے اخلاقی

قدروں اور رشتوں کے
تقدس کو بھول جاتے ہیں اور دولت کی فراوانی ہونے کے باوجود نہ ہی چین وسکون کی زندگی بسر کر سکتے ہیں اور نہ ہی سماج میں اپنا کوئی معقول مقام بنا سکتے ہیں۔

''نامدیوَ'' آنند لہر کا پانچواں اور آخری ناول ہے۔ زیرِ نظر ناول میں آنند لہر نے انسانی زندگی کے نشیب وفراز کو بیان کرتے ہوئے کئی سماجی مسائل کا ذکر کیا ہے۔ یہ ناول جہاں ایک طرف دو روحوں کی آپسی محبت اور انسانی خود غرضی اور سماجی رسہ کشی کی وجہ سے ان کی محبت میں ناکامی ومحرومی کا بیانیہ پیش کرتا ہے وہیں دوسری طرف انسانی بے حسی ،نفرت ،حسد ،چغل خوری ، بے جوڑ شادی اور عورتوں کے ساتھ سماج میں ہونے والی ناانصافیوں کا احاطہ کرتا ہے۔اس ناول میں بے جوڑ شادی کی وجوہات اوران سے پیدا شدہ حالات کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ محبت کی راہ میں تگ ودو کرنے والوں کی رنگ ونسل ، مذہب وملت اور کئی دیگر سماجی برائیوں کی وجہ سے یاس ومحرومی کا اظہار کیا گیا ہے۔اس ناول کا موضوع وسیع تر معنوں میں محبت کی بازیابی اور کامرانی ہے۔

## قصہ

قصہ یا کہانی ناول کا ہی نہیں بلکہ تمام افسانوی ادب کا لازمی جز ہے۔ دراصل ناول کی بنیاد قصے پر ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ کہانی ناول میں ریڈ کی ہڈی کی طرح ہے۔کسی بھی ناول میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے کہانی پن کا ہونا ضروری ہے تاکہ قاری کے اندر تجسس برقرار رہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ناول میں کہانی کا مقام روح کی طرح ہے۔ناول میں کہانی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں کہ:

> ''ہم سب لوگ یہ جاننے کی خواہش کے معاملے میں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔شہزاد کے شوہر کے مانند ہیں۔ یہ ایک آفاقی عنصر ہے اور یہی سبب ہے کہ کہانی ناول کی روح کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔۔۔ہم میں سے بعض لوگ اور کچھ نہیں جاننا چاہتے ۔ ہمارے اندر ایک تجسس کے سوا اور کچھ نہیں بچتا۔ ہمارے دوسرے ادبی فیصلے مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔''[٦]

یہ بات تو سچ ہے کہ قصہ ناول کے لیے ضروری ہے اور یہ واقعہ یا قصہ کہیں سے بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔لیکن

اس کے بعد ناول میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اس قصے کو ناول نگار کس طرح پیش کرتا ہے۔اس کا انداز بیان کیا ہے نیز ناول نگار کس گہرائی سے پیش کر رہا ہے۔اس کی بناوٹ کیسی ہے اور کس برجستگی سے پیش کیا جا رہا ہے۔یہ سب چیزیں ناول کے قصے کو دلچسپ اور متاثر کن بناتی ہیں۔جن کا خیال رکھنا ناول نگار کے لئے ضروری ہے۔قصے کی اس تعریف کے پیش نظر میں آنند لہر کے ناولوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آنند لہر کا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کشمیر کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔جس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کے کشمیر کے حالات و واقعات کو پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ناول کے انتساب سے ہی ناول کا لب لباب ظاہر ہو جاتا ہے۔ناول کی شروعات آنند لہر نے گولیوں کی آوازوں سے کی ہے جو پچھلے کئی برسوں سے کشمیر کا مقدر بن چکی ہیں۔۱۹۴۷ء میں جب ہندستان آزاد ہوا اس وقت جموں و کشمیر ایک آزاد ریاست تھی۔بٹوارے کے بعد ہندو پاک دونوں ملکوں کی نظریں کشمیر پر ٹک گئیں۔اسی لئے آزادی کے فوراً بعد صوبہ سرحد کے قبائلیوں نے کشمیر میں حملے کرنے شروع کر دیے۔اس وقت کشمیر میں ہر طرف امن وسکون کا دور دورہ تھا اور مشترکہ تہذیب عروج پر تھی۔قبائلیوں نے کشمیر کے عوام پر طرح طرح کے ظلم وستم ڈھانے شروع کر دیے۔وہ کشمیر میں اپنے قدم جمانا چاہتے تھے لیکن کشمیر کے عوام کے پاس اتحاد ایک ایسا ہتھیار تھا جس کے سامنے ان کے تمام حربے بے کار ثابت ہوئے کیونکہ اتحاد کی لاٹھی کے سامنے سارے ہتھیار بے بس ہیں۔یہی وجہ ہے کہ آنند لہر نے اس ناول کی بنیاد اتحاد کے اس نعرے پر رکھی ہے۔''زندہ باد زندہ باد ہندو مسلم سکھ اتحاد''۔کشمیر کے عوام کی باہمی محبت واخوت اور اتحاد کا نقشہ آنند لہر نے ناول میں یوں کھینچا ہے۔

> ''کیپٹن تمہیں معلوم ہے۔ہم یہاں کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے'' تم ہی بتاؤ کیپٹن نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔
>
> ''ایک نعرہ ہمیں کامیاب نہیں ہونے دیتا۔''
>
> ''وہ کیا؟'' کیپٹن نے پوچھا۔
>
> ''وہ نعرہ ہے'' زندہ باد زندہ باد ہندو مسلم سکھ اتحاد'' قبائلی نے جواب دیا
>
> ''یہ بالکل سچ ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔۔۔۔۔۔''اسی نعرے نے تو جناح کو بھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔اور اس نعرے میں گاندھی کو روشنی کی کرن نظر آئی تھی۔'' ۷

قبائلی کشمیر میں ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ بالآخر جب وہ کشمیریوں کے اتحاد کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں اور ان کے تمام تر منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں تب وہ مذہب کی بنیاد پر لوگوں کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے قبائلی رات کو مندر سے شنکھ چوری کر لیتے ہیں تاکہ اس کا الزام مسلمانوں پر لگے اور ہندو مسلم فسادات شروع ہوں۔ قبائلی رات کو مندر سے شنکھ چوری کر لیتے ہیں۔ بدری جو کہ مندر کا پجاری تھا صبح جب دیکھتا ہے کہ مندر سے شنکھ غائب ہے تو بہت پریشان ہوتا ہے۔ جس سے پورے ہندو قبیلے میں پریشانی اور مایوسی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ایسے میں جب مسلمانوں کو خبر ہوتی ہے تو وہ بھی سخت پریشان ہوتے ہیں اور ہندوؤں کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ شنکھ ضرور ڈھونڈ لیا جائے گا۔ عبدل جو کہ اس ناول کا مرکزی کردار ہے اور ناول میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے شنکھ چوری ہونے پر بہت پریشان ہوتا ہے اور ہندوں کو یقین دلاتا ہے کہ ان کا شنکھ ضرور ڈھونڈ لیا جائے گا چاہے اس کے لئے اس کو اپنی جان کا نذرانہ ہی کیوں نہ دینا پڑے۔ مندر سے شنکھ چوری ہونے پر مسلمانوں کے تاثرات کو آنند لہر نے ناول میں یوں پیش کیا ہے۔

> ''شنکھ بدری کا نہیں بلکہ مندر کا ہے۔ مندر اور مسجد کشپ رشی کی اس دھرتی کی وراثت ہیں۔'' عبدل نے کہا۔۔۔۔''یہ شنکھ ضرور ڈھونڈ لیا جائے گا۔ چاہے مجھے اس کے لئے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔''
>
> عبدل نے اپنی بات دہرائی۔
>
> عبدل گاؤں کے گھر گھر گھوما اور پھر اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اعلان کیا۔
>
> ''کوئی بھی شخص آرام سے نہ بیٹھے جب تک شنکھ نہ ملے۔'' [8]

ہر طرح کے ظلم وستم ڈھانے کے بعد جب کشمیر کے عوام کا اتحاد قبائلیوں کو کامیاب نہیں ہونے دیتا تو وہ ناکام ہو کر واپس چلے جاتے ہیں اور ایک بار پھر کشمیر میں خوشی اور امن و بھائی چارے کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ ایک بار پھر لوگ معمول کے مطابق زندگی جینا شروع کرتے ہیں۔ نفرتیں ختم ہوتی ہیں اور ہندو مسلم ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہو کر پھر سے امن وسکون کی زندگی گزارنی شروع کرتے ہیں۔ جس کی منظرکشی آنند لہر نے یوں کی ہے۔

> ''یہ سن کر سب لوگوں نے مل کر کہا۔۔۔۔''اوم نمشوائے ،اللہ

اکبر' عبدل نے نعرہ لگایا۔۔۔۔''زندہ باد زندہ باد ہندو مسلم سکھ اتحاد'
بات جاری رکھتے ہوئے عبدل نے پھر کہا۔۔۔۔۔''قبائلی تو بھگا دیے
گئے ہیں اور ہر طرف امن وامان انگڑائیاں لے رہا ہے۔ یہاں سے دور
کھیر بھوانی کا میلہ لگتا ہے۔ جہاں ہندو پوجا کرتے ہیں اور ایسا کرنے
کے لئے مسلمان انہیں پھول دیتے ہیں۔ وہاں جا کر گہری نیند سونا چاہتا
ہوں۔''۹

قبائلیوں کے جانے کے بعد کشمیر میں امن وامان بحال ہوتا ہے۔ تعمیر وترقی کے کام شروع ہوتے ہیں۔ ہر طرف چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔ مسجدیں نمازیوں سے سجتی ہیں اور مندروں میں پوجا ہونا شروع ہوتی ہے۔ جس کا نقشہ ناول نگار نے یوں کھینچا ہے۔

''ادھر کشمیر میں آزادی کے گلاب نے اپنی خوشبو پھیلانا شروع کر دی۔ اسکول تعمیر ہونے لگے، سڑکیں تعمیر ہونے لگیں۔ مندروں میں پوجا ہونے لگی ۔مسجدوں میں سج دھج کر لوگ نمازیں پڑھنے لگے۔ جھیلوں کے اندر شکارے چلنے لگے۔ ہوائیں جھومتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ تھیٹروں میں ڈرامہ دیکھنے والوں کا رش اور مشاعروں میں واہ واہ کی آوازں نے کشمیر کے قدرتی حسن کو اس طرح سنوارا جس طرح خوبصورت دوپٹے کو کنواری سنوارتی ہے۔''۱۰

قبائلیوں کے جانے کے بعد حالات سازگار ہوتے ہیں۔ لوگوں میں خوف و ہراس کا ماحول کم ہوتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے کشمیر کی تاریخ ایک بار پھر اپنا رخ بدلتی ہے اور حالات کشیدہ ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر خوف و ہراس کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ جب کشمیر کے کچھ نوجوان بغاوت کرتے ہیں اور علٰحدگی پسند تحریک کی شروعات کرتے ہیں۔ حالات بگڑنا شروع ہوتے ہیں۔ ایک بار پھر گولیوں اور بارودوں کی آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ شیر کشمیر کا نعرہ متزلزل ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شکوک وشبہات کا ماحول بنتا ہے۔ برسوں پرانی مشترکہ تہذیب بکھرنا شروع ہوتی ہے اور بالآخر ۱۹۹۰ء میں وادی میں مقیم کشمیری پنڈتوں کو مجبورا

ٰوادی سے ہجرت کرنی پڑتی ہے۔جس سے کشمیری پنڈتوں کی زندگی مفلوج الحالی کا شکار ہوکر رہ جاتی ہے۔مشترکہ تہذیب ختم ہوجاتی ہے۔اتحاد ختم ہو جاتا ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت پیدا ہوتی ہے۔جو وادی کے علاوہ دیگر جگہوں میں بھی پھیلتی ہے۔کشمیر جو ترقی کی راہ پر گامزن تھا تنزلی کے دہانے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ہر طرف بدکاریوں اور بدگمانیوں نے جنم لے لیا۔دہشت گردی کو فروغ ملا۔جس کی منظرکشی آنند لہر نے اس طرح کی ہے۔

''عبدل اسکول کے پاس چلا گیا۔اس نے دیکھا کہ باہر تو اسکول کا بورڈ لگا ہوا ہے۔مگر اسکول کی عمارت ٹوٹی ہوئی ہے۔کچھ نوجوان وہاں پر بیٹھ کر شراب پی رہے ہیں۔وہ تمام لوگ ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں جن کو ان لوگوں نے خود شراب پی کر بہت سی جگہ سے کاٹا ہوا ہے اور چارپائی پر ایک چادر ہے جو بہت سی جگہوں سے پھٹی ہوئی ہے۔۔۔۔عبدل کو یوں لگا جیسے ہندوستان چارپائی ہو اور کشمیر چادر۔'' ۱۲؎

کشمیر میں علحد گی پسند تحریک کے جنم لینے سے جہاں ایک طرف کشمیر میں ہونے والی لڑائی میں لوگوں کا قتل عام ہونے لگا وہیں کشمیر سے ہجرت کرنے والے کشمیری پنڈت جموں میں بے سروسامانی کی زندگی بسر کرنے لگے۔سیکیورٹی فورسز اور علیٰحدگی پسند نوجوانوں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں کئی بے گناہ شہید ہوئے۔ہزاروں لوگ زخمی ہوئے، ظلم وستم اور قتل وغارت عروج پر پہنچ گیا۔ان حالات میں کوئی بھی کشمیریوں کا پرسان حال نہ رہا۔طاقت اور ہتھیار کے بل بوتے پر ہر ناجائز کام جائز بن گیا۔کشمیر کی معصوم عورتوں کی عصمت دری ہونے لگی۔لوگ حالات کے آگے بے بس ہو گئے۔زبانوں کو مقفل کر دیا گیا۔حالات کا ماتم منانے والوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا گیا۔لوگ اپنی عورتوں کی عصمتیں لٹتی دیکھ کر بھی کچھ نہ کر سکے۔جس کی تصویرکشی آنند لہر نے ناول میں یوں کیا ہے۔

''ایک پٹھان میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔یہ کہہ کر وہ آگے بھاگ گئی۔۔۔۔۔پھر عبدل چیخا اور کہنے لگا۔۔۔''پٹھانوں کو اجازت کس نے دی کہ وہ ہماری ہی دھرتی پر آ کر ہماری بہو بیٹیوں

کی عزت لوٹیں'۔۔۔۔۔مگر وہاں عبدل کی باتوں کو سننے والا کوئی نہ تھا
۔یوں لگتا تھا کہ ہر چیز بہری ہوگئی ہے۔۔۔۔دریاؤں کی روانی کی آواز
کو خاموشی کھا گئی ہے۔معصوم لڑکیوں کے ہونٹوں پر سناٹوں کا پہرہ لگ
گیا ہے۔محسوس ہوتا تھا کہ کشپ رشی کی دھرتی کو یہ لوگ تباہ کر رہے
ہیں۔اور رشی اپنی ان بوسیدہ کتابوں کو سنبھالنے کے قابل نہیں رہا جن پر
لفظ محبت لکھا ہوا ہے۔''۱۳؎

کشمیر میں عوام پر ہو رہے ظلم وستم کی داستان بیان کرنے کے بعد ناول نگار نے کہانی کو آگے بڑھانے کے لئے ان کشمیری نوجوانوں کا ذکر کیا ہے جو تربیت کے لیے سرحد کے اس پار یعنی پاکستان جاتے ہیں۔عبدل نامی ایک نوجوان جو ٹریننگ کے لیے سرحد کے پار جاتا ہے۔اس پر وہاں ٹریننگ کیمپوں میں کیا گزرتی ہے اور اسے کن حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔اس کا احاطہ کیا گیا ہے نیز یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ظلم وزیادتی کا شکار کشمیری ہی ہو رہے ہیں خواہ وہ کشمیر کی سرزمین پر ہوں یا سرحد کے اس پار ٹریننگ کیمپوں میں یا پھر جموں میں مہاجرین کے کیمپوں میں۔عبدل جو کے ناول کا مرکزی کردار ہے جب جموں میں مہاجرین کے کیمپوں میں جاتا ہے تو ان کی خستہ حالی کو دیکھ کر بہت دکھی ہوتا ہے۔جس کا ذکر آنند لہر نے یوں کیا ہے۔

''عبدل نے دیکھا کہ باہر بچے گندی نالیوں میں کھیل رہے ہیں۔ایک
ایک کمرے کے اندر دس اشخاص جانوروں کی طرح پڑے ہوئے
ہیں۔عبدل نے دیکھا کہ کشمیری عورتوں نے کانوں میں روایتی کانٹے
پہنے ہوئے ہیں مگر لگتا تھا کہ کسی روایت کے طور پر نہیں بلکہ سزا کے طور پر
پہنے ہوئے ہیں۔کشمیر کا حسن گرمی سے پگھل رہا ہے۔محسوس ہوتا تھا کہ
پھول خوشبو سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔''۱۴؎

علحدگی پسند کشمیری نوجوان ٹریننگ کے لیے پاکستان جاتے ہیں۔وہاں ٹرینگ کیمپوں میں انہیں طرح طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، گالیاں سننی پڑتی ہیں اور انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔تربیت کے دوران انہیں طرح طرح کی اذیتیں دی جاتی ہیں۔تربیتی کیمپوں میں کشمیری جوانوں کے ساتھ کیے جانے والے

سلوک کا ذکر کرتے ہوئے آنند لہر لکھتے ہیں۔

''عبدل کو لگا کہ کشمیر کے منہ سے خون بہہ رہا ہے اور لہو کے اس دریا میں لوگ ظلم کی کشتیاں چلا رہے ہیں۔اس کے بعد پٹھان تھک گیا تو اس نے محسوس کیا کہ اکبر جیت گیا اور وہ ہار گیا اسی شکست کو چھپانے کے لئے پٹھان نے اکبر کو ایک قید خانے میں بند کر دیا۔'' ۱۵

پاکستانی کیمپوں اور جموں میں مہاجرین کیمپوں میں کشمیری جوانوں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد عبدل واپس کشمیر پہنچتا ہے اور وہاں کے عوام سے ہندوؤں کی نمائندگی کرنے والے بدری کے بارے میں دریافت کرتا ہے کہ آخر بدری یہاں سے کیوں چلا گیا اور ہم نے اسے جانے کیوں دیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے بغیر ہماری تہذیب، ہماری خوشیاں ادھوری ہیں۔ بالآخر وہ سب مل کر اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ کشمیری پنڈتوں کو واپس گھر لایا جائے اور یوں اس ناول کی کہانی اختتام کو پہنچتی ہے آنند لہر نے ناول کا اختتام ان الفاظ پر کیا ہے۔

''آو بدری کو لے آئیں۔'' عبدل نے کہا۔

''وہ بھی اگلی عید سے پہلے۔'' لوگوں نے بلند آواز میں جواب دیا۔'' ۱۶

ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' امریکہ کے ہاتھوں عراق کی تباہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں آنند لہر نے جنگ اور جنگ سے ہونے والے حادثات و واقعات کو پیش کیا ہے۔ جنگ چونکہ انسان کی پیدا کردہ ہے اس لئے آنند لہر نے جنگ کے حالات طنزیہ انداز میں پیش کرنے کے لئے پرندوں اور جانوروں کو کردار بنایا ہے۔ یہ ایک علامتی ناول ہے جس میں لہر نے مختلف واقعات مثلاً ایٹمی ہتھیار، ملکوں کی آپسی رنجشیں، رشتوں کا زوال، نسلی امتیازات، غریبوں اور بے کسوں کا استحصال، طاقت کا بے جا استعمال، ماحولیاتی کثافت، بارود اور ایٹم بموں سے ہونے والی تباہ کاریوں کو پیش کیا ہے۔آنند لہر چونکہ ایک حساس ذہن کے مالک تھے اس لئے وہ جیو اور جینے دو کے نظریے کے قائل تھے۔لہر ہتھیاروں اور سرحدوں کے بالکل خلاف تھے۔

ناول کی شروعات جنگ سے ہونے والی تباہ کاریوں سے کی ہے۔مختلف پرندوں اور جانوروں کو انسانی عقل پر افسوس اور طنز کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پرندے اور جانور مکالماتی انداز میں انسانی عقل اور جنگ کی تباہ کاریوں پر تبصرہ کرتے دکھائے گئے ہیں۔ناول میں مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے انسان کو اللہ پاک نے

اشرف المخلوکات کا شرف بخشا اور دنیا کی تمام نعمتوں کو اس کے لئے تخلیق کیا لیکن انسان ان نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ان کی تباہی کے اسباب تلاش کر رہا ہے۔اپنی تباہی کے اسباب خود تلاش کر رہا ہے۔جس سے نہ صرف انسان بلکہ چرند پرند، حیوانات اور نباتات وغیرہ سب کی تباہی ہو رہی ہے۔طاقت ور بننے کی خواہش میں انسان ہتھیار تیار کر رہا ہے جو اس کی تباہی کا ذریعہ بن رہے ہیں۔انسان کو اللہ پاک نے نعمتیں اور دماغ جس مقصد کے لئے دئے ہیں وہ ان کا استعمال ان کے لئے کرنے کے بجائے انسان کی تباہی کے لئے کر رہا ہے۔اس ضمن میں ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''ہم پرندے اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ یہ چونچ اناج لانے کے لئے
ہے۔دوسرے پرندے کا جسم نوچنے کے لئے نہیں مگر انسان انسان ہو کر
بھی اس بات کو نہ سمجھ سکے۔'' ۱۷

جانور اور پرندے ایک دوسرے سے محفوظ ہیں لیکن انسان انسان سے محفوظ نہیں۔جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کی رائے کا احترام نہیں کرتے۔انسان ملکوں، قوموں اور فرقوں میں بٹ چکے ہیں۔جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے، اپنی طاقت بڑھانے کے لئے فسادات پھیلا رہے ہیں۔تقسیم ہو رہے ہیں۔طاقت کا غلط استعمال کر کے غریبوں اور کمزوروں کا قتل کر رہے ہیں۔جس کا ذکر کرتے ہوئے آنند لہر لکھتے ہیں۔

''انسان جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کی رائے کا احترام نہیں
کرتے لڑ پڑتے ہیں۔
مگر کیوں
چیل نے سوال دہرایا
کیونکہ وہ چھوٹے بڑے ملکوں میں بٹے رہتے ہیں وہ رائے کو اہمیت
نہیں دیتے بلکہ اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ کس ملک کا نمائندہ رائے
دے رہا ہے۔اور جو رائے دے رہا ہے اس کے پاس ایٹم بم کتنے
ہیں۔ہائڈروجن بم کتنے ہیں۔'' ۱۸

حق اور صداقت کی اہمیت نہیں بلکہ طاقت اور مال و دولت کی اہمیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے روئے زمین پر کسی بھی چیز، کسی مخلوق کو بنا مقصد کے پیدا نہیں کیا۔ دنیا کی رونقیں ان تمام چیزوں کی بقا کے ساتھ ہیں۔ اور ان کی بقا سے دنیا کا توازن برقرار ہے۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے آنند لہر یوں رقم طراز ہیں۔

''یہ جانور پرندے درخت زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں اور سب زندگی
کے جسم کی ٹہنیاں ہیں اور چھوٹے چھوٹے نام چڑیا، گیدڑ ان ٹہنیوں پر
اگنے والے پتے ہیں۔ اگر ایک چیز بھی کم ہو جائے تو توازن بگڑ جاتا
ہے۔''۱۹

قدرت نے انسان کو بے پناہ نعمتوں سے نوازا اور حق یہ ہے کہ انسان ان نعمتوں سے مستفید ہو اور اللہ کا شکر ادا کرے لیکن انسان اپنی بربریت اور بے رحمی کی وجہ سے ان کے خاتمے پر تلا ہے۔ انسان نے ایسے ایسے بارود تیار کیے جن سے قدرتی ذخائر جل کر خاک ہو گئے۔ جس کی منظر کشی لہر یوں کرتے ہیں۔

''اصل مقصد تو زندگی میں دھوپ کا مزہ لینا ہے۔
پھولوں کو کھلتے ہوئے دیکھنا ہے۔ آگے بولو بڑا ہی مزہ آرہا ہے۔
شیر نے کہا
اصل مقصد تو بہتے ہوئے دریاوں کی روانی کا مزہ لینا ہے۔ نکلتے ہوئے
چشموں سے جینے کا طریقہ سیکھنا ہے۔''
مگر انسان نے کیا کیا۔
دریاوں کے پانی میں گندگی ڈالی اور خوبصورت چشموں کو نکلنے سے
روکا۔ یہ سن کر سب حیران ہو گئے۔''۲۰

انسان نے انسان کو شکست دینے کیلئے ایٹمی ہتھیار تیار کئے جن سے نہ صرف وقتی تباہ کاریاں ہوئیں بلکہ ان کے اثرات آنے والی نسلوں پر بھی پڑے۔ کیونکہ ان زہریلے ہتھیاروں سے بعض ایسی بیماریاں لگتی ہیں جو نسل در نسل منتقل ہوتی ہیں۔ جس کو آنند لہر نے پرندوں کے ذریعے مکالماتی انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

''کون ہو تم۔

چڑیا نے پوچھا۔

یہ پوچھنے کے بجائے یہ پوچھو کہ کون تھا میں ۔

اس نے جواب دیا۔

کون تھے تم۔

دوسرے جانور نے پوچھا

کبھی ایک مکمل پرندہ ہوا کرتا تھا۔

پھر

اب نہیں ہوں۔

مگر یہ کیسے ہوا۔

چڑیا نے پھر سوال کیا۔ پہلے میرے لکڑ دادے کے ساتھ ایسا ہوا۔ پھر پردادے کے ساتھ اور بیماری اب مجھ تک پہنچی ہے اور میں جانتا ہوں کہ میرے بچوں تک بھی جائے گی۔'' ۲۱

زندگی کا اصل فلسفہ جیو اور جینے دو ہے جبکہ انسان منافرت پھلا رہا ہے۔ نئے نئے ایٹمی تجربے کر کے قدرتی وسائل کا خاتمہ کر رہا ہے اور جن چیزوں کی انسان کو اپنی آسائش کے لئے حفاظت کرنی چاہئے تھی ان کو برباد کر رہا ہے۔ ایسے ایسے بارود تیار کر رہا ہے جن سے ہوا آلودہ ہو رہی ہے، پانی گندہ ہو رہا ہے، جنگلات ختم ہو رہے ہیں، چرند پرند اور جانورں کی نسلیں ختم ہو رہی ہیں۔ انسانی رشتے ختم ہو رہے ہیں۔ اخوت ومحبت ختم ہو گئی ہے۔ انسان اپنی بربادی کے نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت ایک قدرتی عمل ہے پھر بھی موت کے وسائل تلاش کر رہا ہے۔ اسی ضمن میں ناول سے یہ خوبصورت مکالمہ ملاحظہ کریں۔

''اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس کے بعد بھی ہتھیار بنا رہا ہے۔'' ۲۲

انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے ہیں۔ اس قدر ذلیل حرکتوں پر اتر چکے ہیں کہ پرندے اور جانور بھی ان کی عقل پر شرمارہے ہیں۔ انسان کا احساس مر چکا ہے۔ طاقت ور کمزوروں اور بے کسوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے لہر لکھتے ہیں۔

''اس نے کہا تھا کچل دو۔دشمن کو ماردو۔زمین میں گاڑدو۔
انسان کتنا اچھا لفظ ہے۔یہ اپنے اندر بے شمار محبتیں،سلسلے،رشتے ناطے
سمو کر رکھتا ہے اور دشمن کتنا گھٹیا لفظ ہے اس کے اندر چھپی ہیں
نفرتیں،ظلم۔کلپا نے کہا۔
میرے بادشاہ نے بھی کچھ اسی طرح کہا تھا۔
وہ کیا۔
گل نے ساحل سے پوچھا۔
سر کچل دو سب کا۔قبرستان بنا دو۔دشمن کی دھرتی کو۔خون بہا
دو۔چاروں طرف۔''[۲۳]

جنگ تباہی و بربادی کا دوسرا نام ہے جو صدیوں کا اثاثہ منٹوں میں ختم کر دیتی ہے۔آنند لہر نے جنگ سے ہونے والی تباہیوں، ماحولی کثافت، رشتوں کی بے حرمتی، طاقت کا بے جا استعمال، اخلاقی پستی اور انسانی بے رحمی جیسے مسائل کو علامتی انداز میں بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' کا قصہ بھی سرحدی زندگی پر محیط ہے۔اس ناول میں بھی سرحد کے قرب و جوار میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ناول کا قصہ سرحد کے بالکل قریب ایک گاوں سے شروع ہوتا ہے۔جہاں ایک بالکل غریب انسان رام غلام اور اس کی بیٹی رانی غربت اور مفلسی میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ناول کا قصہ یوں ہے کہ دور سرحد پر ایک چھوٹے سے گاوں میں رام غلام مفلسی کی زندگی گزار رہا ہے۔رانی رام غلام کی اکلوتی بیٹی ہے جو کہ اٹھارہ برس کی خوبصورت لڑکی ہے۔رانی کا گاؤں ملک کا آخری یعنی سرحدی گاؤں ہے۔ اس گاؤں میں تقسیم سے قبل امن وسکون تھا۔چہل پہل تھی۔ایک سازگار ماحول تھا۔لیکن یہ سب سرحد قائم ہونے سے قبل تھا۔ جب بٹوارہ ہوا،سرحدیں قائم ہوئیں تو سازگار ماحول افراتفری اور بدحالی میں بدل گیا۔رانی کا جنم بٹوارے کے بعد ہوا اس لیے وہ سرحد کے معاملات سے بے خبر تھی۔اس گاؤں کے لوگ روٹی اور پودینہ کی چٹنی سے زندگی گزارتے تھے۔یہی ان کا معمول تھا اور غربت و مفلسی سے لڑنے کا واحد ذریعہ بھی۔کب ملک تقسیم ہوا کب سرحد قائم کر دی گئی اس کا علم ان لوگوں کو نہیں تھا۔کیونکہ سرحد لوگوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر نہیں قائم کی جاتی بلکہ

سیاسی چہرے اپنی من مانی اور مرضی سے جب چاہتے ہیں سرحدیں قائم کر دیتے ہیں۔انہیں لوگوں کی ضروریات ان کی امنگوں ،آرزووں ،رشتوں اور جذبات کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔وہ نہیں جانتے کہ سرحدیں گھروں کو اجاڑ دیتی ہیں،وسائل کو محدود کر دیتی ہیں ،رشتوں کو ختم کر دیتی ہیں۔انسانوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی خلا پیدا کر دیتی ہیں۔ان کا سکون اور نیندیں چھین لیتی ہیں۔سرحدوں کا کھیل کھیلنے والے عوام کو بھول کر ملک کو تقسیم کر دیتے ہیں لیکن اس سے ملک کے عوام پر کیا اثرات پڑتے ہیں اس کا ان کو اندازہ نہیں ہوتا۔جس کی منظر کشی کرتے ہوئے آنند لہر یوں رقمطراز ہیں۔

''ملک بھٹا سرحد قائم کر دی گئی مگر لکیروں کا کھیل کھیلنے والے بڑے بڑے لوگ اس بات کو نہ جانتے تھے کہ اس گاؤں کے لوگ پودینے کی چٹنی کے بغیر نہیں رہ سکتے۔کیونکہ انہوں نے کبھی یہ نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی یہاں کے لوگوں کو ہنستے کھیلتے دیکھا تھا۔''۲۴

سرحدوں کا کھیل کاغذوں پر ہوتا ہے اور سرحد قائم کرنے والے انسانی ضروریات کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے سرحد قائم کر دیتے ہیں۔جسے ملک کے عوام کو بغیر کسی عذر کے قبول کرنا پڑتا ہے۔سرحد متعین ہوگئی لیکن گاؤں کا وہ حصہ جہاں پودینہ اگتا تھا سرحد کے اس پار چلا گیا۔اس گاؤں کے لوگوں کو پودینہ پسند تھا بلکہ یوں کہئے کہ زندگی گزارنے کا واحد ذریعہ تھا۔رانی حسب معمول پودینہ لاتی رہی لیکن آہستہ آہستہ سرحد پر پہرے سخت ہونے لگے۔آمدورفت کا سلسلہ منقطع ہونے لگا۔گولی اور بارود کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔نفرتیں بڑھنے لگیں۔جس کی منظر کشی ناول نگار نے یوں کی ہے۔

''پہرے سخت کر دیئے گئے۔یہاں سے زہر کی فصل اگنی شروع ہوگئی تھی اور سرحد نے اپنی پہچان ظاہر کرنا شروع کر دی اور سرحد کی پہچان ہے گولی،بارود،موت، چیخ و پکار۔''۲۵

ایک دن اچانک رام غلام اتنا بیمار ہوا کہ وہ سرحدوں کے پہرے بھول گیا اور اس نے رانی سے پودینے والا قہوہ مانگا۔رانی یہ سن کر پودینہ لانے کے لئے چلی گئی۔وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ پودینہ سرحد کے دوسری طرف ہے۔ بالآخر رانی پودینہ لانے کے لئے سرحد کی دوسری طرف گئی۔جہاں دوسرے ملک کے فوجیوں نے اسے پکڑ لیا۔رانی

بہت چیخ و پکار کرتی رہی کہ وہ بے گناہ ہے اور پودینہ لینے کی غرض سے آئی تھی لیکن چونکہ سرحد کا زہر ہر طرف پھیلا ہوا تھا اس لئے فوجی اسے نہیں چھوڑ سکتے۔لیکن اس کی بے گناہی کا فوجی افسر کو احساس ضرور ہوتا ہے۔ وہ کچھ کر نہیں سکتا کیونکہ وہ قانون کے ہاتھوں مجبور ہے اس لیے وہ رانی کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ جہاں پولیس رانی سے پوچھ تاچھ کرتی ہے اور یہ معلوم ہونے پر بھی کہ رانی بے گناہ ہے اس نے کوئی جرم نہیں کیا پولیس اسے بری نہیں کرتی۔ کیونکہ انھیں سرحد کے سانپ نے ڈسا ہوا ہے۔اس واقعے کی منظر کشی آنند لہر نے ناول میں یوں کی ہے۔

> ''پولیس کے افسروں کو معلوم ہو گیا کہ رانی نے سرحد کو صرف پودینہ
> لانے کے لئے پار کیا ہے۔مگر یہ واقعہ بڑی اہمیت کا واقعہ ہو گیا تھا۔کچھ
> لوگوں کو تو انعام بھی ملنا تھا اور ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بھی اس کا چرچا
> شروع ہو چکا تھا۔اس لئے کوئی بھی سچ کہنے کی جرات نہ کرتا تھا۔'' ۲۶

رانی پر جاسوسی کا الزام لگا کر پولیس نے انٹیروگیشن سینٹر میں رانی پر طرح طرح کے ظلم کرنے شروع کر دیئے۔اسے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔انٹروگیشن سینٹر میں رحم نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ ہر طرف چیخ و پکار کا ماحول ہوتا ہے۔لوگوں کو بے رحمی سے مارا جاتا ہے۔جس کی منظر کشی ناول میں یوں کی گئی ہے۔

> ''یہ کہہ کر اس نے رانی کے منہ پر زوردار تھپڑ مارا اور ایک زور کی لات
> مارنے ہی لگا تھا کہ اس کے افسر نے اسے آواز دی۔
> ''غلاماں او غلاماں۔''
> ''بولئے حضور۔''
> ''اس چڑیا کو فی الحال چھوڑ دو۔آؤ ذرا ہاتھوں کی مالش کر لیں۔''
> ''آیا حضور۔'' یہ کہہ کر غلاماں نے پھر رانی کے منہ پر تھپڑ مارا اور افسر
> کے پاس چلا گیا۔'' ۲۷

غلاماں سینٹر کا سب سے بڑا ظالم ہوتا ہے جو مجرموں پر سب سے زیادہ ظلم و تشدد کرتا ہے اور سب لوگ چپ چاپ اس سے مار کھاتے ہیں۔کوئی اعتراض نہیں کرتا۔یہ وہاں کا معمول ہے۔ظلم و تشدد کے علاوہ عورتوں کی عصمت ریزی بھی کی جاتی ہے۔جس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔انٹروگیشن سینٹر میں انسانیت نام کی کوئی چیز دکھائی نہیں

دیتی۔اس ضمن میں ناول کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''رانی سے پہلے یہاں پر کافی لوگوں سے پوچھ تاچھ کی جا رہی تھی اس لئے اس کا نمبر دیری سے ہی آنا تھا اور اسے یہ بھی سمجھ آ رہی تھی کہ اگر مار پیٹ سے پہلے یا مار پیٹ کرتے وقت کوئی اس کی عزت لوٹ لے تو اسے بھی پوچھ تاچھ کا ہی حصہ سمجھا جاتا تھا۔لہذا عورت کی عصمت دری کرنے میں اور مارنے میں کوئی فرق نہیں تھا۔''۲۸

اس کے بعد وہاں رانی کا پالا ایک انسپکٹر سے پڑتا ہے۔رانی چونکہ بہت خوبصورت تھی۔اس لئے اس کی خوبصورتی پر وہاں سبھی فریفتہ ہو جاتے ہیں۔لیکن وہ درندے خوبصورت جسموں کو اپنی ہوس کا شکار بنانے کے ساتھ ساتھ ان پر تشدد بھی کرتے ہیں۔راجہ کو رانی کی تفتیش کا کام سونپا جاتا ہے۔لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاتے ہیں۔راجہ چونکہ ابھی نیا بھرتی ہوا تھا اس لیے وہ پولیس کے معاملات سے بھی واقف نہ تھا۔اس کے دل میں ابھی رحم باقی تھی۔راجہ رانی پر ظلم اور زیادتی کرنے کے بجائے اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور اس پر ظلم نہیں کر سکتا۔ہر شخص ان کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ان پر طرح طرح کے الزامات لگتے ہیں۔راجہ تفتیش کے دوران رانی کو مار نہیں سکتا۔اس کی رانی کے ساتھ محبت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ دیگر لوگوں کا شک دور کرنے کے لئے رانی کو مارنے کے بجئے خود اس سے مار کھانے کی ٹھان لیتا ہے۔وہ دیگر لوگوں کا شک دور کرنے کے لئے یہ تدبیر سوچتا ہے کہ بند کمرے میں رانی اسے مارے تا کہ باہر مار کی آوز سن کر باقی لوگوں کا شک بھی دور ہو جائے اور رانی کو مار بھی نہ پڑے۔رانی بھی راجہ کے حسن و جمال اور اس کے رویے سے متاثر ہو کر اس سے دل لگا بیٹھتی ہے اور محبت کا جذبہ اسے بھی راجہ کو مارنے سے روک لیتا ہے۔اور راجہ کی تدبیر کارگر ثابت نہیں ہوتی۔جس کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے۔

> ''میں کہنا چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس بیت سے مارو تا کہ باہر پتہ لگے کہ میں تمہیں مار رہا ہوں۔''۲۹

جب یہ تدبیر بھی کارآمد ثابت نہیں ہوتی تب راجا رانی سے کہتا ہے کہ میں چمڑے کا بیت دروازے پر ماروں گا اور تم زور سے چلانا۔جس سے باہر کے لوگوں کو تسلی ہو جائے کہ راجہ رانی کو مار رہا ہے۔آخر کار راجہ رانی کو سزا

دینے کے لئے یہی طریقہ اپنا تا ہے۔جس سے لوگوں کا شک کم ہوتا ہے۔انٹروگیشن سینٹر میں رانی کی طرح کئی اور موصوم لڑکیاں بھی سزائیں بھگت رہی ہوتی ہیں ۔جن سے وہاں رانی کی ملاقات ہوتی ہے۔اسی دوران رانی کی ملاقات گلشن نامی ایک لڑکی سے ہوتی ہے۔جو کبھی بہت حسین تھی لیکن اب مار کھا کھا کر اس کا جسم بدھا ہو گیا تھا۔وہ ایک سیٹھ کے گھر نوکرانی تھی اور سیٹھ اس کے ہاتھ اپنے ایک فقیر دوست کے لئے سامان بیجا کرتا تھا۔اصل میں سیٹھ سامان نہیں بلکہ چرس بھیجا کرتا تھا جس کی گلشن کو کوئی خبر نہ تھی ۔ایک دن وہ فقیر کے لیے سامان لے جا رہی تھی کہ پولیس آئی نے اسے پکڑ لیا۔اس نے چیخ کر کہا کہ یہ پوٹلی اس کی نہیں ہے مگر اس کی کسی نے ایک نہ سنی۔اسے بنا کسی تحقیق کے سزائیں ملنا شروع ہو جاتی ہیں۔سیٹھ جو اس کے ہاتھ مال بھیج کر تجات کرتا تھا وہ انکار ہو جاتا ہے اور یہ الزام گلشن کے سر جاتا ہے۔اسے زندگی بھر سزائیں بھگتنی پڑتیں ہیں۔جس کا نقشہ ناول نگار نے یوں کھینچا ہے۔

''سیٹھ نے نہیں کہا کہ وہ پوٹلی اس کی ہے۔''

''نہیں نہیں سیٹھ بھی مکر گیا۔''اس پوٹلی میں اصل میں چرس تھی۔

''اور وہ فقیر۔'' رانی نے حیرانگی سے پوچھا۔

وہ بھی اصل میں فقیر نہیں تھا بلکہ اس نے فقیر کا لباس پہنا ہوا تھا تا کہ لوگ اس پر شک نہ کریں۔''۳۰؎

گلشن گرفتار ہو جاتی ہے اور اس پر اسمگلنگ کا الزام لگایا جاتا ہے۔جس کے لیے پولیس والوں کو انعامات دیے جاتے ہیں اشتہار چھپتے ہیں کہ ایک بہت بڑی اسمگلر گرفتار کی گئی ہے اور اس سے بڑی مقدار میں چرس پکڑنے میں پولیس کامیاب ہوئی ہے۔گلشن بے گناہ ہونے کے باوجود جرم دار بن جاتی ہے جبکہ اصل گناہ گاروں کی کسی کو کوئی خبر نہیں ہوتی۔اس کے بعد انٹیرگیشن سینٹر میں گلشن کو طرح طرح کی سزائیں دی جاتی ہیں۔اسی دوران سینٹر میں رانی کی ملاقات ایک اور لڑکی سے بھی ہوتی ہے۔جس کا نام ثریا ہوتا ہے۔اسے اس الزام میں گرفتار کیا گیا جاتا ہے کہ وہ اس ملک یعنی پاکستان سے سرحد کے اس طرف ہندوستان چلی آتی ہے ۔ جہاں اس کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوتا ہے۔جو سرحد کے اس طرف رانی سے ہوا۔رانی پر سرحد کے اس طرف ظلم ہوا جبکہ ثریا پر اس طرف ۔ دونوں طرف ظلم ہوتا ہے۔ ہندستان میں ظلم و جبر کا شکار ہونے کے بعد اس جب وہ واپس اپنے ملک پاکستان میں گئی وہاں اسے گرفتار کر کے انٹروگیشن سینٹر میں ڈال دیا گیا اور تب سے اب تک اسے وہاں مار پیٹ اور اذیتوں کا شکار ہونا پڑ رہا ہے۔

کیونکہ ابھی تک اس کا جرم ثابت نہیں ہوا۔انٹیروگیشن سینٹر سے راجہ کا تبادلہ کر کے اسے جیل میں تعینات کر دیا جاتا ہے۔ادھر انٹیروگیشن میں پوچھ تاچھ کے بعد رانی کو عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔رانی بڑی خوشی سے عدالت میں پیش ہوتی ہے اور محظ اس لیے اقبال جرم کر لیتی ہے کہ اس کے بدلے اسے جیل بھیجا جائے گا جہاں وہ پھر سے راجہ کے ساتھ ملاقات کر سکے گی۔رانی جرم کا اقبال کر لیتی ہے تو جج رانی کو تین برس کی قید کی سزا سناتا ہے۔جس پر جج کے بارے میں بھی مشہور ہوتا ہے کہ وہ نڈر اور انصاف پسند ہے۔اس کے بعد رانی جیل چلی جاتی ہے اور راجہ بھی اسی دن سے جیل میں ڈیوٹی دینا شروع کرتا ہے۔اسے جیل میں عورتوں کا انچارج بنایا جاتا ہے۔جیل میں رانی کی ملاقات ڈاکٹر ہمیش نامی ایک شخص سے بھی ہوتی ہے۔جو ایک ڈاکٹر ہے اور ہڈیوں کے علاج کا ماہر ہے۔ایک دن اچانک ایک غریب لڑکی کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور اس کے علاج کے لیے سرحد کے اس پار چلا جاتا ہے۔جہاں سے بارڈر کراس کے جرم میں اسے پولیس گرفتار کر لیتی ہے اور سزا ہو جاتی ہے۔

جیل میں راجہ رانی کی محبت کا سلسلہ پھر شروع ہوتا ہے اور ان کی محبت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک دوسرے کے بنا رہنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔لیکن ایک دن اچانک راجہ کو کالج میں پروفیسر کی نوکری مل جاتی ہے۔راجہ کو کالج کی نوکری جائن کرنی پڑتی ہے۔جس سے وہ بہت پریشان ہوتا ہے۔کیونکہ پولیس کی نوکری چھوڑنے سے راجہ رانی سے جدا ہو رہا تھا۔بالآخر راجہ کالج میں جوائن کر لیتا ہے۔لیکن کالج میں تعینات ہونے کے بعد راجہ کا دل نہیں لگتا اور وہ رانی کے ہجر میں مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔اور ادھر رانی بھی راجہ کے فراق میں نڈھال ہو جاتی ہے۔راجہ بھی چاہتا ہے کہ دنیا کی تمام تر مصروفیات و آسائش چھوڑ کر رانی کے ساتھ جیل میں رہنا شروع کر دے۔ناول سے اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''مگر یہ خبر کہ راجہ کو جیل چھوڑنی پڑے گی۔راجہ کو لگا کے اس پر پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔کیونکہ راجہ تو اب جیل میں ہی رہنا چاہتا تھا۔اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی رانی کے لیے ایسا جرم کرے کہ تمام زندگی اسے جیل کے اندر رہنا پڑے۔اور جیل ہی اس کا گھر بن جائے۔''[۳۱]

رانی سے الگ ہو کر راجہ بے حد پریشان رہنے لگا۔اس نے کوشش کی کہ وہ کوئی نہ کوئی جرم کرے جس کی وجہ سے اسے بھی جیل بھیجا جائے۔لیکن وہ یہ سب کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ادھر رانی بھی اس کے فراق میں پریشان

رہنے لگی۔ بالآخر ایک دن رانی بیمار ہوگئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا اور ڈاکٹر نے بتایا کہ رانی حاملہ ہے۔ کیوں کہ جیل میں جب راجہ اور رانی اکٹھا رہتے تھے تو اس وقت ان کی محبت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کے درمیان جسمانی تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔ رانی نے یہ کہہ دیا کہ یہ بچہ راجہ کا ہے۔ ہر طرف شور مچ گیا اور راجہ نے بھی یہ قبول کر لیا۔ اب راجہ دن رات جیل کے چکر کاٹنے لگا۔ رانی نے بچے کو جنم دیا۔ جیل میں سدانند کی وجہ سے رانی کو تھوڑی بہت راحت ملی۔ بچے کی پیدائش پر راجہ اور اس کے گھر والے بہت خوش ہوئے۔ اسی دوران جیل میں گلنار نامی ایک شخص بھی رانی سے اپنے تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا مگر کامیاب نہیں ہوا۔ کیونکہ رانی راجہ سے پیار کرتی تھی۔ دن گزرتے جاتے ہیں اور آخر کار سدانند رانی کی باقی سزا معاف کرانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ راجہ رانی کو گھر لانے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے اور اس کے ماں باپ بھی اس پر راضی ہو جاتے ہیں۔ رانی کو گھر لانے کے لئے سبھی خوشی خوشی تیاری کرنے لگتے ہیں آخر وہ دن بھی آتا ہے جس دن جیل سے رانی کو رہائی ملتی ہے۔ راجہ اپنے رشتہ داروں کے ہمراہ جیل کے باہر رانی کو لینے جاتا ہے۔ جیل کے باہر ڈھول بجتے ہیں۔ رانی کے لئے ڈولی سجائی جاتی ہے۔ لوگ اپنے ہاتھوں میں رانی اور اس کے بیٹے کے لیے ہار لے کر ان کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت یہ تمام خوشیاں ماتم میں تبدیل ہو جاتی ہیں جب جیل سے نکلنے کے بعد رانی کو اس کے ملک واپس بھیجنے کے لیے سرحد کی طرف روانہ کیا جاتا ہے۔ ہر طرف صف ماتم بچھ جاتی ہے۔ جس کی تصویر کشی آنند لہر نے یوں کی ہے۔

> ''جیل کا دروازہ کھلا۔ رانی اور اس کا بیٹا باہر آئے۔ مگر ہار لوگوں کے ہاتھوں میں ہی رہ گئے۔ ڈولی والے دلہن کو بٹھانے کا انتظار ہی کرتے رہے۔ ڈھول بجانے والوں کے ہاتھ رک گئے۔ رانی اور اس کے بیٹے کو ایک پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ گاڑی چلنے لگی۔'' ۳۲

رانی کو سرحد پر لے جایا گیا، رانی چیخ کر رونے لگی۔ ادھر راجہ اور اس کے رشتہ دار رو رہے تھے۔ سرحد کے دونوں طرف کھڑے سپاہی بھی رونے لگے۔ رانی سرحد کے ایک طرف اور راجہ دوسری طرف۔ بیچ میں وہ بچہ جس کا کوئی ملک نہیں کیونکہ دونوں ملکوں کے سپاہیوں نے انکار کر دیا۔ ایک ملک کے سپاہیوں نے اس لئے کہ اس کا باپ دوسرے ملک کا تھا اور دوسرے ملک کے سپاہیوں نے اس لئے کہ اس کی ماں دوسرے ملک کی تھی۔ اور یوں وہ بچہ درمیان میں کھڑا رہا جس کا کوئی ملک نہیں۔ اسی لئے اس ناول کا عنوان بھی ''سرحدوں کے درمیان'' رکھا گیا ہے۔

''یہی سچ ہے'' آنندلہر کا چوتھا ناول ہے۔جس میں آنند لہر نے زندگی کے حقائق کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔زندگی کے نشیب وفراز ،بدلتے حالات اور وقت ،جذباتی بے کیفی ،ذات کا درد وکرب ،رشوت خوری ،دنیا کی ناپائیداری اور استحصال وخودغرضی وغیرہ کے تناظر میں فلسفہ حیات کو مؤثر کیفیات سے ہمکنار کرنے کی سعی کی گئی ہے۔''یہی سچ ہے'' زندگی کی سچائیوں کی بھرپور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے۔اس ناول میں لہر نے تین کرداروں کو مرکزی کردار بنایا ہے۔جن کے اردگرد کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔

ناول کا قصہ کچھ یوں ہے کہ شیو اور شنکر دو بھائی ہیں۔شنکر جو کہ محکمہ پولیس میں ہیڈ کلرک ہے رشوت سے بے پناہ نفرت کرتا ہے۔شنکر دنیا میں مال و دولت جمع کرنے نیز عیش وعشرت کی زندگی بسر کرنے کے بالکل خلاف ہے۔اس کا ماننا ہے کہ دنیا عیش وعشرت کی جگہ نہیں بلکہ جو اس دنیا میں دکھ بھوگے گا اسے مرنے کے بعد سورگ ملے گا۔شنکر رشوت کے خلاف ہے اور اس کی معمولی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔جس کی وجہ سے اس کی بیوی اور بچے اس سے ناراض ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ شنکر بھی رشوت لے۔ان کی اچھی خاصی آمدنی ہو۔دیگر ملازمین کی طرح ان کا بھی اچھا مکان ہو، مال و دولت ہو۔لیکن شنکر اس فلسفے کے بالکل برعکس زندگی گزارنا چاہتا ہے۔کیونکہ وہ اس بات پر عمل پیرا ہے کہ جو اس دنیا میں دکھ دیکھے گا مرنے کے بعد اسے ہی سورگ ملے گا۔ناول سے یہ اقتباس دیکھیں۔

> ''صبح ہوتے ہی شنکر کی بیوی نے چیخ کر کہا۔
> بچے کمزور ہو رہے ہیں۔مجھے بھی بیماری لگ گئی ہے اور گھر کی دیواریں جدا ہو گئی ہیں۔
> شنکر نے یہ سنا اور سادھو کے کہے ہوئے جملے یاد کیے۔
> جو اس دنیا میں دکھ بھوگتا ہے اسے ضرور مرنے کے بعد سوگ ملتا ہے۔''۳۴؎

شنکر رشوت نہیں لیتا۔جس کی وجہ سے وہ لوگوں میں مشہور ہے۔سارے لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، یہاں تک کہ لوگ اسے دیوتا کہنے لگتے ہیں۔شنکر کی یہ ایمانداری اس کے گھر والوں پر بوجھ بن جاتی ہے اور وہ چاہتے ہوئے بھی رشوت نہیں لے سکتے۔اس کا دوسرا بھائی ''شو'' محکمہ جنگلات میں تعینات ہے۔خوب رشوت لیتا

ہے لیکن لوگوں کا کام کرتا ہے۔اس لیے لوگ اسے چاہتے ہیں۔اسے ہر ایک ایماندار اس لیے کہتا ہے کہ وہ وقت پر لوگوں کے کام کرتا ہے۔اس کی بیوی بچے بھی اس سے بے حد خوش ہیں کیونکہ وہ ان کی آسائش کے لئے خوب پیسے کماتا ہے۔دونوں بھائیوں میں انتر ہے۔شنکر آخرت کی فکر میں ہے وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں زیادہ دکھ درد دیکھے تا کہ اگلے جنم اسے ثواب ملے۔جس کی تصویر کشی ناول نگاریوں کرتے ہیں۔

> ''شنکر اصل میں اگلی دنیا کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ وہ دنیا جو اس نے دیکھی نہیں اور یہ دنیا جو وہ روز دیکھتا ہے۔اسے کچھ نہیں سمجھتا ہے۔ یہاں وہ دن کاٹ کر اگلی دنیا میں جینا چاہتا ہے۔''۳۴

شنکر اس فانی دنیا کی عیش وعشرت سے بالکل ماورا ہے۔جبکہ شو کہ معاملہ الگ ہے۔اس کے لیے یہی سورگ ہے اور چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد اگر اسے نرک بھی ملے تو کوئی بات نہیں لیکن اس کی بیوی خوش رہنی چاہئے۔وہ اپنی بیوی کو کبھی بھی پریشانی کے عالم میں نہیں دیکھنا چاہتا۔اس کی خواہش ہے کہ اپنے بچوں کو تمام تر خوشیاں میسر کرے۔یہی اس کے لئے ثواب ہے۔اس ضمن میں ناول سے یہ اقتباس دیکھیں۔

> ''ادھر شیو یہ سمجھتا ہے کہ اگر مر کر اسے نرک بھی ملے گا تو کوئی بات نہیں کیونکہ وہ اپنے بیٹے کو تو سورگ دے جائے گا، دھرتی کا سورگ، وہ یم دوتوں سے آنکھیں نکلوانے کا درد، جسم کے بال نوچنے کا درد، جلتے ہوئے کڑاہوں میں لیٹنے کا درد تو برداشت کرسکتا ہے لیکن اپنے بچوں کی بھوک برداشت نہیں کرسکتا۔ بچوں پر کوئی ظلم برداشت نہیں کرسکتا ۔''۳۵

شیو رشوت خور ضرور ہے لیکن لوگوں کے ساتھ بے ایمانی نہیں کرتا، دھوکا نہیں کرتا۔اور وہ جس کام کے لیے رشوت لیتا ہے اسے وقت پر پورا کرتا ہے۔اس لیے وہ لوگوں کی نظروں میں ایماندار اور باوقار بھی ہے۔لوگ اسے خوشی سے رشوت دیتے ہیں۔شیو کے دفتر میں ایک ناگپال بھی ہے۔جو رشوت لیتا ہے لیکن بے ایمانی کرتا ہے۔وہ صرف رشوت لیتا ہی نہیں بلکہ لوگوں سے چھینتا ہے اور اس کے بدلے میں لوگوں کا کام بھی وقت پر نہیں کرتا۔شوا ورناگپال میں بہت فرق ہے۔شیو رشوت لیتا ہے لوگوں کے کام کرتا ہے اور رشوت کے پیسے اپنی بیوی کے لیے، اپنے

بچوں کے لئے خرچ کرتا ہے۔ جبکہ ناگپال خوب رشوت لیتا ہے اور اس کے پیسوں سے شراب پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ جس کی عکاسی ناول میں آنند لہر نے یوں کی ہے۔

> ''شیو رشوت کے پیسوں سے بیوی کے لئے ساڑی خریدتا ہے، گھر کا
> سامان خریدتا ہے۔ لیکن ناگپال ر
> شوت کے پیسوں سے شراب پیتا ہے، جوا کھیلتا ہے اور کوٹھے پر جاتا
> ہے۔ کتنا فرق ہے، شو اور ناگپال میں۔'' ۳۶

شو کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ جائز کام کے لیے رشوت لیتا ہے اور رشوت کا پیسہ محکمہ کے تمام ملازمین میں برابر بانٹتا ہے۔ اس لئے دفتر کے تمام لوگ اس پر بہت خوش رہتے ہیں۔ شو خود غرض نہیں ہے۔ وہ بھگوان کی پوجا بھی ایمانداری سے کرتا ہے۔ لیکن اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگتا کیونکہ اسے معلوم ہے وہ گناہ جان بوجھ کے کر رہا ہے۔ وہ اپنے بچوں کے لیے دعا کرتا ہے کہ انہیں اس طرح کے گناہ نہ کرنے پڑیں۔ اور وہ اپنے بچوں کو نرک میں جانے سے بچانے کے لئے خود نرک میں جانے کے لیے تیار ہے۔ شو اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اس کی قدر کرتا ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس کی ایمانداری کی وجہ سے بیوی کو کوئی پریشانی دیکھنی پڑے۔ جس کی تصویر کشی آنند لہر نے ان لفظوں میں کی ہے۔

> ''وہ اپنے آپ پر ہونے والا ظلم برداشت کرسکتا ہے۔ وہ یہ برداشت
> نہیں کرسکتا کہ اس کی بیوی کی جوانی مر جائے۔ وہ نرک میں خود روٹی
> کے ایک ایک دانے کو ترسنے کو تیار ہے لیکن اس دنیا میں یہ برداشت نہیں
> کرسکتا کہ اس کے بیٹے اور بیوی اس کی ایمانداری کی وجہ سے بھوکے
> رہیں۔ وہ خود غرض نہیں ہے۔'' ۳۷

ساوتری، شنکر اور شو کی اکلوتی بہن ہے۔ جو بہت خوبصورت ہے۔ جس کی شادی کوشل سے ہوتی ہے۔ جو ایک جج ہے۔ کوشل رشوت نہیں لیتا اور اپنے آپ کو ایماندار کہلاتا ہے۔ اسے اپنی ایمانداری پر بڑا غرور ہے۔ وہ اپنے عہدے اور اپنی ایمانداری کی وجہ سے اپنے آپ کو سب سے اعلیٰ سمجھتا ہے۔ وہ ایماندار ہے لیکن اس کی ایمانداری اس کے ماتحت کام کرنے والے ملازمین کے لیے ایک سزا ہے۔ اس کے زیر کام کرنے والے ملازمین اس کے رویے

سے بالکل خفا ہیں۔ وہ اپنی ایمانداری کے غرور میں لوگوں کے کام وقت پر نہیں کرتا اور اگر کوئی اس سے کام کرنے کا مطالبہ کرتا ہے تو اپنے غلط رویے میں ترش جواب دیتا ہے کہ میں نے کون سے پیسے کھائے ہیں۔ کوشل رشوت ضرور نہیں لیتا لیکن اس کا احسان جتلاتا رہتا ہے۔ لوگوں کے

کام وقت پر نہیں کرتا جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی نظروں سے گرا ہوا ہے۔ اپنے عہدے کے گمان میں وہ اپنے رشتہ داروں سے غلط سلوک کرتا ہے اور انہیں حقیر سمجھتا ہے۔ کوشل کے اندر رشتوں کا تقدس نہیں۔ اس کے رویے سے اس کی بیوی اور بچہ بھی تنگ ہے اور اس کے رعب تلے دبے ہوئے ہیں۔ اس کی بیوی اس کے غلط رویے کی وجہ سے اپنے بھائیوں اور رشتے داروں سے نہیں مل سکتی۔ جس کی وجہ سے اس کے تمام تر جذبات مجروح ہو جاتے ہیں۔ کوشل اپنی بیوی کو عام آدمیوں سے ملنے جلنے سے اس لیے منع کرتا ہے کہ وہ ایک جج کی بیوی ہے اور اسے عام لوگوں سے فاصلہ رکھنا چاہیے۔ جس کی منظر کشی ناول نگار نے اس طرح کی ہے۔

> ''کوشل کو اپنے جج ہونے پر بہت غرور ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو اپنی ایمانداری کا رعب دکھاتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو یہ رعب دکھاتا ہے کہ وہ اسے مارتا نہیں ہے، وہ جج ہے، وہ ایماندار ہے، وہ شراب نہیں پیتا ہے۔ بس ایمانداری کے بوجھ تلے اس کی بیوی جی رہی ہے۔'' ۳۸

کوشل کو اپنے بغیر کوئی ایماندار نظر نہیں آتا۔ اپنے عہدے کے نشے میں وہ رشتوں کا اہمیت بھول جاتا ہے۔ وہ بیوی سے جہیز نہیں لیتا لیکن اس کا احسان ضرور جتلاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی بیوی اس سے بہت تنگ ہو جاتی ہے۔ ناول سے یہ اقتباس اس ضمن میں ملاحظہ کیجئے۔

> ''میں ایک عام آدمی کی بیٹی تھی۔ جسے جج کے ہاں شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ اور اب مجھ سے یہ بوجھ برداشت نہیں ہوتا۔ وہ جہیز لے لیتے تو اچھا تھا اور پھر ان کی ایمانداری کے بوجھ تلے میں اور میرا بیٹا ترسیم دب کر رہ گئے ہیں۔ کھل کر جیا بھی نہیں جاتا اور یہاں تک کہ ترسیم کسی سے دوستی بھی نہیں کر سکتا۔'' ۳۹

کوشل ساوتری پر طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دیتا ہے۔ اس کے رشتہ داروں سے نفرت کرتا ہے

اور ساوتری کو ان سے دور رہنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ بالآخر ساوتری اس کی ان تمام حرکتوں سے تنگ آ جاتی ہے۔ وہ ساوتری کو اس غرور پر طلاق کی دھمکی دیتا ہے کہ ساوتری ایک معمولی گھر کی عورت ہے اور اس نے یہ احسان کیا ہے کہ جج ہونے کے باوجود اس کے ساتھ شادی کی ہے۔ اس لیے وہ اس کی احسان مند رہے گی اور یہ تمام خاموشی سے سہتی رہے گی۔ لیکن ساوتری ایک خوددار عورت ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اس وقت کوشل کے تمام غرور کو خاک آلود کر دیتی ہے جب بڑے شوق سے طلاق کے کاغذوں پر دستخط کر دیتی ہے۔ ساوتری کے غیر یقینی اس عمل کو دیکھ کر کوشل کو بڑا دکھ اور پچھتاوا ہوتا ہے۔ لیکن ساوتری اس کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیتی ہے۔ جس کی تصویر کشی کرتے ہوئے آنند لہر یوں رقم طراز ہیں۔

''یہ کہہ کر ساوتری نے ان کاغذوں پر دستخط کر دیئے۔ کوشل حیران ہو گیا۔ اسے اپنا اعلیٰ عہدہ اور ایمانداری ایک فضول چیز نظر آئی۔ اسے لگا کہ اس سے تو ساوتری ایماندار ہے۔ کیونکہ اس نے جھٹ سے کاغذوں پر دستخط کر دئے۔ اور وہ کتنا بے ایمان ہے جو طلاق دینا تو نہ چاہتا تھا مگر طلاق دینے کا رعب ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ اس کو چھوڑنا تو نہ چاہتا تھا مگر ساتھ رکھنے کا رعب جمانا چاہتا ہے۔''[۴۰]

ساوتری کوشل سے طلاق لے کر چلی جاتی ہے۔ کوشل کو لگتا ہے اس کے بنا ساوتری کا گزارہ نہیں ہو پائے گا اور وہ بے بس ہو کر لوٹ آئے گی۔ لیکن ساوتری ایک خوددار عورت کی طرح چلی جاتی ہے اور پلٹ کر بھی نہیں دیکھتی۔ ساوتری کے جانے کے بعد اس کا بیٹا ترسیم بھی اس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ کوشل بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ یہاں ہر طرح کی عیش و عشرت ہے، مال و دولت ہے۔ نام ہے، لیکن ترسیم ماں کی محبت کے لیے سب کچھ چھوڑ کے چلا جاتا ہے اور کوشل کا غرور مٹی میں مل جاتا ہے۔ دراصل کوشل اپنے سوا کسی کو ایماندار نہیں سمجھتا۔ وہ ایمانداری کو اپنی جائیداد سمجھتا ہے۔ اگر کوئی اسے ایماندار نظر آئے تو اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ ناول سے اقتباس ملاحظہ کریں۔

''اصل میں کوشل کے دل میں یہی خیال ہے کہ وہی ایماندار ہونا چاہیے اور دنیا میں اسی کا چرچا ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ وہ ایمانداری کو اپنی

جائیداد سمجھتا ہے اور اسے اپنے لیے رکھنا چاہتا ہے۔ایمانداری اس کا
اصول نہیں بلکہ وہ اس لیے ایماندار ہے کیونکہ ایسا کر کے وہ دنیا میں
برتری حاصل کرسکتا ہے۔''[۱۴]

کوشل اپنے بیٹے ترسیم پر ہر وقت دباؤ رکھتا ہے جس سے وہ تنگ آجاتا ہے۔ وہ جج کے عہدے پر فائز ضرور ہے لیکن یہاں فائز ہونے کے باوجود عزت وسکون حاصل نہیں کرسکا۔ وہ اپنی ایمانداری کو دوسروں پر لادنا چاہتا ہے۔اسے اپنے رشتے داروں کی قدر، اخلاقی قدروں کی اہمیت، اپنی بیوی کے حقوق اور بچے کی تربیت کے بارے میں کوئی فکر نہیں۔

دوسری طرف شنکر اور شیو کا معاملہ بھی وقت کے ساتھ بدلتا ہے۔شنکر جو کہ لوگوں کی نظروں میں ایماندار بننا چاہتا ہے اور سورگ کا متلاشی ہے۔لیکن دنیا میں بیوی بچوں کے اخراجات اور حقوق پورے نہیں کرسکتا۔آخرت کی فکر میں دنیا کی تمام تر آسائشوں اور ذمہ داریوں کو نظر انداز کرنا چاہتا ہے۔جس کی وجہ سے اس کا بڑا بیٹا بیماری میں عیادت نہ ہونے کی وجہ سے زندگی سے جنگ ہار جاتا ہے۔اور چھوٹا بیٹا رمیش آخر کار چور بن جاتا ہے۔وہیں شنکر کی بیوی سریتا غربت، افلاس اور خاوند کی بے رخی کی وجہ سے زندگی کے طویل دکھ درد سہہ کر بالآخر طویل علالت کے بعد مرجاتی ہے۔وہیں دوسری طرف شنکر کا دوسرا بھائی شو شنکر سے بالکل الگ ہے۔وہ رشوت لیتا ہے لیکن اس کے اندر رشتوں کا احساس ہے۔وہ اپنی بیوی بچوں کے لئے ایک حساس اور ذمہ دار شخص کی طرح تمام تر ممکن کام انجام دیتا ہے۔جس کی وجہ سے اس کا ایک بیٹا ڈاکٹر اور دوسرا انجینئر بن جاتا ہے اور اس کی بیوی انتہائی خوبصورت زندگی گزارتی ہے۔وہ معاشرے میں ہونے والے جرائم سے اپنے بچوں کو بچانے کے لئے خود گناہ کرتا ہے اور یہاں تک کہ اپنی بیوی کی عصمت بیچنے تک تیار ہو جاتا ہے۔لیکن اپنے بچوں کو آنے والے وقت میں ان دشواریوں اور بدکاریوں سے بچانا چاہتا ہے۔جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوتا ہے۔

ناول میں دھرم پال کا قصہ بھی ساتھ ساتھ چلتا ہے جو ایک ایماندار شخص ہے اسے جو مل جائے اسی پر خوشی منا کر زندگی کو حسین بنانے کا ہنر آتا ہے۔ دراصل آنند لہر نے زندگی کی کشمکش کو بیان کیا ہے کہ کچھ لوگ کم اور زیادہ کے چکر میں موجودہ نعمتوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔مختلف لوگوں کے زندگی جینے اور رشتوں کو نبھانے کے طریقے ایک الگ ہے۔جس کے لیے لہر نے شنکر، شیو، ناگپال اور دھرم پال کے کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔

''نامدیو'' آنند لہر کا پانچواں اور آخری ناول ہے ۔زیر نظر ناول کا قصہ گوبند کے گھر سے شروع ہوتا ہے۔گوبند کے گھر میں اس کی ماں کانتی دیوی اس کی بیوی شانتی اور تین بیٹیاں سریتا،کلپنااور آرتی رہتے ہیں۔گوبند کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہوتا اور وہ اس کی چاہ میں رہتا ہے۔ایک عرصے کے بعد ان کو خوشی دیکھنے کو نصیب ہوتی ہے۔گوبند کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔جس کا نام ''نامدیو'' رکھا جاتا ہے۔نامدیو کی ولادت پر بہت خوشی منائی جاتی ہے ۔جشن منایا جاتا ہے۔لیکن نامدیو کی ولادت کے ساتھ ہی گھر میں ایک تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے کہ اس کی پیدائش کے بعد اس کی ماں شانتی کی اہمیت گھر میں کم ہو جاتی ہے۔نامدیو کی ولادت کے وقت شانتی کی طبیعت خراب ہوتی جو بعد میں دن بدن بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔بچے کی خوشی میں سب اس کو بھول کر جشن میں مصروف ہو جاتے ہیں۔کوئی بھی اس کا خیال نہیں رکھتا وہ مدد کے لیے اصرار کرتی ہے لیکن کوئی بھی اس کو سننے والا نہیں ہوتا۔اسی دوران اس کی تکلیف حد سے بڑھ جاتی ہے اور وہ زندگی کی جنگ ہار جاتی ہے۔خوشی ایک دم ماتم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔اس منظر کو آنند لہر نے یوں بیان کیا ہے۔

> ''اندر لڑکا روتا رہا مگر ناچ گانے کے شور میں کسی کو بھی اس کی آواز سنائی
> نہ دی۔باہر شور تھا اور اندر شانتی کے درد کی چیخیں۔شانتی زور سے کراہتی
> گئی مگر سب لوگ خوشی میں مگن تھے۔کسی کو بھی ایک دوسرے کی یاد نہیں
> تھی۔ جب درد حد سے بڑھ گیا تو شانتی کے منہ سے تین لفظ نمودار
> ہوئے۔ہائے میں مرگئی۔'' ۴۲؎

شانتی کی موت کے بعد گھر کا نقشہ بالکل بدل جاتا ہے۔اس کی تینوں بیٹیوں کو جہاں ایک طرف ماں کا غم ستاتا ہے وہیں دوسری طرف اپنے ننھے بھائی کی فکر تنگ کرتی ہے۔مگر شانتی کی ساس'' کانتی دیوی'' کو شانتی کا کوئی خاص دکھ نہیں ہوتا بلکہ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی نظروں میں شانتی کی قدر کم ہو جاتی ہے۔شانتی کے انتم سنسکار کے بعد کچھ ہی دن گزرتے ہیں کہ گوبند کی ماں اور محلے کی چند بزرگ عورتیں جنہیں لوگوں کے رشتے جوڑنے اور توڑنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا وہ گوبند کی دوسری شادی کی تدبیریں بنانا شروع کر لیتی ہیں۔جب یہ چہ مگوئیاں گوبند کی بیٹیاں سنتی ہیں تو ان کی پریشانی اور بڑھ جاتی ہے۔وہ پہلے احتجاج کرتی ہیں کہ ان کی ماں کو مرے ابھی تھوڑے دن ہوئے ہیں اس لئے ان کا باپ ایسا نہیں کر سکتا۔وہ تینوں بہنیں ڈٹ کر باپ کی خدمت کرتی ہیں اور یہ ارادہ کر لیتی ہیں کے

وہ اس قدر باپ کی خدمت کریں گیں تا کہ باپ کو دوسری شادی کی ضرورت نہ پڑے۔اس عمل کو انجام دینے کے لیے اگر انہیں اپنی پڑھائی چھوڑنی پڑے، یہاں تک کہ اگر ان کو زندگی بھر کنواری رہنا پڑے تو بھی وہ تیار ہیں۔لیکن ان کا باپ دوسری شادی نہ کرے۔کیونکہ انہیں ڈر تھا ان کی سوتیلی ماں ان سے اور ان کے ننھے بھائی سے اچھا سلوک نہیں کرے گی۔جس کا ذکر کرتے ہوئے آنند لہریوں رقمطراز ہیں۔

''اچانک آرتی بول پڑی۔مجھے اگر پڑھائی بھی چھوڑنی پڑی تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔میں پپا کے لئے گرم گرم روٹیاں تیار کیا کروں گی۔کلپنا نے کہا۔میں ان کے کپڑے اچھی طرح دھوکر پریس کیا کروں گی۔میں ممی سے بھی زیادہ ان کا خیال رکھوں گی۔چاہے مجھے ساری زندگی کنواری ہی کیوں نہ رہنا پڑے۔آرتی نے پھر کہا۔''۴۳

اس کے بعد وہ تینوں بہنیں اپنے باپ کا خاص خیال رکھتی ہیں۔گھر کا کام اچھی طرح سنبھال لیتی ہیں۔ اپنے بھائی کا خیال رکھتی ہیں۔ان کے پڑوس میں ایک ساوتری نام کی خوبصورت عورت رہتی ہے جو بہت خوبصورت اور حساس ہے۔وہ نامدیو اور اس کی بہنوں سے پیار کرتی ہے اور نامدیو بھی ساوتری سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔نامدیو ایک عجیب طبیعت کا بچہ ہے۔جس کو تمام خوبصورت چیزوں سے پیار ہوتا ہے۔گھر کا ماحول اچھی طرح سے چلنا شروع ہو جاتا ہے۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گوبند کا رویہ تبدیل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔اس کا سلوک بچوں کے ساتھ پہلے جیسا نہیں رہتا۔گوبند کے گھر میں رجو اور گورجاں نامی دو بزرگ عورتوں کا آنا جانا زیادہ ہو جاتا ہے۔ انہیں خواہ مخواہ لوگوں کے معاملات میں دخل دینے کا شوق ہے۔یہ وہ عورتیں ہیں جنہیں ایک گھر کی باتیں دوسرے اور دوسرے کی تیسرے میں پہنچانے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتا۔جن کے بارے میں آنند لہریوں رقمطراز ہیں۔

''رجو اور گورجاں محلے کی سب سے بوڑھی عورتوں میں تھیں۔محلے کے تمام لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ان کا کام لوگوں کے گھروں میں جانا تھا۔رجو رشتے ناتے کروانے میں ماہر تھی جبکہ گورجاں لوگوں کے گھروں میں جھگڑے کروانے میں ماہر تھی۔''۴۴

رجو اور گورجاں گوبند کے گھر میں مداخلت کرتی ہیں اسے دوسری شادی کی ترغیب دیتی ہیں۔وہیں گوبند

کی ماں کانتی دیوی بھی چاہتی ہے کہ گوبند کی شادی ہو جائے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گوبند کے دل میں دوسری شادی کی خواہش جاگتی ہے اور بچوں کے ساتھ اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔جس سے بچے پریشان رہنے لگتے ہیں۔ بالآخر جو گردھاری نام کے ایک شخص کی لڑکی آشا سے گوبند کی شادی طے کر لیتی ہے۔گردھاری بہت غریب ہے اس لئے اس کے گھر میں بیٹیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔وہ گوبند کے بارے میں بہت ساری منفی چیزیں معلوم ہونے کے باوجود اپنی نوجوان لڑکی کی شادی اس سے کروادیتا ہے۔دراصل وہ اپنی بیٹی کا رشتہ گوبند کو صرف اس لیے دے دیتا ہے تاکہ وہ اس کے گھر میں کم از کم دو وقت کی روٹی کھا سکے۔گوبند کی شادی کی خبر سن کر اس کی بیٹی سریتا پریشان ہوگئی اور بیماری میں مبتلا ہوگئی۔ساوتری جو کہ ان کا واحد سہارا تھی وہاں سے ہجرت کر کے کسی دوسری جگہ چلی گئی۔جس سے ان بھائی بہنوں کا سہارا لٹ گیا۔سریتا کی تکلیف مزید بڑھی اور اس کا انتقال ہوگیا۔جس کا گوبند پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔آشا کی جب شادی طے ہوتی ہے تو وہ اس لیے اعترض نہیں کرتی کیونکہ اسے معلوم ہے کہ غریب کی بچی سے کوئی شادی نہیں کرتا۔جس منظر نامے کو آنند لہر نے یوں پیش کیا ہے۔

''آشا کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی شادی گوبند سے ہونے والی ہے۔مگر اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ گوبند کے گھر اسے پیٹ بھر کر کھانا ملے گا۔آشا کو روٹی کی اہمیت معلوم تھی۔آشا کو وہ بوڑھا دوکاندار اچھی طرح سے یاد تھا جس نے آٹے کے عوض اس کی چھاتیوں کو ٹٹولا تھا۔''۴۵

بالآخر گوبند کی آشا سے شادی ہو جاتی ہے۔آشا کے آنے سے پہلے گوبند کی بیٹیوں کو سوتیلی ماں کا خوف تھا۔لیکن اس کے آنے سے گھر کا ماحول بدل جاتا ہے۔آشا گوبند کی بیٹیوں اور بیٹے سے بالکل گھل مل جاتی ہے۔ اس کے آنے سے گھر کی رونقیں بڑھ جاتی ہیں۔آشا ان کی امیدوں کہ بالکل خلاف ثابت ہوتی ہے اور وہ ان کا خیال حقیقی ماں کی طرح رکھتی ہے۔ناول سے یہ اقتباس دیکھئے۔

''آشا کے آنے سے پہلے دونوں بہنوں کو ڈر تھا کہ آشا آتے ہی ان پر ظلم ڈھانا شروع کر دے گی۔لیکن اس کے بالکل الٹ ہوتا ہے۔آشا نے سامنے دیوار پر شانتی کی تصویر لگادی اور اسے پوجنے لگی۔وہ ہر روز

صبح اٹھ کر اس پر پھول
چڑھاتی ۔آشا کو حقیقی ماں سے بے حد محبت تھی مگر لفظ سوتیلی ماں سے
بے حد نفرت۔''۴۶؎

آشا گوبند کے ننھے بیٹے نامدیو سے بے حد پیار کرتی ہے۔اسے ماں سے بھی عزیز رکھتی ہے۔اور وہ بھی آشا سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور اسے حقیقی معنوں میں ماں تسلیم کرتا ہے۔لیکن دوسری طرف آشا اور گوبند کے بیچ اس طرح سے پیار نہیں ہو سکتا جیسا گوبند چاہتا ہے۔کیونکہ گوبند اور آشا کی عمر میں بہت فرق ہے۔گوبند بڑی عمر کا مرد آشا سے اس طرح محبت کرنے میں بالکل ناکام ہوتا ہے جیسے ایک نئی نویلی نو عمر دلہن کو چاہئے۔جس کا ذکر ناول نگار یوں کرتے ہیں۔

''گوبند آشا سے دوگنی عمر کا تھا۔وہ آشا سے پیار نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی
اس میں آشا سے پیار کرنے کی ہمت تھی۔وہ بس ہوس مٹا سکتا تھا،شام
کو شراب پی کر آشا کے پاس چلا جاتا اور اس کا بدن نچوڑنے لگتا۔زور
زور سے اس کے خوبصورت بدن کو مسلتا۔وہ اپنا یہ غصہ کہ وہ بڑھاپے کی
طرف کیوں جا رہا ہے آشا کے جسم کو مسل کر نکالتا۔''۴۷؎

آشا ایک فرماں بردار بیوی کی طرح اپنے خاوند کا خیال ضرور رکھتی ہے۔لیکن عمر میں زیادہ فرق ہونے کی وجہ سے ان کے رشتے میں وہ پیار نہیں آ سکتا جس کا گوبند متمنی ہوتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور یہاں تک کہ وہ نہیں چاہتا کی آشا اس کے بیٹے نامدیو سے محبت کرے۔اس کے دل میں آشا کے لئے نفرت بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔وہ آشا پر الزامات لگانا شروع کر دیتا ہے۔کبھی کسی پڑوسی کی تہمت،کبھی کھانا اچھا نہ بنانے کا الزام،کبھی کپڑے اچھے نہ دھونے کا الزام وغیرہ۔دراصل گوبند نہیں چاہتا تھا کہ آشا اس سے زیادہ اس کے بچے کا خیال رکھے۔آشا گوبند کے بچوں سے اچھی طرح گھل مل جاتی ہے جو گوبند کو ناگوار گزرتا ہے۔وہ نہیں چاہتا کہ آشا اس سے زیادہ اس کے بچوں سے پیار کرے۔جس سے ان کے درمیان بدگمانیاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

''نادیو''ایک عجیب فطرت کا لڑکا ہے۔وہ جب اسکول جانے لگا تو اسکول میں اس کی ملاقات''کسم''نام کی ایک لڑکی سے ہوئی۔نامدیو کو حساب میں بہت مہارت تھی وہ کسم کو حساب سکھاتا ہے۔اسی دوران ان دونوں کو

ایک دوسرے سے محبت ہوجاتی ہے۔کسم ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔وہ اسکول کی فیس ادا کرنے سے قاصر ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ اسکول بدلنا چاہتی ہے تو نامدیو پریشان ہوجاتا ہے اور بالآخر وہ یہ طے کرتا ہے کہ وہ ٹیوشن پڑھا کر اس کی فیس ادا کرے گا لیکن اس سے ہرگز جدا نہیں ہوسکتا۔

اسی دوران گوبند کا رویہ اور بدل جاتا ہے اور وہ اپنے بچوں سے اور نفرت کرنے لگتا ہے۔گوبند ایک لالچی اور خودغرض انسان ہے۔جو اپنی لالچ کے لئے اپنی جوان لڑکی ''کلپنا'' کی شادی کرم دیو نامی ایک بڑی عمر کے مرد سے کرا دیتا ہے۔کلپنا بہت پریشان ہوتی ہے لیکن کچھ نہیں کرسکتی کیونکہ اس کے باپ کا رویہ اس کے لئے صحیح نہیں ہے۔ناول سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

> ''یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کلپنا دن بدن کمزور ہو رہی ہے اور اندر ہی اندر کلپنا آہستہ آہستہ مر رہی ہے اور ایک جسم زندہ ہو رہا ہے، اور مضبوط ہو رہا ہے۔ظلم سہنے کے لئے ،ستم سہنے کے لئے ،نامدیو یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔'' ؁۴۸

کلپنا کی شادی کرم دیو سے ہوجاتی ہے۔لیکن بے جوڑ شادی ہونے کی وجہ سے ان کے رشتے میں پیار ومحبت نہیں ہوتا۔ادھر گوبند کی بیوی آشا ایک بچے کو جنم دیتی ہے۔جس پر گوبند خوشی مناتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ اب آشا نامدیو سے نفرت کرے گی لیکن وہ ایسا نہیں کرتی۔کچھ عرصے بعد جب دوسرے بچے کو جنم دیتی ہے تو اس کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے۔گوبند اس کا علاج نہیں کراتا اور اس سے اس کی یادداشت کمزور ہوجاتی ہے۔جس سے بعد میں وہ پاگل ہوجاتی ہے۔پہلی بیوی کی طرح گوبند اس کا بھی خیال نہیں رکھتا اور وہ پاگل ہوجاتی ہے۔ناول سے یہ اقتباس ملاظہ کریں۔

> ''اس شور میں وہی ہوا جو پہلے ہوا تھا۔مگر اس بار اس طریقے سے نہ ہوا۔آشا چیختی رہی مگر اس کی چیخیں سننے والا کوئی نہ تھا اور برہم دیو تو بالکل چھوٹا بچہ تھا۔شانتی کی طرح آشا کی موت تو نہ ہوئی مگر اس کی یادداشت چلی گئی۔وہ اب کسی بھی شخص کو پہچان نہیں سکتی تھی۔'' ؁۴۹

آشا گھر سے چلی گئی۔اس کے جانے کے بعد نامدیو بہت پریشان ہوگیا۔اب وہ زیادہ وقت اپنے دوست

گلشن کی دکان پر گزارنے لگا جو ایک درزی ہے۔اسی دوران اس کی ملاقات ایک نیرو نامی لڑکی سے ہوتی ہے۔جو نامدیو سے حساب سیکھتی ہے اور نامدیو کو جیومیٹری سکھاتی ہے۔اس بہانے ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا ہوتا ہے۔کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلتا ہے اور اسی دوران نیرو اور نامدیو کو ایک دوسرے سے محبت ہو جاتی ہے۔انکی محبت کا سلسلہ کچھ عرصہ چلتا ہے بعد میں جب نیرو بارہویں جماعت میں اول آتی ہے تو اسے ڈاکٹری کی سیٹ مل جاتی ہے۔اس کے بعد نامدیو کے لئے اس کا رویہ بالکل بدل جاتا ہے۔نامدیو اس کو بھلا نہیں سکتا اور پھر زندگی بھر اس کے اندر نیرو سے ملنے کی تڑپ رہتی ہے۔ یہاں تک کہ جب نیرو ڈاکٹر بن کر گاوں واپس آتی ہے تو وہ بیمار ہو کر اس سے ملنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس بہانے بھی اس کی تمنا نہیں بھرتی اور یہاں سے بھی وہ محرومی کا شکار ہوتا ہے۔

نیرو کے بعد نامدیو ایک بار پھر نیما نام کی ایک لڑکی سے عشق رچاتا ہے جو اسے بھی بے حد چاہتی ہے۔لیکن یہاں بھی ایک چیز ان کے آڑے آجاتی ہے کہ ان کے گاؤں الگ الگ ہیں جن کی آپس میں دشمنی ہے۔نامدیو اور نیما ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔ایک دن دونوں گاؤں کے کھلاڑیوں کے درمیان فٹ بال کا مقابلہ ہوتا ہے۔اتفاق سے نیما بھی میچ دیکھنے چلی جاتی ہے۔میچ کے دوران وہ نامدیو کی عمدہ کارگردگی پر اس کی داد دیتی ہے جو گاوں کے نمبردار کو ناگوار گزرتا ہے کیونکہ نامدیو دوسرے گاوں کا ہے اور نمبردار کے مطابق وہ اگر جتنا مرضی بہتر کھیلے اس کے گاوں والے اس کی تعریف نہیں کر سکتے۔جب گاؤں کے نمبردار کو پتہ چلتا ہے کہ نیما، نامدیو کی تعریف کر رہی ہے تو وہ نیما اور اس کے باپ کی بہت بے عزتی کرتا ہے۔جس کو آنند لہر نے کچھ یوں بیان کیا ہے۔

> ''نمبردار نے دیکھا کہ نیما لگاتار نامدیو کو دیکھتی ہی جاتی ہے۔گاوں کا نمبردار زور سے چیخا۔اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میں میچ نہیں ہونے دوں گا۔ہم یہاں پر میچ کھیلنے آئے ہیں۔اپنی عزت کا سودا کرنے کے لئے نہیں۔'' ۵۰

دراصل نامدیو فٹ بال کا بہت بڑا کھلاڑی تھا۔نمبردار اس کی مخالفت اس لئے کرتا تھا کہ دشمن گاؤں کا ہے اور اگر دوسرا گاؤں جیت گیا تو نمبردار کی پگڑی نیچے ہو جائے گی۔پھر اصل بات یہ تھی کہ وہاں اچھے اور برے، جائز یا ناجائز کی بات نہیں تھی بلکہ وہی سچ تھا جو نمبردار چاہتا تھا۔جس کی عکاسی کرتے ہوئے آنند لہر لکھتے ہیں۔

> ''حضور تمام گاؤں والے تالیاں بجا رہے ہیں میری بیٹی اکیلی تھوڑا ہی

یہ کام کر رہی ہے۔اس پر اچانک نمبردار نے کہا۔میں نمبردار ہوں
،میری مرضی ہے۔میں جس پر چاہے اعتراض کروں اور جس پر چاہے
اعتراض نہ کروں۔'' ۵۱

نامدیو کا ایک اور دشمن اور نیما کا خوشہ چیں ہرجیت ہے۔جسے نیما بالکل نہیں چاہتی لیکن وہ نیما کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور اسی بنا پر نامدیو سے عداوت رکھتا ہے۔ہرجیت فٹ بال کا کھلاڑی ہے اور نامدیو کے مخالف کھیلتا ہے۔ہر جیت کے گاؤں کا نمبردار اپنی پگڑی کو اونچا رکھنے کے لئے ہرجیت سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ میچ جیت کر آئے گا اور نمبردار کا نام روشن کرے گا تو اس کی شادی نیما سے کروائی جائے گی۔میچ کے دوران نامدیو، نیما کی محبت کی خاطر جان بوجھ کر اس لئے میچ ہار جاتا ہے تاکہ اس کی چہیتی نیما کا گاؤں جیت جائے۔جس پر اسے طرح طرح کے الزامات بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔نیما کی شادی نمبردار کے کہنے پر زبردستی ہرجیت سے کرادی جاتی ہے اور یوں نامدیو ایک بار پھر محبت میں ناکام ہو کر یاس و محرومی کا شکار ہوتا ہے۔محبت کی جنگ ہار کر بے سروساماں ہو جاتا ہے اور شراب پینا شروع کر دیتا ہے۔جس کی وجہ سے وہ بالکل مجنون ہو جاتا ہے۔آخر کار مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر اس کی موت واقع ہوتی ہے۔جس کے بعد گاؤں والے اس کا ایک بت بنا کر گاؤں میں لگا دیتے ہیں۔جہاں لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں اور پھول چڑھاتے ہیں۔ان کا یقین ہے کہ ایسا کرنے سے عاشقوں کی مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

## پلاٹ

پلاٹ واقعات کی ترتیب کا نام ہے۔عام طور پر پلاٹ اور قصے میں فرق نہیں کیا جاتا۔بعض لوگ پلاٹ اور قصے کو ایک ہی چیز سمجھتے ہیں جو دراصل غلط ہے۔قصہ یا کہانی ناول کا لازمی جز ہے اور ناول میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتا ہے۔جبکہ پلاٹ کے لئے یہ بھی ممکن ہے کہ ناول میں بالکل پلاٹ نہ ہو۔جیسا کہ پلاٹ کے بنا ناول لکھے گئے ہیں۔انگریزی میں سر والٹر اسکاٹ نے ناول میں پلاٹ کے بغیر قصہ گوئی کی بہترین مثالیں پیش کی ہیں۔جبکہ اردو میں مرزا ہادی رسوا کا ناول ''شریف زادہ'' اس کی بہترین مثال ہے۔دراصل قصہ ناول کی روح ہے اور پلاٹ اس قصے کی ترتیب کا نام ہے۔ناول میں پلاٹ پر بہت اعتراضات بھی ہوئے ہیں کہ ناول کے لئے پلاٹ کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔بہت سارے لوگوں نے بغیر پلاٹ کے کہانیاں لکھنے کا تجربہ بھی کیا۔لیکن بغیر پلاٹ کے لکھے گئے قصے ناول کے فنی لوازمات کو پورا نہ کر سکے اور یہی وجہ ہے کہ قارئین کی دلچسپی کو برقرار نہ رکھ سکے۔اس لیے نتیجہ یہی نکلا

کے پلاٹ کے بغیر ناول نہیں لکھا جا سکتا۔ پلاٹ قصے میں ربط و تسلسل کو برقرار رکھتا ہے۔ پلاٹ کا مقصد ہے ناول میں پیش آنے والے واقعات کو آپس میں اس طرح جوڑا جائے جیسے لڑی میں موتی پروئے جاتے ہیں۔ایک اچھے ناول کے لیے ضروری ہے کہ اس کا پلاٹ گٹھا ہوا ہو اور اس میں بے جان مواد نہ ہو۔اچھے ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ پلاٹ کو ڈھیلا نہ چھوڑے۔ پلاٹ کا ذکر کرتے ہوئے ابوالکلام قاسمی لکھتے ہیں کہ۔

> ''پلاٹ انسانی کرداروں کو (جیسا کہ وہ ڈرامے میں ہوتے ہیں) اپنی ضرورت کے مطابق ڈھالنے کے بجائے وسیع و عریض نا قابل عبور اور برف کے تودے کی ان کی شخصیت کے تین چوتھائی حصہ کو چھپا کر پیش کرتا ہے۔''۵۲

پلاٹ میں واقعات کو زمانی تسلسل کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے۔تا کہ ان کے درمیان خلا اور بے ربطی پیدا نہ ہو۔جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ، بادشاہ مرا اور پھر ملکہ مر گئی۔ یہ ایک کہانی ہے۔ بادشاہ مرا اور پھر اس کے غم میں ملکہ مر گئی۔ یہ ایک پلاٹ ہے۔ پلاٹ کے ضمن میں علی عباس حسینی لکھتے ہیں۔

> ''پلاٹ واقعات کے اس خاکے کو کہتے ہیں جو ناول نویس کے پیش نظر شروع ہی سے رہتا ہے۔قصہ کی ساری دلچسپیاں اس کی ترتیب پر مبنی ہیں۔اسے جاننا چاہیے کہ وہ کیوں کر قصہ چھیڑے گا۔ناظر کی دلچسپی کس کس طرح بڑھائے گا اور اس دلچسپی میں مدوجزر کہاں کہاں پیدا کرے گا۔اسے قصہ اس طرح کہنا ہے کہ وہ موثر رہے۔''۵۳

پلاٹ کی اس مختصر تاریخ کے بعد اب میں رخ کرتا ہوں آنند لہر کے ناولوں میں پلاٹ کی ترتیب و تنظیم کی طرف۔اس ضمن میں سب سے پہلے ان کے پہلے ناول کو زیر بحث لاتے ہیں۔ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول مجموعی حیثیت سے دو حصوں پر مشتمل ہے۔ناول نگار نے خود یہ تقسیم نہیں کی لیکن مطالعہ کے دوران احساس ہوتا ہے کہ دو حصوں پر مشتمل ہے ناول کا ایک حصہ ۱۹۴۷ء کے بعد کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتا ہے جبکہ دوسرا حصہ علحد گی پسند نوجوانوں کی طرف سے شروع کی گئی تحریک اور کشمیر سے ہندوؤں کے ہجرت پر محیط ہے۔اس کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے واقعات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ناول نگار کا کمال یہ ہے کہ

اپنی فنی مہارت کے ساتھ تمام واقعات کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ پلاٹ گٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ غیر ضروری مواد سے پرہیز کرتے ہوئے ناول نگار نے تمام تر واقعات کو ربط وتسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔کہانی میں کہیں پر بھی خلا محسوس نہیں ہوتا۔لہر نے مختلف حالات وواقعات کو بڑی ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔ جس سے ناول میں قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔

آنندلہر نے دوسرے ناول ''سرحدوں کے بیچ''میں اکہرا پلاٹ استعمال کیا ہے۔شروع سے آخر تک ایک ہی قصہ قارئین کے پیش نظر رہتا ہے۔جس کو پروان چڑھانے کے لئے بیچ میں چھوٹے موٹے قصوں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔لیکن انہیں فنکار نے فنکارانہ چابکدستی سے اصل قصے میں ضم کر دیا ہے۔ان تمام واقعات کے درمیان ناول نگار نے ایسا جوڑ لگایا ہے کہ کہیں پر بھی کوئی بے ربطی نظر نہیں آتی۔ناول میں شروع سے آخر تک رانی کا قصہ چلتا ہے۔ قصے کو آگے بڑھانے کے لئے مختلف واقعات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔جنہیں ناول نگار نے اپنی فنی مہارت کے ذریعے ربط وتسلسل کے ساتھ بیان کیا ہے۔زیر بحث ناول کا پلاٹ گٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔شروع سے آخر تک کہیں پر بھی پلاٹ کو ڈھیلا نہیں چھوڑا۔جس سے ان کی فنی مہارت کا اعتراف ہوتا ہے۔اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آنندلہر زیر نظر ناول میں چست اور گھٹا ہوا پلاٹ برتنے میں کامیاب رہے ہیں۔

ناول ''یہی سچ ہے''میں آنندلہر نے انسانی زندگی کے نشیب وفراز کو بیان کرنے کی سعی کی ہے۔زیر بحث ناول میں مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے لہر نے مختلف کرداروں کے ذریعے تین چھوٹے چھوٹے قصے بیان کئے ہیں۔لیکن ان تمام قصوں کو ربط وتسلسل کے ساتھ پیش کرنے میں آنندلہر زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے۔بعض مقامات پر تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔مطالعہ کے دوران بعض مقامات پر ناول کو ابواب میں تقسیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔حالانکہ ناول نگار نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ بلاشبہ ناول نگار نے جس مقصد کے لئے ناول تخلیق کیا ہے اسے پیش کرنے میں وہ کافی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں لیکن ناول کے پلاٹ سے قارئین کا جو مطالبہ ہوتا ہے اس پر یہ ناول کھرا نہیں اترتا۔جوکہ مطالعہ کے دوران قاری کے لئے اکتاہٹ کا باعث بنتا ہے۔

''نامدیو'' ان کا آخری ناول ہے۔دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی آنندلہر نے سادہ پلاٹ کا استعمال کیا ہے۔ناول میں پیش آنے والے چھوٹے چھوٹے قصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ربط وتسلسل کے ساتھ جوڑتے ہوئے ایک اچھے پلاٹ کی مثال قائم کی ہے۔تمام تر واقعات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایک کے بعد دوسرا

فطری معلوم ہوتا ہے۔واقعات کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ بات میں سے بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے جو ایک بڑے فنکار کی خوبی ہے۔

## کردار نگاری

آنند لہر کے ناولوں میں کردار نگاری کا جائزہ لینے سے قبل ناول میں کردار نگاری کی اہمیت وافادیت کا مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔کوئی بھی قصہ یا کہانی کرداروں کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے۔ناول کی بنیاد چونکہ کسی نہ کسی قصے پر ہوتی ہے۔ قصے کو بیان کرنے کے لئے کرداروں کا ہونا ضروری ہے۔اس لیے ناول نگار کے لیے ضروری ہے کہ وہ کرداروں کا انتخاب بڑے غور وفکر کے ساتھ کرے۔کرداروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ بالکل فطری معلوم ہوں۔ ناول نگار نے اپنے تخیلی بنیاد پر نہ لئے ہوں۔کردار جیتے جاگتے ہونے چاہیے۔ان کے کارناموں،ان کے حرکات و سکنات سے قاری کو معلوم ہو کہ وہ بالکل ہمارے جیسے ہیں۔کردار نگاری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد احسن وڈاکٹر نور الحسن ہاشمی لکھے ہیں۔

> ’’حقیقت یہ ہے کہ کردار کسی قسم کے بھی ہوں ان میں زندگی ہونا ضروری ہے۔ان میں ایک ہی صفت ہو یا وہ کسی خاص صفت کے مجسمے یا اشارے ہوں تو ضروری ہے کہ ان کی یہ صفت اس طرح نمایاں کی جائے کہ وہ ہمارے دلوں کو اپنی طرف کھینچے اور ان کی حرکات ،بات چیت وغیرہ سے ہمیں یہی ظاہر ہو کہ وہ جیتے جاگتے انسانوں کی طرح ہیں۔‘‘ ۵۴؎

جہاں تک آنند لہر کے ناولوں میں کردار نگاری کا سوال ہے تو آنند لہر نے اپنے ناولوں کے لئے اپنے سماج سے جڑے ایسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ناول ’’اگلی عید سے پہلے‘‘ میں آنند لہر نے حالات و واقعات کے پیش نظر چھوٹے بڑے متعدد کردار استعمال کیے ہیں۔عبدل اس کہانی کا مرکزی کردار ہے۔جس کے اردگرد ناول کی کہانی اول تا آخر گھومتی ہے۔عبدل کوئی بہت بڑا لیڈر یا تجار نہیں بلکہ کلچے بنانے والا ایک معمولی آدمی ہے۔جس کے دل میں آزادی کی تڑپ اور لگن ہے۔وہ امن وسکون چاہتا ہے اور کشمیر کی خوشحالی اور ترقی کا خواہاں ہے۔اسے ظلم و جبر اور استحصال سے سخت نفرت ہے۔ہندو مسلم اور سکھ اتحاد کا حامی ہے۔فرقہ وارانہ ہم

آہنگی اور بھائی چارے کا علمبردار ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب ہندوؤں کا مندر سے شنکھ چوری ہوتا ہے تو وہ اس کو ڈھونڈنے کے لئے اپنی جان کا نذرانہ دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔اس ضمن میں ناول سے اقتباس دیکھیں۔

''شنکھ بدری کا نہیں بلکہ مندر کا ہے۔مندر اور مسجد کشپ رشی کی اس دھرتی کی وراثت ہیں۔عبدل نے کہا۔۔۔۔۔۔یہ شنکھ ضرور ڈھونڈ لیا جائے گا۔چاہے مجھے اس کے لئے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔''۵۵؎

عبدل کا کردار ایک حساس، دردمند، اخوت و بھائی چارے کا علمبردار اور امن و خوشحالی کا متمنی اور وسیع ذہن اور با اخلاق انسان کا ہے۔ جو ہر کسی کے لیے بہتری چاہتا ہے اور دوسروں کے لئے ایثار و قربانی کا جذبہ رکھتا ہے۔عبدل کا کردار ایک متحرک کردار ہے جو حالات و واقعات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنا جانتا ہے۔وہ حالات کے سامنے جھکنے کے بجائے ان کو تبدیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔عبدل کا کردار جہاں مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے وہیں دوسرے مذاہب کے لوگوں سے اخوت و بھائی چارے اور احساس و ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے۔جو ایک بہترین کردار کی پہچان ہوتی ہے۔آنند لہر کے بہترین کرداروں میں سے عبدل ایک ہے۔دیگر کرداروں میں بدری کا کردار قاری کی توجہ کا باعث بنتا ہے۔بدری جو کہ ایک پجاری ہے۔ناول میں علامتی انداز میں کشمیری ہندوؤں کی نمائندگی کرتا ہے۔بدری کا کردار متحرک نظر نہیں آتا۔کیونکہ مندر کا پجاری ہونے کے باوجود مندر سے شنکھ چوری ہونے پر کوئی احتجاج نہ کرنا نیز اس کی تلاش کے لیے کوئی کوشش نہ کرنا اور پھر اس کے غم میں کھانا پینا چھوڑ دینا اور پاگلوں کی طرح گھومنا ایک متحرک اور اعلیٰ کردار کے پہچان نہیں۔اس کے علاوہ ریشماں کا کردار بھی قاری کی توجہ کا باعث بنتا ہے۔ریشماں جو ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔بالکل ان پڑھ ہے لیکن ایثار و قربانی کا جذبہ رکھتی ہے۔ایک حساس اور دردمند انسان ہے۔مندر سے ہندووں کا شنکھ چوری ہونے پر ان سے ہمدردی جتلاتی ہے اور نیا شنکھ خریدنے کے لئے اپنے تمام زیورات دینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ریشماں کا کردار ایک حساس اور بہادر عورت کا کردار ہے۔جو حالات کا مقابلہ کرنا جانتی ہے۔جس کا اندازہ ان مکالموں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔مندر سے شنکھ چوری ہونے پر کہتی ہیں۔

''یہ پوٹلی لو''

''اس پوٹلی کے اندر کیا ہے؟''سلیمان نے پوچھا۔

''اس پوٹلی کے اندر میری تین پشتوں کی پونجی ہے۔میرے زیور ہیں بیچو اور بدری کے لیے کہیں سے نیا شنکھ لے آو۔''۵۶؎

مندجہ بالا مکالموں سے جہاں ریشماں کی دوسرے مذاہب کے لوگوں کے تئیں ہمدردی اور احساس کا اندازہ ہوتا ہے وہیں اس کی حالات کے پیش نظر ہمت اور دلیری بھی ظاہر ہوتی ہے۔دیگر کرداروں میں سلیمان، اکبر اور رشید بھی قاری کی توجہ کا باعث بنتے ہیں۔سلیمان ایک کسان اور سماجی کارکن کا کردار ادا کرتا ہے۔سلیمان ظلم کے خلاف الم بلند کرنے والا ایک نڈر اور بے باک شخص ہے۔جسے اسی پاداش میں اس دن گولی کا نشانہ بنایا گیا جس دن مہاتما گاندی کو شہید کیا گیا تھا۔اکبر اور رشید سلیمان کے بیٹے ہیں۔اکبر ٹرینگ کے لیے سرحد کے اس پار چلا جاتا ہے جہاں تربیتی کیمپوں میں لوگوں پر ہونے والے ظلم وستم اور ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتا ہے اور اس جرم میں اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا جاتا ہے۔رشید بے ایمانی، رشوت، ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور اسے جیل میں قید کیا جاتا ہے۔مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو عبدل، ریشماں، سلیمان اور رشید اس ناول کے بہترین کردار ہیں جو متحرک کردار کے فرائض انجام دیتے ہیں۔جبکہ غلام، کیپٹن اور کمانڈر منفی کردار کے طور پر استعمال کئے گئے ہیں۔اسلم اور شانتی اس ناول کے ضمنی کردار ہی۔جو مختصر وقت کے لئے اپنی جھلکیاں دکھا کر غائب ہوجاتے ہیں۔لہر نے اس ناول میں فن کردار نگاری کو بڑی ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔

ناول''سرحدوں کے بیچ''میں آنند لہر نے حالات وواقعات کے پیش نظر چھوٹے بڑے کئی کردارں کو پیش کیا ہے۔رانی اس ناول کا مرکزی کردار ہے جس کے اردگرد کہانی شروع سے آخر تک گھومتی ہے۔دیگر ضمنی کردار اسی کردار کے سہارے کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ناول کے تمام تر کردار حقیقی زندگی سے بالکل قریب ہیں۔کہانی کے کردار اگرچہ سادہ ہیں لیکن قاری کو بخوبی متاثر کرتے ہیں۔

رانی کا کردار خاص طور پر کہانی میں دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔رانی ۱۸ برس کی ایک حسین لڑکی غربت ومفلسی میں زندگی گزار رہی ہوتی ہے۔جسے بغیر کسی جرم کے الزام لگا کر قید کر دیا جاتا ہے۔اس لئے ناول کے دیگر کرداروں کی ہمدردی اس کے ساتھ ہے۔رانی کا کردار حسن وجمال کی وجہ سے بھی توجہ کا باعث بنتا ہے اور غربت ومفلسی کی وجہ سے بھی۔رانی کا کردار جہاں ایک طرف اس کے حسن، غربت، بےبسی اور اس کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وجہ

سے قاری کی دلچسپی کا ذریعہ بنتا ہے اوراس کے تئیں دل میں احساس وہمدردی پیدا کرتا ہے۔وہیں دوسری طرف بعض ایسے پہلو بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں جوانی کے کردار کے منفی پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔قید کے دوران ایک انجان پولیس آفیسر سے دل لگا بیٹھنا، پھراس سے جسمانی تعلقات قائم کرنا،ناجائز بچے کو جنم دینا، بے گناہ ہونے کے باوجود ایک انجان انسان کی محبت کے لئے اقرار جرم کرنا ایک اچھے کردار کے اوصاف نہیں ہیں۔اس کے علاوہ قید سے رہائی کے بعد جب اسے اپنے وطن واپس بھیجا جاتا ہے تو اپنے بچے کے لئے کوئی احتجاج نہ کرنا ایک متحرک اور جاندار کردار کی پہچان نہیں ہے۔رانی کے علاوہ اس ناول کا دوسرا بڑا کردار راجہ ہے۔راجا جو کہ ایک خوبصورت جوان ہے اور پولیس انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔راجہ کا کردار ایک ایماندار اور رحم دل انسان کا کردار ہے۔جو اپنی کئی خوبیوں کی وجہ سے دلچسپی کا مرکز بنتا ہے۔وہ دیگر پولیس والوں کی طرح رشوت خور، بے ایمان اور ظالم و جابر نہیں ہے۔دراصل راجا کا کردار بڑا دلچسپ ہے۔وہ رانی سے پیار کرتا ہے لیکن پیار میں ایثار وقربانی کا جذبہ رکھتا ہے۔رانی کو حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔جب اس کی ڈیوٹی رانی سے پوچھ تاچھ پر لگائی جاتی ہے تو وہ رانی پر ظلم نہیں کرسکتا۔جس پر پولیس والے اسے غلط نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اس پر الزامات لگاتے ہیں لیکن وہ ان سب کی پرواہ کئے بغیر رانی کا ساتھ نبھانے کے لئے ڈٹ جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مجرم کو مارنے کے بجائے اس سے خود مار کھانے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔جس کی منظر کشی آنند لہر نے یوں کی ہے۔

''یہ سن کر راجہ کو لگا کہ غلاماں دروازہ توڑ کر اندر آجائے گا۔اس نے رانی سے پھر التجا کی۔مجھے مارو رانی مجھے مارو۔''
میں ایسا نہیں کرسکتی۔رانی نے کہا۔۷۵

اگر چہ قانون کے ہاتھوں مجبور ہوکر وہ رانی کو حاصل نہیں کرسکتا لیکن اس کو پانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے اور ناول میں شروع سے آخر تک متحرک نظر آتا ہے۔جس کی وجہ سے قاری کی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔اس کے علاوہ ''غلاماں'' کا کردار بھی اہم ہے۔جو ایک ظالم و جابر انسان کا کردار ادا کرتا ہے۔اپنے رفقا کار میں وہ سب سے زیادہ ظالم ہے اسی لئے وہ سب سے زیادہ مشہور بھی ہے۔جس کے متعلق ناول نگار لکھتے ہیں۔

''غلاماں اس جگہ کا سب سے مشہور آدمی تھا۔رحم نام کی کوئی چیز اس کے

دل میں نہیں تھی۔'' ۵۸

اس کے علاوہ سدانند کا کردار بھی قاری کی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ جو ایک اصول پرست اور رحم دل انسان ہے۔اس کی وجہ سے رانی کو جیل میں تھوڑی بہت آسانی ملتی ہے۔ وہ رانی کو جیل سے رہا کروانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔جس میں وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بالآخر رانی کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو برداشت نہیں کرسکتا اور نوکری سے مستعفی ہوکر مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔سمدہ قصائی جو کہ ایک سزا یافتہ قیدی ہے اور اب جیل کو ہی اپنا گھر سمجھتا ہے۔سزایافتہ ہونے کے باوجود حتی الامکان رانی کی مدد کرتا ہے۔ ہمدرد خان کا کردار بے رحمی ،نفرت اور بے ایمانی کے لئے استعمال کیا ہے۔ دیگر کرداروں میں گلشن اور ثریا بھی قاری کی توجہ کا باعث بنتی ہیں۔ جو رانی کے ساتھ قید کی زندگی گزارتی ہیں۔ جو بے گناہ ہیں لیکن غلط الزامات لگا کر سزا سنائی گئی ہے۔ وہ وہاں طرح طرح کے ظلم اور سزائیں برداشت کر رہی ہیں۔حالات کے سامنے بالکل بے بس ہیں اور کسی طرح کے احتجاج اور اعتراض کی ہمت نہیں رکھتیں۔گلشن اور ثریا کے کردار ناول نگار نے بے بس ،مظلوم اور بے قصور عورتوں کے سماج میں ہونے والے استحصال کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیے ہیں۔ جو بے گناہ ہونے کے باوجود سماج میں ظلم وعتاب کا شکار ہو رہی ہیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔اس کے علاوہ رام غلام ،حکما اور نظیر ایسے کردار ہیں جو تھوڑے وقت کیلئے ناول میں دکھائی دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر ناول کے مطالعے سے لگتا ہے کہ ناول نگار نے بالکل فطری کرداروں کا استعمال کیا ہے۔ جو ہماری زندگی کے بالکل قریب نظر آتے ہیں۔لہر نے زیادہ تر سپاٹ کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔زیر بحث ناول میں آنند لہر نے جس مقصد کو پورا کرنے کے لئے کرداروں کا انتخاب کیا ہے اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔لیکن کرداروں کے حوالے سے ایک بات جو مطالعے کے دوران محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ آنند لہر نے کرداروں کی پیشکش میں تھوڑا طرفداری سے کام لیا ہے۔ناول میں تمام منفی کردار سماج کے ایک مخصوص طبقے کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ جبکہ تمام مثبت کرداروں کا انتخاب دوسرے طبقے سے کیا ہے جو ایک بے باک اور بڑے فن کار کا خاصہ نہیں ہے۔مثال کے طور پر اگر دیکھا جائے تو نفرت ، بے ایمانی ،ظلم وستم اور رشوت خوری جیسے مسائل کو پیش کرنے کیلئے انہوں نے ہمدرد خان ،نظیر اور غلاماں جیسے کرداروں کا انتخاب کیا ہے جو ایک مخصوص مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔جبکہ پیار ومحبت ،اخوت ،رحم دلی اور احساس و ہمدردی جیسی صفات کو پیش کرنے کے لئے سدانند ،رانی ،راجہ اور

ڈاکٹر ہمیش جیسے کردار استعمال کیے ہیں۔جن کا تعلق دوسرے مذہب سے ہے۔یہاں پر آنند لہر کا مشترکہ تہذیب اور ہندو مسلم سکھ اتحاد والا فلسفہ تھوڑا متزلزل نظر آتا ہے۔کیونکہ انہوں نے ناول میں تمام تر منفی پہلوؤں کو پیش کرنے کے لئے کرداروں کا انتخاب ایک طبقے سے جبکہ مثبت پہلوؤں کو پیش کرنے کے لئے کردار دوسرے طبقے سے ہیں۔اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ اچھے اور برے لوگ ہر سماج میں پائے جاتے ہیں لیکن تمام تر بری خصلتوں کو ایک طبقے سے جوڑنا اور تمام اچھے اوصاف کو دوسرے طبقے سے منسوب کرنا قاری کے لئے فکر کا باعث ضرور بنتا ہے۔یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ ہر سماج اور ہر طبقے میں منفی اور مثبت کردار موجود ہوتے ہیں لیکن کوئی بھی طبقہ غلطیوں سے سراسر مبرا یا بالکل غلط نہیں ہوتا۔بہر حال ناول نگار نے جس مقصد کو واضح کرنے کے لئے کرداروں کا انتخاب کیا ہے اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

ناول ''یہی سچ ہے'' کا قصہ پیش کرنے کے لئے لہر نے چھوٹے بڑے کئی کردار استعمال کئے ہیں۔شنکر، شیو، ناگپال، کوشل، دھرم پال اور سریش ناول کے اہم کردار ہیں۔اس کے علاوہ ساوتری، سریش، رمیش، دھرم ویر، آشا، سدھیر، گوپال داس اور نلنی کے کردار بھی قاری کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔مختلف سماجی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے ناول نگار نے مختلف کرداروں کا انتخاب کیا ہے۔ناول کے تمام تر کردار ہمارے سماج سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں شنکر اور شیو دو بھائی ہیں اور ساوتری ان کی بہن ہے جبکہ کوشل ساوتری کا خاوند ہے۔یہ چار ناول کے اہم کردار ہیں۔پورا ناول انہیں کے ارد گرد گھومتا ہے۔

شنکر محکمہ پولیس میں ملازم ہے۔رشوت نہیں لیتا جو آج کے وقت میں بڑی خوبی ہے لیکن دنیا میں جینے کا ہنر اسے نہیں آتا۔وہ دنیا سے بالکل بیزار ہو جاتا ہے۔رشوت نہ لینا اور آخرت کی بہتری کے لئے سوچنا اچھی بات ہے۔لیکن دنیا کے تمام کاموں کو بالکل نظر انداز کر دینا، اپنی بیوی کے حقوق ادا نہ کرنا، اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہ کرنا، ایک اچھے انسان کے اوصاف نہیں ہیں۔اس کی لا پرواہی سے اس کی بیوی طویل علالت کے بعد مر جاتی ہے جبکہ ایک بچہ چور بن جاتا ہے اور دوسرا بیماری میں عیادت نہ ہونے کی وجہ سے مر جاتا ہے۔سماج میں لوگوں کے ساتھ اس کا رویہ اچھا نہیں ہے اور نہ ہی وہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کا مالک ہے۔یہ ایک سپاٹ کردار ہے۔حالات و وقت کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے کا اس میں بالکل مادہ نہیں۔

دوسرا اہم کردار شو کا ہے۔جو رشوت خور ہے لیکن اس کے اندر بعض ایسی خوبیاں موجود ہیں۔جن کی وجہ سے

سماج میں اس کی عزت ہے اور لوگ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔اس کا یہ ارادہ ہے کہ سماج سے برائیوں کو ختم کرنے کے لئے اگر اسے غلط کام کرنے پڑیں تو کوئی مسلہ نہیں۔وہ خود رشوت لیتا ہے لیکن چاہتا ہے کہ اس کے بیٹے ایسے بن جائیں تا کہ انہیں رشوت نہ لینی پڑے،اور وہ سماج میں لوگوں کے کام آسکیں اور سماج سے رشوت خاتمہ کر سکیں۔وہ دنیاوی زندگی بہتر طریقے سے گزارنے کا متمنی ہے۔اعلیٰ اخلاقی قدروں کا مالک ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ایک رشوت خور ہونے کے باوجود سماج میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ناول میں کوشل کا کردار بھی قاری کی دلچسپی کی توجہ کا باعث بنتا ہے۔کوشل ساوتری کا خاوند اور شنکر اور شو کا بہنوئی ہے۔کوشل بھی رشوت نہیں لیتا لیکن اس کے اندر دیگر کئی ایسی خامیاں ہیں کہ جس کی وجہ سے اس سماج میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔کوشل کا کردار ایک منفی کردار ہے۔اس کے کردار میں دوغلہ پن ضرور ہے۔اسکے اندر عجیب کشمکش ہے۔وہ رشوت نہیں لیتا لیکن لوگوں پر احسان جتلاتا ہے وہ جہیز نہیں لیتا جو کہ اس کی خوبی ہے لیکن بیوی کو ہر وقت احسان جتلاتا ہے۔غریب گھرانے کی عورت سے شادی ضرور کرتا ہے لیکن اس پر اس بات کا رعب بنانا چاہتا ہے۔اسے اپنی ایمانداری کا غرور ہے۔اپنے سوا کوئی دوسرا ایماندار نظر نہیں آتا۔وہ اپنے رشتہ داروں کو کم درجے کا سمجھ کر ان سے فاصلہ رکھتا ہے اور اپنی بیوی اور بچے کو بھی لوگوں سے فاصلہ رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔کوشل کے اندر احساس،ہمدردی اور اخلاق کی کمی ہے۔جس کی وجہ سے سماج میں اس کی کوئی قدر نہیں۔اس کے غلط رویے کی وجہ سے اس کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور ساتھ میں بچہ بھی چلا جاتا ہے۔بالآخر ذلت اور رسوائی کے سوا اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔کوشل ایک ایسا کردار ہے جو اخلاقی قدروں سے گرا ہوا اور بےحسی کا شکار ہے۔اچھا عہدہ ہونے کے باوجود خوشگوار اور پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا۔ساوتری کا کردار ایک خوددار عورت کا کردار ہے۔جو صرف عہدہ نہیں بلکہ پیار چاہتی ہے اور نہ ملنے پر صرف عہدے اور دولت کے لئے کسی کے رعب میں دبنا نہیں چاہتی۔اس کے علاوہ ناگپال کا کردار بھی اہم ہے۔جو رشوت خور ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر کئی بدکاریوں میں ملوث ہے۔ناگپال لوگوں سے رشوت لیتا ہے اور ان کے کام نہیں کرتا۔پیسے اپنی بیوی پر نہیں خرچ کرتا بلکہ شراب پینے جوا کھیلنے میں صرف کرتا ہے۔سریش شنکر کا بڑا لڑکا ہے آشا سے محبت کرتا ہے۔آشا ایک متمول گھرانے کی خوبصورت لڑکی ہے۔سریش آشا کی محبت میں جلتا ہے لیکن غربت آڑے آجاتی ہے۔وہ آشا کو خوب چاہتا ہے لیکن اس سے محبت کا اظہار اس لئے نہیں کرتا کیونکہ وہ غریب ہے اور اپنے آپ کو آشا کے قابل نہیں سمجھتا۔

زیرِ نظر ناول میں مصنف نے کرداروں کی کشمکش کو بیان کرتے ہوئے سماج میں بسنے والے کئی طرح کے لوگوں کے چہروں سے پردہ ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کچھ لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود اپنی زندگی چین وسکون سے نہیں گزار سکتے اور نہ ہی سماج میں کوئی اچھا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ جب کہ بعض لوگ ایک معمولی عہدے پر رہ کر بھی اور مال و دولت نہ ہوتے ہوئے بھی لوگوں کے دل جیت لیتے ہیں۔ زندگی خوشحال گزارتے ہیں۔ اولاد کی بہتر تربیت کرنے کے ساتھ ساتھ رشتوں کو نبھانا بھی خوب جانتے ہیں۔

جہاں تک آخری ناول نامدیو کے کرداروں کا سوال ہے تو دراصل اس ناول میں ناول نگار نے کئی چھوٹے چھوٹے قصے بیان کیے ہیں۔ جن کو پیش کرنے کے لئے مختلف کرداروں کا سہارا لیا ہے۔ جن میں گوبند، نامدیو، کلپنا، کرم دیو، آشا، نیرو اور نیما کے کردار خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جبکہ ضمنی کرداروں میں کانتا دیوی، شانتی، رجو، گورجاں، نمبردار، ساوتری، سریتا اور ہرجیت بھی تھوڑی دیر کیلئے قاری کی توجہ کا باعث بنتے ہیں۔ ناول میں راؤنڈ اور سپاٹ دونوں طرح کے کردار دیکھنے کو ملتے ہیں۔ گوبند ناول کا اہم کردار ہے۔ جو خوشحال زندگی گزار رہا ہوتا ہے لیکن وقت بدلنے پر اس کا رویہ بالکل بدل جاتا ہے۔ دوسری شادی کی خواہش پوری کرنے کے لئے اپنے بچوں سے اچھا سلوک نہیں کرتا۔ کم عمر کی لڑکی آشا سے شادی کرتا ہے۔ ایک فرماں بردار اور سلیقہ مند بیوی ہونے کے باوجود اس سے نفرت رکھتا ہے اور اس الزامات لگاتا ہے۔ مال ودولت کی لالچ میں اپنی کم سن لڑکی کی شادی ایک ادھیڑ عمر کے مرد سے کراتا ہے۔ دراصل گوبند کا کردار ایک ایسا کردار ہے۔ جس میں نفرت، حسد، لالچ اور خودغرضی کارفرما ہے۔ جو اپنے مفاد کے لئے ضمیر کا سودا کرسکتا ہے۔ جس کے اندر انسان کی قدر نہیں۔ دوسرے کرداروں میں نامدیو کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ نامدیو گوبند کا لڑکا ہے۔ جس کی والدہ کا انتقال اس کے جنم کے فوراً بعد ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی بہن اس کی پرورش کرتی ہیں۔ نامدیو ایک خوبصورت لڑکا ہے۔ جس کے دل میں محبت اور ایثار وقربانی کا جذبہ ہے۔ اسے خوبصورت چیزوں سے بہت پیار ہے۔ نامدیو جب جوان ہوتا ہے تو اس کی دلچسپی خوبصورت لڑکیوں میں بڑھ جاتی ہے۔ وہ سب سے پہلے کسم نام کی ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ کسم ایک غریب گھرانے کی لڑکی تھی جس کی اسکول فیس نامدیو ٹیوشن پڑھا کر ادا کرتا ہے لیکن اسے حاصل نہیں کرسکتا۔ اس کے بعد وہ نیرو سے دل لگاتا ہے جو بارہویں جماعت میں اول آتی ہے اور اسے ڈاکٹری میں سیٹ مل جاتی ہے۔ سیٹ ملنے کے بعد اس کا رویہ بالکل بدل

جاتا ہے۔اور یوں ایک بار پھر نامدیو محبت کی بازی ہار جاتا ہے۔

نامدیو کی زندگی میں سب کچھ اچانک آتا ہے۔اور ہر بار اس کو رسوائی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔نیرو کے بعد اس کی زندگی میں نیما نام کی لڑکی آتی ہے۔جسے پانے میں وہ اس لئے ناکام ہوتا ہے چونکہ نیما دوسرے گاؤں کی ہے اور ان دونوں کے گاؤں کی آپس میں دشمنی ہے۔دونوں گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔گاوں کے آپس میں فٹ بال میچ ہوتے ہیں۔جس میں گاؤں کا نمبردار اپنے گاؤں کے ہرجیت سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر وہ میچ جیت کر اس کا نام اونچا کرے گا تو وہ اس کے بدلے اس کی شادی نیما سے کرائے گا۔بالآخر ایسا ہی ہوتا ہے ہرجیت کی ٹیم میچ جیت جاتی ہے اور نمبردار نیما کی شادی زبردستی ہرجیت سے کرا دیتا ہے۔نامدیو کے ہاتھ سے یہ موقعہ بھی چلا جاتا ہے۔جس کے فراق میں وہ کئی بیماریوں میں مبتلا ہو کر موت کے آغوش سو جاتا ہے۔دراصل نامدیو کے کردار ایک ایسا کردار ہے جس کے ذریعے مصنف نے سماج میں محبت کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کو پیش کرنے کر ساتھ دیگر کئی سماجی برائیوں کو اجاگر کیا ہے۔

آشا کا کردار ایک سلیقہ مند عورت اور فرماں بردار بیوی کا ہے۔آشا کا تعلق غریب خاندان سے ہونے کی وجہ سے اس کی شادی بڑی عمر کے مرد سے کرا دی جاتی ہے۔آشا خاوند کے حقوق ادا کرنے کیلئے ہر وقت تیار رہتی ہے لیکن عمر میں زیادہ فرق ہونے کی وجہ سے ان کے رشتے میں وہ سکون نہیں آسکتا۔مصنف نے سماج میں ہونے والی بے جوڑ شادیوں اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو پیش کرنے کے لئے یہ کردار استعمال کیا ہے۔کسم اور نیرو کے کردار تھوڑی دیر کے لئے ناول میں قاری کی توجہ کا باعث بنتے ہیں۔نمبردار کا کردا ظالم و جابر کا کردار ہے۔جو اپنی طاقت کا غریبوں پر بے جا استعمال کرتا ہے اور اپنی انا کو تسکین دینے کے لئے حق و انصاف کو دباتا ہے۔مجموعی طور سے دیکھا جائے تو آنند لہر نے کردار نگاری کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔

## منظر کشی

منظر کشی بھی ناول کا اہم جز ہے۔منظر کشی سے مراد ہے کسی بھی چیز،جگہ یا واقعہ کا ایسا نقشہ کھینچنا کہ اس کی تصویر قاری کی نظروں کے سامنے پھر جائے۔ناول میں میلوں ٹھیلوں کا ذکر،موسموں کا بیان، پہاڑوں اور آبشاروں کا منظر،آبادیوں کے نقشے وغیرہ کی منظر کشی کی جاتی ہے۔ناول نگار کو چاہئے کے وہ ناول میں پیش آنے والے مناظر کو اس طرح پیش کرے کہ پڑھنے والے کو لگے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔منظر کشی کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ

منظر کرداروں کے پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوں۔منظر نگاری کا ذکر کرتے ہوئے علی عباس حسینی لکھتے ہیں۔

''اس مقام پر یہ نقطہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ منظر کرداروں کے مختلف سیرتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لئے لکھا جاتا ہے نہ کہ محض صبح وشام، گرما وسرما کی تصویر کشی کے لئے۔شرر وطبیب نے اس سلسلے میں جو غلطی کی ہے وہ یہی ہے کہ اپنی سماں بندی سے صحیح طور پر پس منظر کا کام نہیں لیا ہے۔''۵۹

جہاں تک آنند لہر کے ناولوں میں منظر کشی کا تعلق ہے تو آنند لہر اپنی کہانیوں میں کئی حادثات وواقعات کی تصویر کشی کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔انہوں نے بعض مقامات وواقعات کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ ان کی جیتی جاگتی تصور نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔بعض مناظر ایسے بھی ہیں جن کی منظر کشی کرنے کی انہوں نے کوشش ضروری ہے تاہم اس قدر حق ادا نہیں کر سکے جتنا ایک بڑے فنکار سے امید کی جاتی ہے۔

ان کے پہلے ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کی اگر ہم بات کریں تو اس میں انہوں نے منظر نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔جس کی مثالیں یہاں بطور نمونہ پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔قبائلی جب مندر سے شنکھ چوری کرتے ہیں تو اس منظر نامے کی تصویر کشی آنند لہر یوں کرتے ہیں۔

''غلام آگے بڑھا۔پھر اس نے آہستہ سے مندر کا دروازہ کھولا۔اسے کپکپی ہونے لگی، تھر تھر کانپنے لگا۔اس نے دل میں سوچا مندر کی بے حرمتی کرو یا مسجد کی، کپکپی ایک ہی طرح سے ہوتی ہے۔اس نے محسوس کیا کہ گناہ ہندو کرے یا مسلمان، وہ گھبراتا ایک ہی طریقے سے ہے۔''۶۰

ایک اور مثال دیکھیں جس میں آنند لہر نے کشمیر میں ہو رہے ظلم وستم اور معصوم عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی منظر کشی کی ہے۔

''وہ پٹھان پھر نجمہ پر جھپٹا۔وہ چیخنے لگی اور کہنے لگی۔

''اللہ مجھے اس درندے سے بچا۔'' یہ سن کر دوسرے پٹھان نے کہا۔

''تجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا۔تو تو کیا اب کشمیر کو بھی کوئی نہیں بچا

سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہوگئی۔ پھر ایک چڑیا کی آواز آئی جو یہ کہہ رہی
تھی۔ ''نجمہ کا بلاتکار کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ مذہبی کتابوں میں یہ لکھا ہے
کہ یہ گناہ ہے۔ آئین کی کتابوں میں یہ جرم ہے۔'' کہانی سنا کر وہ
عورت بت کی طرح کھڑی ہوگئی عبدل نے اسے ہلایا اور کہا۔''
''سلسلہ جاری رکھو''
''پٹھان وہاں سے چلے گئے اور پھر رشید گھر کے اندر داخل ہوا۔ اس نے
دیکھا کہ نجمہ مر گئی ہے۔ اس کی لاش صاف ظاہر کر رہی تھی کہ اس کے
ساتھ بلاتکار ہوا ہے۔''۶۱

اسی طرح ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں بھی آنند لہر نے بعض مقامات کی خوبصورت تصویر کشی کی ہے۔ زیر نظر ناول سے ایک مثال ملاحظہ کریں جس میں آنند لہر نے رانی کی جیل سے رہائی کا منظر پیش کیا ہے۔ رانی جیل سے رہا ہوتی ہے تو اس کا عاشق راجہ اپنے خاندان کے ساتھ بڑے جوش وخروش کے ساتھ اسے لینے آتا ہے لیکن رانی کو واپس اس کے وطن بھیج دیا جاتا ہے۔ جس سے راجہ کی ساری امیدیں ختم ہو جاتی ہیں۔

''جیل کا دروازہ کھلا۔ رانی اور اس بیٹا باہر آئے مگر ہار لوگوں کے ہاتھوں
میں ہی رہ گئے۔ ڈولی والے دلہن کو بٹھانے کا انتظار ہی کرتے
رہے۔ ڈھول بجانے والوں کے ہاتھ رک گئے۔ رانی اور اس کے بیٹے
کو ایک پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ گاڑی چلنے لگی۔ اس گاڑی کے
پیچھے راجہ اور اس کے رشتہ داروں کی گاڑیاں بھی چلنے لگیں۔''۶۲

اس کے علاوہ اسی ناول سے ایک اور مثال ملاحظہ کریں۔ جس میں مصنف نے رانی کی خوبصورتی کا نقشہ کھینچنے کی سعی کی ہے۔

''رانی بہت خوبصورت تھی۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بہت نازک
تھیں۔ لگتا تھا جیسے خوبصورت پھولوں کی ٹہنیوں سے نازک پتیاں
جھانک رہی ہوں اور ہونٹ جیسے کنول کے پھولوں پر گلاب کا رنگ مل

دیا گیا ہو۔ چہرہ جیسے سورج اپنی روشنی برف میں ڈبو کر بھیج رہا ہو۔''۶۳؎

ناول ''یہی سچ ہے'' میں بھی بعض مقامات واقعات ایسے ہیں جن کی آنند لہر نے خوبصورت منظر کشی کی ہے۔بعض واقعات کا خاکہ فن کارانہ چابکدستی سے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا عکس قاری کی نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ناول میں ایک جگہ جہنم کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ''جانتے ہو جہنم کی آگ کیا ہوتی ہے۔فرشتے آنکھیں نکال دیتے ہیں انسان کو کڑاہوں میں ڈالا جاتا ہے۔جن میں جلتا ہوا تیل ہوتا ہے۔خون اور پاک کے دریاؤں سے گزرنا پڑتا ہے۔''۶۴؎

ایک اور مثال ملاحظہ کریں۔جس میں شنکر کی غربت اور اس کی وجہ سے اس کی بیوی کی بے بسی کا نقشہ کھینچا ہے۔

> ''شنکر ایک بت کی طرح خاموش کھڑا رہا۔اس کی بیوی نے اپنی چھاتی کی طرف دیکھا۔ان میں دودھ اس لئے نہیں ہے کیونکہ اس کے لڑکے کی عمر چھ برس کی ہے اور بازار سے دودھ اس لئے نہیں لا سکتے کیونکہ وہ غریب ہیں اور غریبی کی وجہ شنکر کی ایمانداری ہے۔''۶۵؎

ناول ''نامدیو'' میں بھی آنند لہر نے کئی مقامات اور حالات کی عمدہ منظر کشی ہے۔نامدیو میں ایک جگہ ساوتری کے حسن کی تصویر کشی یوں کی ہے۔

> ''ساوتری کے ہاتھ انتہائی خوبصورت تھے اور ہاتھوں کی انگلیاں بھی لمبی تھیں اور ان کی ترتیب پھول کی پنکھڑیوں سے ملتی جلتی تھی۔جیسے پھولوں کی پنکھڑیاں چھوٹی بڑی ہو کر پھول کو سجاتی ہیں اسی طریقے سے ساوتری کی انگلیاں بھی چھوٹی بڑی ہو کر اس کے ہاتھوں کو سجاتی تھیں۔اصل میں ساوتری خوبصورت تھی اور سرتاپا خوبصورت تھی۔''۶۶؎

نامدیو اور نیما ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔نیما جب نامدیو سے جدا ہوتی ہے تو نامدیو کو بہت ناگوار گزرتا ہے اور وہ دور تک اس کا راہ دیکھتا ہے۔اس منظر کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے۔

''جانے سے پہلے نیماں نامدیو کی طرف دیکھ رہی تھی اور دیکھتی ہی جا رہی تھی۔ادھر نامدیو بھی ایسا ہی کر رہا تھا۔انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ ان کا رشتہ یگوں سے ہے گو وہ ایک دوسرے سے ابھی ابھی ہی ملے تھے۔کافی دیر تک نامدیو اس راستے کی طرف دیکھتا رہا جدھر سے نیماں اپنے گاؤں واپس گئی تھی اور صبح اٹھ کر اس راستے کو صاف بھی کرتا اور لوگوں سے کہتا اسے گندہ مت کرو۔'' ۶۷

## مکالمہ

مکالمہ ناول کا اہم جز ہے۔چونکہ ناول کی بنیاد کسی نہ کسی قصے پر ہوتی ہے اور قصہ کرداروں کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔کردار قصے کو بیان کرنے کے لئے آپ میں بات چیت کرتے ہیں۔کرداروں کی یہی باہمی گفتگو مکالمہ کہلاتی ہے۔یہ ایک ایسا ہنر ہے جو مصنف اپنی مرضی سے استعمال کر کے کرداروں سے جو چاہے کہلوا سکتا ہے۔لیکن ناول نگار کو مکالموں کے صحیح اور بروقت استعمال کرنے کا ہنر آنا چاہئے۔مکالمہ قصے کو روشنی بخشتا ہے۔اس میں جان پیدا کرتا ہے نیز قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔اس لئے ناول نگار کو مکالمے کے فن پر دسترس ہونی چاہئے۔مکالمے کو ادبی سلیقے سے پیش کرنا ضروری ہے۔مکالمہ ہر کردار کی فطرت اور اس کی خصوصیات کو پرکھنے کے لئے ضروری ہے۔اس لئے ناول نگار کو چاہئے کہ وہ مکالمے کو عمدہ بنانے کی حد درجہ کوشش کرے۔مکالمہ کے بارے میں ڈاکٹر محمد احسن و ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی لکھتے ہیں۔

''اچھے مکالمے لکھنا بھی ایک فن ہے۔مکالمہ لکھتے وقت ناول نگار پورے طور پر ڈرامہ نگاری کے دائرے میں آجاتا ہے۔اچھا مکالمہ قصے کو ایک نئی روشنی بخشتا ہے اور ڈرامائی قوت عطا کرتا ہے۔قصہ کے ارتقاء میں مکالمہ کا بہت کافی حصہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعے سے واقعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔غیر ادبی ناولوں میں عام طور پر زیادہ تر مکالمہ ہی ہوتا ہے۔'' ۶۸

جہاں تک آنند لہر کی مکالمہ نگاری کا تعلق ہے تو ان کے ناولوں کے مطالعہ سے لگتا ہے کہ وہ مکالمہ نگاری کے

فن پر بھی دسترس رکھتے تھے۔کم لفظوں میں اپنی بات کو مکمل کرنے کا ہنر آنند لہر کو خوب آتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے ناولوں کو غیر ضروری اور طویل مکالموں سے محفوظ رکھا ہے۔ان کے مکالمے بالکل کرداروں کے حسب حال ہوتے ہیں۔ناول اگلی سے پہلے میں قبائلی کشمیر پر حملہ کرتے ہیں اور یہاں کی مشترکہ تہذیب اور اتحاد کو منتشر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس ضمن میں قبائلیوں کی زبان سے ادا کیے جانے والے مکالمے ملاحظہ کریں۔

''یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان ضرور کہیں مگر خیال رکھنا کہیں سچ مچ اسلام
کے اصولوں پر نہ چل پڑی۔''
''ایسا نہیں ہونے دیں گے۔دوسرے پٹھان نے جواب دیا۔''
''یہ بات بھی اچھی طرح سے جان لو کہ اگر یہ لوگ اسلام کے اصولوں پر
چلیں گے تو پھر دہشت گرد نہ بن سکیں گے۔''۶۹

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' میں بھی آنند لہر نے خوبصورت مکالموں کا استعمال کیا ہے۔جیسا کہ انہوں نے اس ناول میں سادہ اور فطری کرداروں کا استعمال کیا ہے۔ویسے ہی کرداروں کی فطرت کے مطابق اور موقع ومحل کی مناسبت سے عمدہ مکالمے بھی استعمال کیے ہیں۔جو قاری کی توجہ کا باعث بنتے ہیں۔طویل اور غیر ضروری مکالمات سے گریز کیا ہے۔مکالموں سے کرداروں کی صفات اور نفسیاتی کیفیات ابھر کر سامنے آتی ہیں۔''سرحدوں کے بیچ'' سے خوبصورت مکالموں کی چند مثالیں دیکھیں۔

''لگتا ہے راجہ کے ابھی دودھ کے دانت ہیں۔مجھے خود
ہی کاروائی کرنی پڑے گی۔''
''تو پھر یہ سرحد پیار کرنے والوں کو روکتی کیوں نہیں۔''
''رانی کو اس بات کی سمجھ آ گئی تھی کہ وکیل چاہے کتنا بڑا
کیوں نہ ہو۔اسے گاہک کا انتظار رہتا ہے۔''
''پیار کرنے والوں کو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پیار کرتے ہیں۔''
''پیار کرنے والوں کی کوئی برادری نہیں ہوتی۔''۷۰

''مجھ سے کہا ہوتا'' ایک علامتی ناول ہے جس میں آنند لہر نے پرندوں اور جانوروں کو کردار بنا کر طنزیہ انداز

میں مختلف انسانی عوامل کی نقاب کشائی کی ہے۔مصنف نے علامتی انداز میں انسان پر طنز کرتے ہوئے کئی مسائل کو پیش کیا ہے۔ناول نگار نے انسانی اصلاح کے لئے پرندوں اور جانوروں کی زبانی اس طرح کے مکالمے استعمال کیے ہیں جن سے انسان کی بے حسی، کم عقلی ،نفرت اور تنگ دلی کا احساس ہوتا ہے۔ناول سے چند مکالمے ملاحظہ کیجئے۔

''آدمی چاہے کسی ملک کا بھی ہومگر بچے ایک ہی طرح سے پیار کرتے ہیں۔''

''ان مسئلوں میں الجھنے کے بجائے صرف پیار کئے جاو کیونکہ زندگی بڑی مختصر ہے۔''

''یہاں پر ہر جاندار کا جینا ضروری ہے۔اگر کوئی نسل ختم ہوتی ہے تو سمجھو کہ زندگی پر زخم آتا ہے۔''

''محبت کرنے میں کتنا مزہ ہے۔ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے میں کتنا مزہ ہے۔''

''اصل میں انسان کسی سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے ہارتا ہے۔''

''انسان کو کبھی بم نہ بنانے چاہئے تھے۔درختوں کو نہ گرانا چاہئے تھا۔''

''اس دنیا میں ہر چیز جینا چاہتی ہے۔موت کا مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔''

''آو پیار کریں۔یہ بھول کر کہ ماضی میں کیا ہوا۔''

''جنگ تباہی و بربادی کا دوسرا نام ہے۔''[1]

ناول ''یہی سچ ہے'' میں آنند لہر نے زندگی کے نشیب وفراز کو پیش کیا ہے۔جس کے لئے مختلف کرداروں کی زندگی کی کشمکش کو پیش کرنے کیلئے خوبصورت مکالموں کا استعمال کیا ہے۔چند مکالمے دیکھیں جن میں ناول نگار نے مکالمہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔

''مگر ضرورت برداشت کی سرحدوں کو نہیں مانتی۔''

''سچ یہ ہے کہ ایسے کرم کرو کہ مرنے کے بعد سورگ ملے۔''

''آدمی عام آدمی کا بیٹا ہو تو اچھا ہے۔یہ نام یہ عزت کبھی اتنا بوجھ بن

جاتے ہیں کہ انسان ان کو اٹھا ہی نہیں سکتا۔"

"یہی میری بدقسمتی ہے کہ میں آپ کی ایمانداری اور بجی کے بوجھ تلے

دب کر رہ گئی ہوں اور اپنا ایک الگ وجود بھی ختم ہو گیا ہے۔"

"دریا سے بہتا ہوا پانی واپس نہیں آتا۔"

"غریبی انسان کو زندگی کے قریب لے آتی ہے۔"

"کچھ لوگ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ان کے روپے بھی کم نہ ہو اور دان بھی

ہو جائے۔"۲؎

"نامدیو" ان کا آخری ناول ہے ۔جس میں کرداروں کی نفسیات کے مطابق مکالمے استعمال کیے ہیں۔بے جا طوالت سے گریز کیا ہے۔سلیس اور سادہ زبان کا استعمال کیا ہے۔ناول سے چند مکالمے بطور مثال۔

"غریب کے گھر میں لڑکی کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو گھاس پھوس کی۔"

"دنیا ایک ڈرامہ ہے۔اپنا کردار نبھاتے چلو۔اس میں الجھو مت۔"

"حالات کا مقابلہ کرتے کرتے انسان جینے کا ہنر سیکھ جاتا ہے۔"

"اپنی نظروں سے وہ عورتوں کے بدن ٹٹولنے لگا۔"

"میں نمبردار ہوں، میری مرضی ہے میں جس پر چاہے اعتراض کروں

اور جس پر چاہے اعتراض نہ کروں۔"

"آشا کو وہ بوڑھا دوکاندار اچھی طرح یاد تھا جس نے آٹے کے عوض

اس کی چھاتیوں کو ٹٹولا تھا۔"۳؎

مندرجہ بالا مکالموں کو پڑھ کر یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ آنند لہر مکالمہ نگاری کے فن پر عمدہ مہارت رکھتے تھے۔انہوں نے ناولوں میں کرداروں کی نفسیات کے مطابق اور موقع کی مناسبت سے عمدہ مکالمے استعمال کیے ہیں۔جن سے کرداروں کی خصوصیات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جہاں فن مکالمہ کا حق ادا کیا ہے وہیں ناول میں قاری کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔

**نقطہ نظر**

کوئی بھی فن پارہ کسی نہ کسی مقصد کے پیش نظر وجود میں آتا ہے۔بغیر مقصد کے کوئی بھی چیز نہیں ہے۔جب کوئی فن کار کوئی فن پارہ تخلیق کرنا چاہتا ہے تو اس کے ذہن میں کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔جس کو پیش کرنے کے لئے وہ تخلیق کا کرب جھیلتا ہے۔مثلاً کوئی فنکار کسی فن پارے کے ذریعے غربت کو بیان کرتا ہے۔کبھی کسی کہانی کو پیش کر کے دنیا کی بے ثباتی کو ظاہر کرتا ہے۔نقطہ نظر کا ذکر کرتے ہوئے علی عباس حسینی لکھتے ہیں۔

پلاٹ سے نظریہ حیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔علم تحریر میں جو کچھ وجود میں آتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔جب احسن الخالقین نے کوئی چیز بیکار اور بے فائدہ پیدا نہیں کی تو انسانوں میں تخلیقی کام کرنے والے بے مقصد کوئی تصنیف کیوں کر پیش کر سکتے ہیں ۔''۴ے

کسی بھی تخلیق کار کی کوئی بھی تخلیق بغیر مقصد کے نہیں ہوتی۔اسی طرح آنند لہر کے ناول بھی کسی نہ کسی مقصد کی خاطر لکھے گئے ہیں۔ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کشمیر کے پس منظر میں ہے۔جس میں انہوں نے کشمیر کے حالات وواقعات کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیر سے ہجرت کرنے والے پنڈتوں کے دکھ درد کو پیش کیا ہے۔ اس ناول میں آنند لہر کا نقطہ نظر کشمیر میں صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب کی بحالی، ہندو مسلم اتحاد اور کشمیری منڈتوں کی باز آباد کاری ہے۔جیسا کہ ناول کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ کشمیر میں جو حالات بنے ہوئے ہیں یا جس طرح سے اخوت و بھائی چارے کو سیاسی مفاد کے لئے ختم کیا گیا ہے وہ کشمیر کے عوام کا مسلہ نہیں ہے۔کشمیر کے لوگوں کے دلوں میں آج بھی کشمیری منڈتوں کی واپسی کے لئے احساس ہے اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ گزرے وقت کی طرح ایک بار پھر سے کشمیر میں ہندو مسلم بھائی چارہ قائم ہونا چاہئے۔کشمیری مسلمانوں کی یہ تمنا ہے کہ کشمیری پنڈت کشمیر میں پھر سے بحال ہو جائیں۔تا کہ وہ ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شریک ہوسکیں۔اسی طرح سے ان کے دوسرے ناول ''سرحدوں کے بیچ'' کا موضوع سرحدیں ہے۔سرحدوں پر آنند لہر نے بہت کچھ لکھا ہے۔دراصل آنند لہر سرحدوں کے بہت خلاف تھے۔وہ قتل وغارت،نفرت،کشیدگی اور جنگ وجدال کا سبب سرحدوں کو ٹھہراتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ سرحدیں قائم کر کے انسان نے جنگ،نفرت اور خوف ووحشت کا ماحول پیدا کیا ہے۔جس سے ہر کوئی پریشان ہے۔عام انسان متاثر ہو رہا ہے۔زیر بحث ناول میں آنند لہر نے سرحدوں کے وجود اور اس کے قرب وجوار میں

رہنے والے لوگوں کی مشکلات کو پیش کر کے سرحدوں پر طنز کیا ہے۔ یہاں آنند لہر کا مقصد سرحدوں کا خاتمہ ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سرحدوں کا وجود اگر ختم ہو جائے تو انسان ہر طرح کی پریشانیوں سے خلاصی پا سکتا ہے۔

ان کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' امریکہ کے ہاتھوں عراق پر ہونے والی تباہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ یہ ناول بہت سارے سماجی مسائل کا احاطہ کرتا ہے۔ زیر بحث ناول کی تخلیق سے آنند لہر کو ملکوں کی آپسی رنجش، نسلی امتیازات، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، طاقت کا بے جا استعمال، انسان کی کم ظرفی، خود غرضی، غریبوں کا استحصال اور جنگ سے ہونے والی تباہ کاریوں کا خاتمہ مقصود ہے۔ آنند لہر نے ان تمام سماجی برائیوں کے خاتمے اور عوام کے سامنے ان کی نقاب کشائی کے لئے یہ ناول تخلیق کیا ہے۔ آنند لہر نے مختلف حقیقی مسائل کو موثر انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ ان کا چوتھا ناول ''یہی سچ ہے'' کی اگر ہم بات کریں تو اس میں آنند لہر کا مقصد مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرنا ہے۔ ناول یہی سچ ہے آنند لہر نے سماج سے رشوت خوری، غربت، بداخلاقی، جھوٹ اور جہیز جیسی بیماریوں کے خاتمے کے لئے تخلیق کیا ہے۔ ''نامدیو'' ان کا آخری ناول ہے۔ اس ناول میں آنند لہر نے چھوٹے چھوٹے کئی سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن میں محبت میں ناکامی، بے جوڑ شادی، غربت، رنگ و نسل اور مذہب وملت کی بنیاد پر آپسی رسہ کشی اور نفرت شامل ہیں۔

زیر بحث ناول آنند لہر نے انہیں سماجی برائیوں کے خاتمے کے لئے تخلیق کیا ہے۔ ان کے پانچوں ناول مختلف سماجی مقاصد کے پیش نظر تخلیق کئے گئے ہیں۔ جو قارئین کو مختلف حقیقتوں سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ان سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا درس دیتے ہیں۔

## نقطۂ عروج

نقطۂ عروج ناول کا وہ حصہ ہے جہاں قصہ اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ نقطۂ عروج پر پہنچنے کے بعد قصے میں ایسے واقعات سامنے آنے لگتے ہیں جن سے قصے کے نتائج ظاہر ہونے لگتے ہیں اور قارئین کو لگتا ہے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ جہاں تک آنند لہر کے ناولوں میں نقطۂ عروج کا تعلق ہے تو ان کے ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کا قصہ اس وقت نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے جب کشمیر میں آزادی کے بعد امن وسکون کا دور پھر سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن بہت جلد قبائیلی کشمیر پر حملہ کرتے ہیں۔ ان کے حملوں سے کشمیر میں حالات حد درجہ کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہر طرف قتل وغارت، سیاسی بدحالی اور بدامنی کا دور شروع ہوتا ہے۔ کشمیری پنڈت وادی کشمیر سے جموں ہجرت کرتے ہیں۔

بدری جو کہ قصے کا مرکزی کردار ہے سرحد کے اس پار جا کر تربیتی کیمپوں میں کشمیری نوجوانوں کی حالت خستہ کو دیکھ کر واپس آتا ہے اور پھر وہ جموں میں مہاجرین کشمیری پنڈتوں کے کیمپوں میں ان کی خستہ حالت دیکھ کر پریشان ہو کر واپس کشمیر لوٹتا ہے ۔اور بالآخر کشمیر کے عوام کو اکھٹا کر کے یہ طے کرتا ہے کہ ہمیں کشمیری پنڈتوں کو واپس لانا چاہئے ۔تمام کشمیریوں کا پنڈتوں کو واپس لانے کا جذبہ اور یکجہتی دکھائی دیتی ہے۔

ناول ''سرحدوں کے بیچ'' کی کہانی اس وقت نقطِ عروج کو پہنچتی ہے جب راجہ جو کہ رانی سے جنون کی حد تک عشق کرتا ہے اور اسے پانے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔جیل میں رانی سے اس کے تعلقات بن جاتے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ جیل سے رہائی پر وہ رانی کو اپنے ساتھ گھر لے جائے۔رانی کی رہائی پر وہ جشن کا اہتمام کرتا ہے لیکن جوں ہی رانی جیل سے رہا ہوتی ہے تو پولیس اس کو واپس اس کے وطن بھیجنے کی تیاری کرتی ہے۔جس سے راجہ اور اس کے گھر والوں کی تمام تر امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ یہ مقام قصے میں نقطۂ عروج کا مقام ہے۔

ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کا قصہ اس وقت نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے جب رانی، راجہ کی پوٹلی کھولتی ہے۔جس میں سے ایک فراق زدہ عورت کا خط نکلتا ہے۔جو اپنے خاوند کا انتظار کر رہی ہوتی ہے جبکہ وہ جنگ میں مرجاتا ہے۔ یہ خط پڑھ کر رانی بے ہوش ہو جاتی ہے اور اس کی بھی موت ہو جاتی ہے۔اسی طرح ناول ''نامدیو'' کی اگر بات کی جائے تو اس ناول کی کہانی کا نقطۂ عروج ''نیماں'' نامی ایک لڑکی کی شادی کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔نامدیو جو کہ کہانی کا مرکزی کردار ہے نیماں سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور نیماں بھی اسے حد درجہ چاہتی ہے لیکن گاوں کا نمبر دار اپنی طاقت کا غلط استعمال کرتے ہوئے اپنا نام اونچا کرنے کے لئے نیماں کی شادی زبردستی ہر جیت کمار سے کرا دیتا ہے۔نیما اور نامدیو کی محبت کی طویل کشمکش کے بعد نیما کی زبردستی ہر جیت سے شادی کا مقام ناول میں نقطہ عروج کا مقام ہے۔اس طرح نامدیو اور نیما کی محبت کا قصہ تمام ہو جاتا ہے۔راجہ محبت میں ناکام ہو کر کئی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔جس سے کچھ عرصہ بعد اس کی موت واقع ہو جاتی ہے اور یوں ناول اختتام کو پہنچتا ہے۔

## اسلوب و بیان

آنند لہر نے ناولوں میں سلیس اور سادہ زبان کا استعمال کیا ہے۔وہ بات کو صحیح تناظر میں پیش کرنے کے قائل تھے۔کہیں پر بھی ثقیل الفاظ کا استعمال نہیں کیا۔ان کی تخلیقات کو عام قاری بھی آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔رواں دواں عبارت ان کے ناولوں میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتی ہے۔واقعات کو موثر بنانے کے لئے انہوں نے علامتوں کا

استعمال بھی کیا ہے۔ناول کی زبان صاف ستھری، سادہ اور آسان ہونی چاہئے۔ناول میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ناول نگار کو زبان و بیان پر دسترس ہونی چاہئے۔آنند لہر نے روزمرہ کی زبان استعمال کر کے ناولوں میں دلچسپی پیدا کی ہے۔بعض جگہ زبان کی غلطیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جس سے لگتا ہے کہ انہوں نے بہت عجلت میں کام لیا ہے۔اس کی ایک وجہ ان کی پیشہ ورانہ مصروفیت بھی ہوسکتی ہے۔کمپوزنگ کی غلطیاں ان کی تقریباً تمام تر تصانیف میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔جو بعض جگہوں پر کوفت کا باعث بنتی ہیں۔

مجموعی اعتبار سے ان کے ناولوں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آنند لہر کو ناول نگاری کے فن پر دسترس حاصل تھی۔آنند لہر نے اپنے ناولوں کے لئے اہم موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔آزادی ہند سے لے کر بیسویں صدی کی آخری دہائی تک کے کشمیر کے حالات ہوں یا مذہبی تفرکات اور ہجرت کا درد و کرب، آنند لہر بڑی خوش اسلوبی سے ان کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔لہر نے اپنے ناولوں میں ہجرت، بٹوارہ، رشوت، بے ایمانی، اخلاقی قدروں کی گراوٹ اور ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کو موضوع بنایا ہے۔جنہیں نہایت ہی سلیس اور سادہ اسلوب میں پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ناول کے لئے ضروری فنی لوازمات کا انہوں نے اپنے ناولوں میں خاص خیال رکھا ہے۔

## حوالہ جات


۱ علی عباس حسینی، اردو ناول کی تاریخ وتنقید، ایجوکیشنل بک ہاوس علی گڑھ، ص۔۳۹

۲ آنندلہر، اگلی عید سے پہلے، مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں، ۱۹۹۷، ص۔۱

۳ فدا کشتواڑی، آنندلہر شخصیت اور فن، ص۔۱۱۵

۴ آنندلہر، مجھ سے کہا ہوتا، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۵، ص۔۵

۵ آنندلہر یہی سچ ہے، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۸، ص۔۱۰

۶ ابوالکلام قاسمی، ناول کا فن، ایجوکیشن ل بک ہاوس علی گڑھ، ۱۹۷۸، ص۔۱۵

۷ آنندلہر، اگلی عید سے پہلے، مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں، ۲۰۰۱، ص۔۶۱

۸ ایضاً، س۔۲۰

۹ ایضاً، ص۔۳۴

۱۰ ایضاً، ص۔۳۵

۱۱ ایضاً، ص۔۳۸

۱۲ ایضاً، ص۔۴۱

۱۳ ایضاً، ص۔۷۹

۱۴ ایضاً، ص۔۶۴

۱۵ ایضاً، ص۔۹۵

۱۶ آنندلہر، مجھ سے کہا ہوتا، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۵، ص۔۱۹

۱۷ ایضاً، ص۔۲۱

۱۸ ایضاً، ص۔۵۳

۱۹ ایضاً، ص۔۱۰۵

۲۰ ایضاً، ص۔۳۸

۲۱ ایضاً،ص۔۴۳

۲۲ ایضاً،ص۔۱۰۹

۲۳ آنندلہر،سرحدوں کے بیچ،2002،ص۔۱۷

۲۴ ایضاً،ص۔۲۰

۲۵ ایضاً،ص۔۲۲

۲۶ ایضاً،ص۔۲۳

۲۷ ایضاً،ص۔۱۱۰

۲۸ ایضاً،ص۔۲۲

۲۹ ایضاً،ص۔۳۰

۳۰ ایضاً،ص۔۲۰

۳۱ ایضاً،ص۔۷۹

۳۲ آنندلہر،یہی سچ ہے،اردو بک سوسائٹی نئی دہلی،۲۰۰۸،ص۔۱۱

۳۳ ایضاً،ص۔۱۸

۳۴ ایضاً،ص۔۱۸

۳۵ ایضاً،ص۔۱۹

۳۶ ایضاً،ص۔۲۲

۳۷ ایضاً،ص۔۲۴

۳۸ ایضاً،ص۔۳۲

۴۹ ایضاً،ص۔۵۰

۴۰ ایضاً،ص۔۸۶

۴۱ آنندلہر،نامدیو،اوشن پبلی کیشنز نئی دہلی،۲۰۱۲،ص۔۱۱

۴۲ ایضاً،ص۔۱۶

۴۳ ایضاً،ص۔۲۶

۴۴ ایضاً،ص۔۳۴

۴۵ ایضاً،ص۔۳۶

۴۶ ایضاً،ص،۳۸

۴۷ ایضاً،ص۔۶۶

۴۸ ایضاً،ص۔۸۵

۴۹ ایضاً،س۔۱۴۲

۵۰ ایضاً،ص۔۱۴۴

۵۱ ابوالکلام قاسمی،۔۔۔۔ص۶۲

۵۲ علی عباس حسینی،ص۔۶۱

۵۳ ڈاکٹرمحمد احسن وڈاکٹرنورالحسن ہاشمی،ص۔۲۷

۵۴ آنندلہر،اگلی عید سے پہلے،مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں،۱۹۹۷،ص۔۲۰

۵۵ ایضاً،ص۔۲۶

۵۶ آنندلہر،سرحدوں کے بیچ،۲۰۰۲،س۔۲۸

۵۷ ایضاً،ص۔۲۳

۵۸ علی عباس حسینی،ص۔۶۶

۵۹ آنندلہر،اگلی عید سے پہلے،مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں،۱۹۹۷،ص۔۱۷

۶۰ ایضاً،ص۔۴۷

۶۱ آنندلہر،سرحدوں کے بیچ،۲۰۰۲،ص۔۷۹

۶۲ ایضاً،ص۔۲۴

۶۳ آنندلہر،یہی سچ ہے،اردو بک سوسائٹی،۲۰۰۸،ص۔۴۱

۶۴ ایضاً،ص۔۴۱

٦٥ آنند لہر، نامدیو، اوشن پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۲، ص۔۲۰

٦٦ ایضاً، ص۔۱۱۰

٦٧ ڈاکٹر محمد احسن و ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ۔۔۔ص۔۳۴

٦٨ آنند لہر، اگلی عید سے پہلے، مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں، ۱۹۹۷ص۔۱۷

٦٩ آنند لہر، سرحدوں کے بیچ، ۲۰۰۲، ص۔۲۷

۷۰ آنند لہر، مجھ سے کہا ہوتا، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۵، س۔

۷۱ آنند لہر، یہی سچ ہے، اردو بک سوسائٹی نئی دہلی، ۲۰۰۸، ص۔

۷۲ آنند لہر، نامدیو، اوشن پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۱۲، ص۔

# باب پنجم

# آنند لہر کی ڈراما نگار

# آنند لہر کی ڈراما نگاری

آنند لہر بنیادی طور پر افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔لیکن انہوں نے مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کے لئے اردو ڈرامے کو بھی ذریعہ اظہار بنایا ہے۔اگر چہ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسا نہ نگا ری سے کیا تھا لیکن ان کی پہلی مطبوعہ تصنیف اردو ڈرامے کی صورت میں منظر عا م پر آئی۔''نروان''ان کی پہلی تصنیف ہے جو کتابی صورت میں ادبی دنیا میں متعارف ہوئی۔نروان مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے۔جو ۱۹۸۸ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں کل چھ ڈرامے شامل ہیں۔جن میں تیاگ،کالی کہانی،کھیل،نروان،گنہگار اور سپاہی کی واپسی شامل ہیں۔اس مجموعے میں شامل چوتھے ڈرامے کے نام سے اس کا نام رکھا گیا ہے۔نروان کا انتساب آنند لہر نے اپنے والد مرحوم شری بلراج آنند کے نام کیا ہے۔تمام ڈرامے انسانی زندگی اور سماج سے جڑے مسائل پر مشتمل ہیں۔لہر چونکہ ایک حساس دل انسان تھے۔وہ لوگوں کے دکھ،درد اور تکالیف کو محسوس کرتے تھے نیز سماج میں ہونے والی نا انصافیوں اور برائیوں کا خاتمہ چاہتے تھے۔انہوں نے اپنی کہانیوں میں عام انسان کو موضوع بنایا ہے۔آنند لہر کی کہانیوں کے ہیرو کوئی شہزادے یا بڑے بڑے تجار نہیں بلکہ ہمارے سماج سے جڑے عام انسان ہیں۔لہر مسائل کا حل تلاش کرتے ہیں۔وہ حالات کے سامنے جھکتے نہیں بلکہ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے قاری کو اکساتے ہیں۔ان کے ڈراموں کے کردار سماج سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کی زبان بالکل روزمرہ کی معلوم ہوتی ہے۔

زیر نظر ڈرامائی مجموعے کا پہلا ڈراما''تیاگ''ہے جس میں آنند لہر نے انسانی زندگی کے چند حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ڈرامے میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر شخص اپنی زندگی کو خوش گوار گزارنے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں اور خوشیوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے دوسروں کو نیچا دکھانے اور ان کی خوشیوں سے جلنے میں مصروف ہے۔ساون،اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے جو ایک عام انسان ہے۔اس کے علاوہ سادھو اور راجہ دو بڑے کردار ہیں جن کے ارد گرد پورا ڈراما گھومتا ہے۔سادھو جو کہ ایک مذہبی پیرو کار ہے اور مذہب کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کو گناہوں سے بچنے کی تلقین کرتا ہے لیکن خود اس پر عمل پیرا نہیں ہوتا۔اسی کے ساتھ راجہ جسے عدل وانصاف کا علم تک نہیں ہوتا لوگوں کو سزائیں دیتا ہے۔

ڈرامے کی شروعات زوردار آوازوں اور چیخ و پکار سے ہوتی ہے۔لوگ صدائیں بلند کرتے ہیں کہ بے گناہوں کوطرح طرح کی سزائیں کیوں دی جارہی ہیں۔اتنے میں ایک سادھواوراس کا ایک چیلا''ساون'' اسٹیج پر آتے ہیں۔ساون،سادھو سے سوال کرتا ہے کہ لوگ بے گناہ ہیں پھرانہیں یہ سخت سزائیں کیوں دی جارہی ہیں تو سادھواس ظلم وجبر کا ذمہ دار راجہ کوٹھراتا ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جوطاقت کے نشے میں حقیقت کوبھول جاتے ہیں۔یہ لوگ بے گناہوں کوسزائیں دے کر پھراپنا بھرم رکھنے کے لئے بعد میں سزائیں معاف کر کے ان پراحسانات بھی کرتے ہیں۔جس کوآنندلہرنے ڈراما تیاگ میں یوں پیش کیا ہے۔

''ساون: گورودیو، یہ تو سچ ہے کہ تمام لوگ بے گناہ ہیں، پھرانہیں اتنی
سخت سزائیں کیودی گئی ہیں؟
سادھو۔ بیٹا ساون، یہ سب اندھی نگری کے بہروں کی وجہ سے ہے۔
جس نے اس نگری کا دستور برا عجیب بنایا ہوا ہے، یہ ہاتھوں کی سزا
کانوں کودیتے ہیں۔ پاوں اگرغلطی کریں تو ناک کٹوادیتا ہےاسی لئے
یہ سب لوگ گناہ گار ہونے کے باوجودبھی بے گناہ ہیں۔اس لئے ہے
بیٹا کہ اس نگری کا راجہ بڑا افاخدل ہے۔وہ تمام لوگوں کوان کے گناہ کی
سزامعاف بھی کردیتاہےمگرانہیں سزائیں دے بھی دیتاہے۔''[1]

ڈرامے میں ساون اور برکھا کے پیار کی کہانی بھی پیش کی گئی ہے۔سادھو جوکہ ایک تیاگی ہےوہ چاہتا ہے کہ غیرعورتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے سے انسان کی آخرت بہترنہیں ہوسکتی،اس کی تپسیا قبول نہیں ہوتی۔اس لئے وہ ہرایک کوتیاگ کرنے کاحکم دیتاہے۔جس کولہرنے یوں بیان کیا ہے۔

''سادھو۔بیٹا تیاگ ہی تپسیا کا دوسرانام ہےاور جہاں تیاگ ہے وہاں
بھگوان ہے،ایشورہے۔''[2]

ساون ایک خوبصورت لڑکی برکھا پرفدا ہوجا تاہے،اس کی تعریفیں کرتا ہے۔جس پرسادھواسے سمجھاتا ہے کہ بیٹا یہ دنیا فانی ہے، یہ جسم ختم ہونے والا ہے۔اس لئے تپسیا کروو ہی بھگوان تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔سادھو،ساون کو سمجھاتا ہےلیکن ساون اس کی باتوں پریقین نہیں کرتا۔اس کا ماننا ہے کہ جولوگ دنیا کوتیاگتے ہیں ان کوختم ہوناہےاور

جو بھوگتے ہیں ان کو بھی مرنا ہے۔اس لئے یہ سب چھوڑ کر انسان کو ایک دوسرے سے کنارہ کشی کرنے کے بجائے محبت رچانی چاہئے۔ڈرامے سے ساون کے یہ مکالمے ملاحظہ کیجئے۔

''ساون۔گورودیو، سچ تو یہ ہے کہ مجھے اور آپ کو بھی ایک دن ختم ہو ہی
جانا ہے اور اگر یہ ضروری ہے اس شریر کو ایک دن ختم ہو ہی جانا ہے تو
پھر اس کو پیار کرنے دینے مین اعتراض کس بات کا ہے۔''[۳]

اس کے بعد ایک راجہ کا دربار لگتا ہے جہاں ہر شخص اپنے اپنے مسائل لے کر انصاف کے لئے جاتا ہے۔ یہاں پر ڈرامانگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک ایسا دربار ہے جہاں عدل وانصاف کے نام کی کوئی چیز نہیں لیکن پھر بھی لوگ انصاف کی امید لگائے ہوئے ہیں۔ یہاں پر ڈرامانگار نے سیاسی نظام پر طنز کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو عوام خود اپنے اپر مسلط کرتے ہیں۔ان کی عیاشی، بدکاری، ظلم وجبر اور نا انصافیوں کا پتہ ہونے کے باوجود ان پر اعتماد کرتے ہیں اور ان سے انصاف کی امید رکھتے ہیں۔جس کو آنند لہر نے ڈرامے میں اس طرح پیش کیا ہے۔

''راجہ: ہم حکم دیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ کٹوا دئے جائیں۔اور ہم اس
کی آنکھوں کا گناہ اس لئے معاف کرتے ہیں کیونکہ اپنے گناہ بخشوانے
کے لئے ایک بار اس نے ہماری تصویر پر پھول چڑھائے تھے۔

ایک درباری: مہاراج یہ تو انصاف کا انوکھا طریقہ ہے۔

راجہ: یاد رکھو! ہمارے انصاف کا یہی طریقہ رہے گا۔کیونکہ ہر گناہ گار
اپنے راجہ کی پوجا کرتا ہے۔یہی بات ہے کہ ہم سب کو سزا بھی دیتے
ہیں مگر ان کے گناہ معاف بھی کر دیتے ہیں۔''[۴]

سیاسی بدحالی اور عدل وانصاف کے غلط نظام کی وجہ سے لوگوں کو حقیقت ایک فسانہ نظر آنے لگتا ہے۔ظلم وجبر عروج پر ہوتا ہے،عورتوں کا استحصال ہوتا ہے۔انہیں اپنی عزت کا خوف ہو جوتا ہے۔بدکاری اس قدر عروج پکڑ جاتی ہے کہ عورتوں کو ہر کوئی زہریلا سانپ نظر آتا ہے۔انہیں اپنی جوانیوں پر رشک کے بجائے افسوس ہوتا ہے۔اپنا جسم ایک بوجھ لگتا ہے۔عورت کی عزت ہر مذہب سکھاتا ہے لیکن عصر حاضر میں عورت اس قدر بے آبرو اور غیر محفوظ ہو چکی

ہے کہ اس کو اپنے وجود پر مایوسی اور افسوس ہو رہا ہے۔ جو لوگ صاحب مسند ہیں وہ عام لوگوں کی عورتوں کو اپنی جا گیر سمجھتے ہیں۔ جس کا نقشہ آنند لہر نے ڈرامے میں یوں کھینچا ہے۔

''ایک عورت: حضور جس وقت میں لڑکی تھی میری آنکھوں نے سانپوں کو دھاگے سمجھا تھا اور آج میری آنکھیں دھاگوں کو سانپ سمجھتی ہیں۔

دوسری عورت: حضور جوانی میں جن چیخوں کو قہقہے سمجھتی تھی اب میرے کانوں نے ان کی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔

تیسری عورت: مہاراج میرے جسم کے ابھار اب بوجھ بن گئے ہیں۔

چوتھی عورت: پہلے میں ہواؤں کو کاٹتی تھی اب ہوائیں مجھے کاٹتی ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟''[۵]

ان تمام چیزوں کا ذمہ دار آنند لہر نے عام لوگوں کو ٹھہرایا ہے کہ اس طرح کا نظام ہمارا خود ساختہ ہے۔ جس کو کوسنے کے بجائے ہمیں خود بدلنا چاہیئے۔ جب تک اس طرح کے لوگوں سے ہم عدل و انصاف چاہتے رہیں گے تب تک ظلم و جبر کا شکار ہونے کے بجائے اور رسوائی و ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خود ہی اپنے کارناموں کو پاپ اور پن کا درجہ دیا ہوا ہے اور عوام اتنے معصوم ہیں کہ وہ حقیقت کو پہچانے بغیر ان کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جس کا ذکر کرتے ہوئے آنند لہر لکھتے ہیں۔

''کتنے معصوم اور بھولے ہیں یہ لوگ جو آگ کی فطرت پر الزام لگانے کے بجائے خود اپنے بدن کو کوستے ہیں۔''[۶]

ڈرامے میں کشمکش اس وقت عروج پر پہنچتی ہے جب راجہ کا دربار لگتا ہے اور باہر زوردار بارش اور بجلی کڑکنا شروع ہوتی ہے۔ ہر طرف ہلچل برپا ہوتی ہے، ہر کسی کو اپنی جان خطرے میں نظر آتی ہے اور راجہ دربار چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ لوگوں کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوتا ہے۔ ساون جو کہ برکھا سے بے پناہ محبت کرتا تھا اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کراتا ہے۔ جبکہ برکھا اس سے محبت برقرار رکھنے کا جتن کرتی ہے اور بالآخر ساون کے انکار کرنے پر وہاں سے چلی جاتی ہے۔ ساون دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہوئے ترک دنیا کا اعلان کرتا ہے۔ لوگ اسے ایک دیوتا سمجھنے لگتے ہیں۔ جبکہ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک پاپی اور گناہگار ہے۔

ڈرامے کا اختتام لہر نے بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ جہاں ساون، برکھا اور سادھو تینوں اپنی اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ ساون اور برکھا اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے سادھو سے معافی مانگتے ہوئے دکھائے گئے ہیں کہ انہوں نے تیاگ چھوڑ کر دنیا کے فضول کاموں میں اپنی عمر ضائع کی جبکہ سادھو خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ دنیا کو تیاگ کے اس نے ایک عظیم نعمت کو ٹھکرا دیا اور وہ ساون کے پاؤں پکڑ لیتا ہے۔ ڈرامے کا اختتام ساون اور سادھو کے ان مکالموں پر ہوتا ہے۔

''سادھو: بیٹا، تم سچے ہو۔ تم نے زندگی کا صحیح لطف اٹھایا۔ میں بھٹکتا رہا اور آج میں دنیا کے اتنا ہی قریب ہوں جتنا میں دور بھاگتا تھا۔ زندگی کے برس چند لمحوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور بیتے ہوئے دن درخت سے گرے ہوئے پتے لگتے ہیں۔'' ؎

زیر نظر ڈرامے میں آنند لہر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان کی زندگی بہت مختصر ہے اور موت ایک حقیقی عمل ہے۔ اس لئے زندگی کے مختصر ایام میں دوسروں سے نفرت کرنے کے بجائے دنیا کی نعمتوں کو جھٹلانے کے بجائے ان سے لطف حاصل کرنا ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ نیز یہ بتایا ہے کہ کسی کی حقیقت پرکھے بغیر اس کو اپنے اپر مسلط کرنا اور کسی کی اندھی تقلید کر کے اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر اپنی ذاتی خوشی کو قربان کرنے اور مشکلات کا سامنا کرنے کے بجائے اپنا خود کا راستہ اختیار کرنا اور اپنی زندگی جینا ہی اصل فن ہے۔

نروان میں شامل دوسرا ڈراما ''کالی کہانی'' ہے۔ یہ گیارہ صفحات پر مشتمل ایک مختصر سا ڈراما ہے۔ اس ڈرامے میں آنند لہر نے مختلف کرداراں کے ذریعے دنیا کی بے ثباتی اور انسان کی طمع و لالچ کو پیش کیا ہے۔ اس ڈرامے میں ان کرداروں کو پیش کیا گیا ہے جن کا ظاہر اور باطن الگ الگ ہیں۔ جو دوسروں کو دھوکھا دیتے ہیں اور بعدازاں خود رسوائی کا سامنا کرتے ہیں۔ ایک کردار مجمع باز ہے جو لوگوں کو جھوٹ دیکھا تا ہے۔ فریب کرتا ہے اور انہیں اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب اس کی حقیقت سامنے آتی ہے تو ہر کوئی اسے جھوٹا قرار دیتا ہے، اس سے نفرت کرتا ہے۔ بچے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔

دراصل اس ڈرامے میں آنند لہر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا کا عجب دستور ہے۔ یہاں ہر کوئی ایک دوسرے سے دھوکھا کرتا ہے۔ ہر کوئی الجھن کا شکار ہے۔ ایک شخص جسے چاہتا ہے وہ کسی دوسرے کو چاہتا ہے اور یہ سلسلہ اسی

طرح چل رہا ہے۔دنیا میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی خواہشات حد سے بڑھ گئی ہیں جب کہ بعض اپنی بنیادی ضروریات سے بھی محروم ہیں۔اسی لئے آنند لہر نے کہا ہے کہ ''سنواور سن کر عمل کرواور جتنے پانوؤں دیکھواتنی چادر پھیلاؤ۔

''کالی کہانی''ایک مختصر ڈراما ہے۔جس میں آنند لہر نے مختلف کرداروں کی نفسیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ڈرامے میں کہیں پر عروج اور کشمکش دکھائی نہیں دیتی۔بعض جگھوں پر طویل مکالموں کا استعمال کیا ہے جو ضرورت سے زیادہ نظر آتے ہیں اور یہ ڈرامے کے لئے ایک عیب بھی ہے کہ بے جا طویل مکالموں کا استعمال کیا جائے۔انسانی خواہشات کو تھوڑا علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔یہ ڈراما افسانے کی طرز پر لکھا گیا ہے ڈرامے کے فنی لوازمات کو پورا نہیں کرتا۔

اس مجموعے میں شامل تیسرا ڈراما ''کھیل'' ہے۔یہ ایک مختصر ڈراما ہے جو آنند لہر نے اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے لکھا تھا۔ڈگری کالج پونچھ میں کئی بار دکھایا بھی گیا۔اس ڈرامے میں آنند لہر نے زندگی کو ایک کھیل کی مانند قرار دیا ہے۔زندگی ایک کھیل ہے اور یہاں پر آنے والا ہر شخص اپنے اپنے طریقے سے اسے کھیلتا ہے اور چلا جاتا ہے۔یہاں کوئی بھی ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے۔آنند لہر نے دنیا کو مجمع باز کے تھیلے کی مانند قرار دیا ہے جو دراصل اندر سے خالی ہوتا ہے لیکن لوگوں کی دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے اور ہر کسی کے لئے تجسس بنا رہتا ہے کہ آخر اس میں کیا ہے۔اسی طرح دنیا کی حقیقت بھی اصل میں فناہ ہونا ہے لیکن دنیا کی لالچ ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے لوگ اس کی بے ثباتی کو بھول کر اس سے دل لگا بیٹھتے ہیں۔

اس ڈرامے میں آنند لہر نے انسان کے دوغلے پن کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔کچھ لوگوں کا ظاہر اور باطن الگ الگ ہوتا ہے۔یہ لوگ دوسروں کو دھوکھا دیتے ہیں۔ظاہر میں امرت بیچتے ہیں لیکن دلوں میں زہر رکھتے ہیں۔دوسروں کی قابلیت کا اعتراف نہیں کرتے۔انہیں اپنی ماں بہن کی عزت عزیز ہوتی ہے لیکن دوسرے کی ماں بہن کی پرواہ نہیں ہوتی۔دنیا کا سلسلہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ہر انسان ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تگ ودو میں ہے لیکن کون کس مقام پر ہے اس کی خبر کسی کو بھی نہیں ہے۔ڈرامے سے یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''بوڑھی آواز۔۔۔۔۔ہم سب دائرے کے گرد دوڑ رہے ہیں۔ایک
دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔لیکن کیا معلوم جسے ہم

سب سے آگے سمجھتے ہیں وہی سب سے پیچھے ہو۔''۸

دنیا میں ہر شخص کا اپنا مقصد ہے۔ ہر کوئی اپنا مقصد پورا کرنے کے لئے جدو جہد کرتا ہے۔لوگ ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔دراصل زندگی کا کھیل ایک عجیب کھیل ہے، کہیں کوئی کسی کی جوانی سے کھیل رہا ہے اور کہیں کوئی بڑھاپے میں جوانی کے ارمانوں کو زندہ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔دنیا کا سلسلہ رواں دواں ہے۔یہاں ہر کوئی آتا ہے اور اپنا کھیل، کھیل کر چلا جاتا ہے۔

''نروان'' اس مجموعے کا چوتھا ڈراما ہے۔اسی ڈرامے کے نام سے اس مجموعے کا نام رکھا گیا ہے۔ڈرامہ ۱۴ صفحات پر مشتمل ہے۔یہ ڈرامہ بھی دیگر روایتی ڈراموں کی طرح انسانی زندگی کی بعض حقیقتوں کو آشکار کرتا ہے۔اس میں آنندلہر نے انسانی نفسیات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔انسان کو کسی طرح بھی سکون میسر نہیں ہے۔دنیا کے سفر میں کون کب آیا اور کب چلا گیا کسی کو معلوم نہیں۔اس میں آنندلہر نے دو طرح کے لوگوں کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ایک وہ جو زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتے ہیں اور بعدازاں انہیں یہ پاپ لگنے لگتا ہے اور وہ رشتوں کو ادھورا چھوڑ کر ان سے کنارہ کشی کر کے تپسیا شروع کرتے ہیں۔لیکن وہاں انہیں پھر سے ماضی کی یاد ستاتی ہے، رشتے یاد آتے ہیں اور بے چین کرتے ہیں۔جبکہ دوسرے وہ لوگ ہیں جو تپسیا کر رہے ہوتے ہیں لیکن رشتوں ناطوں سے محروم ہوتے ہیں اور وہ رشتے قائم کرنے اور گھر بسانے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کسی حال میں بھی خوش نہیں ہے۔نروان میں ان لوگوں کو دکھایا گیا ہے جو ثابت قدمی کا مظاہرہ نہیں کر سکتے۔وعدے ضرور کرتے ہیں لیکن منزل کے قریب آ کر بھٹک جاتے ہیں۔جس کو لہر نے نروان میں اس طرح پیش کیا ہے۔

''آواز: قسمیں کھانے والے لفظوں کو بھول جاتے ہیں

آواز: زندگی کے تار جب ٹوٹتے ہیں تو آواز ننگی ہو جاتی ہے۔

آواز: منزل کے قریب پہنچ کر لوگوں نے راستے بدل دئے۔''۹

دراصل آنندلہر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تپسیا ہو یا کہ زندگی اور رشتوں کا لطف، ہر چیز اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے۔تپسیا ضروری ہے لیکن ساتھ میں رشتے نبھانے بھی ضروری ہیں۔جو لوگ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اپنائیں وہ زندگی کا لطف حاصل نہیں کر سکتے۔اس لئے ایک پرسکون زندگی جینے کے لئے ہر چیز کو وقت پر اہمیت دینا ضروری ہے

اور زندگی میں توازن برقرار رکھنا ایک بڑا فن ہے۔

زیر بحث ڈرامائی مجموعے میں شامل پانچواں ڈراما ''گنہگار'' ہے۔ دیگر ڈراموں کی طرح اس میں بھی آنند لہر نے انسانی زندگی کی مختلف حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ جن میں خودغرضی، لالچ اور مکروفریب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دنیا میں ہر کوئی اپنی غرض پوری کرنا چاہتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لئے گناہ پر گناہ کرتے جا رہا ہے۔ لیکن خواہشات کی کبھی تکمیل نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے اس کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ انسان اگر سمندر بھی فتح کر لے تو بھی اس کی پیاس برقرار رہتی ہے۔ انسان جتنی مرضی ترقی کر لے وقت کی رفتار کو کم نہیں کر سکتا۔ یہاں ہر کوئی ایک دوسرے کی جیب کاٹنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ دوسروں کے گناہوں پر ہر ایک کی نظر ہے لیکن اپنے گناہ کسی کو نظر نہیں آتے۔

''سپاہی کی واپسی'' نروان میں شامل چھٹا اور آخری ڈرامہ ہے۔ جس کا مرکزی کردار ایک سپاہی ہے۔ اس ڈرامے کا موضوع جنگ اور اس کے نتائج ہے۔ یہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے بلکہ آنند لہر کی کئی تخلیقات کا موضوع ہے۔ مثلاً ناول، افسانہ اور ڈراما۔ سرحدیں، جنگ و جدال اور ان کے نتائج جیسے موضوعات کو آنند لہر نے الگ الگ اصناف کے ذریعے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ڈراما ''سپاہی کی واپسی'' بھی ہے۔ اس ڈرامے میں آنند لہر نے سرحدوں کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے لڑی جانے والی جنگ اور اس کے خوفناک نتائج کو پیش کیا ہے۔ پیٹر اور موہن دو مرکزی کردار ہیں جن کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ لہر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جنگ کس طرح انسانی رشتوں کا خون کرتی ہے۔ سپاہی جو دیش کی حفاظت کرتے ہیں ان کے دلوں میں دوسرے ملکوں کے لئے نفرت بھری جاتی ہے۔ زیر نظر ڈرامے میں ایک فوجی دکھایا گیا ہے جس کے دل و دماغ پر جنگ چھائی ہوئی ہے۔ اسے بادل گرجنے کی آواز بھی گولی کی آواز لگتی ہے۔ کیونکہ جنگ انسان کی اصلیت بدل دیتی ہے دشمنی، نفرت اور ظلم سکھاتی ہے۔ جس کو آنند لہر نے ڈرامے میں ایک فوجی کردار کے ذریعے یوں پیش کیا ہے۔

> ''فوجی: جنگ آدمی کو کتنا بدل دیتی ہیں آنکھیں صرف خون دیکھنا پسند
> کرتی ہیں، کان صرف چیخیں سننا چاہتے ہیں۔ میں کتنا بدل گیا ہوں میں
> اب بھی یاد کر سکتا ہوں بادل گرجتے تھے۔''[۱۰]

لہر سرحدوں کے خلاف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تمام تباہیوں کی ذمہ دار سرحدوں کو ٹھہراتے ہیں۔ آنند لہر نے

ان سیاسی چہروں پر طنز کیا ہے جو جنگ وجدال کے نتائج اور انسانی خواہشات وضروریات کو مدنظر رکھے بغیر سرحدیں قائم کر دیتے ہیں۔ سرحدیں امن وسکون، بھائی چارے، محبت، احساس اور انسانی خواہشات اور تمناؤں کا قتل کر کے نفرت، ظلم، قتل وغارت اور بدامنی و بےچینی کو جنم دیتی ہیں۔ لوگ محبت اور بھائی چارے کو فروغ دینے کے بجائے کشت وخون کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ انسان، انسان کا خون کرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت قدرتی عمل ہے اور ہر ذی روح کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے موت کے ذرائع تلاش کرتا ہے، جنگ کے اسباب پیدا کرتا ہے اور ہتھیار بناتا ہے۔

''سپاہی کی واپسی'' میں آنند لہر نے ایک ایسے فوجی کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ جو تمام فوجیوں کی زندگی اور ان کے خاندان کی ترجمانی کرتا ہے۔ پیٹر جو کہ ایک فوجی ہے اور فاطمہ اس کی نو بیاہی دلہن۔ یہاں آنند لہر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ فوجی اگرچہ جنگ کرتے ہیں، خون کی ہولی کھیلتے ہیں، لیکن ان کو بھی زندگی عزیز ہوتی ہے۔ وہ بھی رشتوں ناطوں میں بندھے ہوئے ہوتے ہیں لیکن ان کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ وہ حکم کے مطابق چلتے ہیں، حکم کے مطابق گولی چلاتے ہیں، خون کرتے ہیں اور گولی کھاتے بھی ہیں۔ ان کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہوتا وہ دوسروں کے حکم کے مطابق زندگی جیتے ہیں۔ ڈرامے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں آنند لہر نے ایک سپاہی اور اس کی بیوی کی زندگی کو پیش کیا ہے۔

فاطمہ: پیٹر

پیٹر: بولو فاطمہ

فاطمہ: آج سہاگ رات ہے۔ ملن کی رات ہے اور لگتا ہے کہ انسان نے دکھ بھری زندگی کو صرف اس لیے قبول کیا تاکہ سہاگ رات کا لطف لے سکے۔

پیٹر: لگتا ہے میری ہزاروں راتیں اس ایک رات کے انتظار میں بیت گئیں اور میں آج کی رات تمام رشتوں کو بھولنا چاہتا ہوں اور مجھے آج اگر یہ کہا جائے کہ یہ ایک بھیانک پاپ ہے تو میں یہ کرنے کے لیے بھی تیار ہوں۔

(گرم سانسوں کی آوازیں آتی ہیں پھر شہنائی کی آواز آتی ہے۔)

فاطمہ: (پیار بھرے لہجے سے) پیٹر۔

پیٹر: (کھوئے ہوئے انداز میں) فاطمہ!

اتنے میں ملٹری کا بینڈ جنگی دھن بجاتا ہے۔

فاطمہ: (چیخ کر) پیٹر کہاں جا رہے۔'' [۱۱]

پیٹر کی زندگی کی سب سے حسین خواہش ادھوری رہ جاتی ہے جب سہاگ رات چھوڑ کر حکم سے جنگ میں جانا پڑتا ہے۔ جنگ میں کئی فوجی مارے جاتے ہیں، ہزاروں بچے یتیم ہوتے ہیں، عورتیں بیوہ ہوتی ہیں، ماؤں کی گودیں خالی ہوتی ہیں اور نو بیاہی دلہنوں کے اپنے سپاہیوں سے ملنے کی آرزوئیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔ وطن کی خاطر لڑنے والے سپاہیوں کے اپنوں سے ملنے کے ارمان جنگ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن سرحدیں پھر بھی قائم رہتی ہیں۔ انسانیت کا قتل ہوتا ہے، زمین خالی کی جاتی ہے لیکن اسے بسانے کے لئے انسان نہیں رہتے۔ جنگ کے نتائج کو آنند لہر نے ڈرامے میں یوں پیش کیا ہے۔

آواز: جنگ زبان سے آواز چھین کر گالیوں کا انبار دے دیتی ہے۔

آواز: جنگ میں کوئی جیتتا ہارتا نہیں ہے۔

آواز: جنگ انسان کو وحشت کا سبق پڑھاتی ہے۔

آواز: جنگ میں لوگ نہ آگے بڑھتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹتے ہیں بلکہ بھاگتے ہیں۔'' [۱۲]

ڈراما اس وقت عروج پر پہنچتا ہے جب ایک فوجی کا بچہ اس کے کاندھے پر بیٹھنے کی ضد کرتا ہے اور فوجی یہ کہہ کر انکار کرتا ہے کہ اس کے کاندھے پر بندوق ہے۔ اس لئے وہ اسے کاندھے پر نہیں اٹھا سکتا اور بچے سے یہ کہتا ہے کہ یہ بندوق تمہاری حفاظت کے لیے ہے۔ بچہ دیکھنے کے لیے باپ سے بندوق لیتا ہے اور اچانک اس کا ہاتھ بندوق کے ٹریگر پر لگتا ہے جس سے فائر ہوتا ہے اور بچہ مر جاتا ہے۔ جس بندوق کو اس نے اپنے بچے کی حفاظت کے لیے رکھا تھا اسی سے اس کے بچے کی موت ہو جاتی ہے۔ یہاں آنند لہر علامتی انداز میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ سرحدیں متعین کرتے ہیں، جنگ کرتے ہیں ہتھیار بناتے ہیں وہ دراصل اپنی موت کے ذرائع خود تلاش کرتے

ہیں۔ڈرامے کا اختتام موہن اور سدھا کے مکالموں پر خوبصورت انداز میں یوں کیا ہے۔

''پھر سدھا پوٹلی سے دو چوڑیاں اور ایک خط نکالتی ہے اور خط پڑتی ہے۔

''پیارے پیٹر،سہاگ رات کے روز تم چلے گئے تھے اس کے بعد میں تڑپتی رہی۔ یہ دو چوڑیاں بھیج رہی ہوں تا کہ تمہیں احساس رہے کہ کوئی تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

سدھا: یہ پیٹر کہاں ہے۔

موہن: دشمن تھا مار دیا۔

سدھا اپنی چوڑیاں توڑ کر روتی ہوئی بھاگ جاتی ہے۔

موہن: (زور سے) سدھا۔

موہن اسٹیج پر اکیلا کھڑا ہے اور پردہ گر جاتا ہے۔''[۱۳]

موہن اور پیٹر دو الگ الگ ملکوں کے سپاہی ہیں۔ پیٹر کی جنگ میں موت ہو جاتی ہے اور اس کی بیوی سہاگ رات کی منتظر رہ جاتی ہے۔جبکہ موہن کی بیوی تمام عمر انتظار کرتی ہے کہ جنگ جیتنے کے بعد وہ اس کے لیے تحفے لائے گا لیکن بالآخر جب ان کا ملن ہوتا ہے،موہن جنگ سے واپس آتا ہے تو وہ اس کی پوٹلی کھولتی ہے۔جس میں سے تحفوں کے بجائے دشمن ملک کے نقشے اور فوجیوں کی ہڈیاں نکلتی ہیں۔اس بیانک منظر کو دیکھ کر سدھا اپنے پتی کو چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔اس طرح دونوں طرف کی امیدیں،خواہشات اور امنگیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان جس ملک کا بھی ہو اس کا درد ایک جیسا ہوتا ہے،رشتوں کا تقدس ایک جیسا ہوتا ہے۔انسان نے خواہ مخواہ سرحدوں کو جنم دے کر انسانی تمناؤں اور خواہشات کو ختم کر دیا ہے۔

ڈرامائی مجموعہ''نروان'' کے بعد آنند لہر کی دوسری منظر عام پر آنے والی تصنیف ان کا ڈراما''تپسوی کون'' ہے۔یہ ایک مکمل ڈرامہ ہے جو تیرہ مناظر پر مشتمل ہے۔تپسوی کون ۱۹۹۴ء میں انیس آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی سے شائع ہوا۔۸۰ صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت ڈرامہ ہے۔یہ ایک ایسا ڈرامہ ہے جو اسٹیج کے لوازم مہیا کرنے میں ایک اچھی کوشش کے مترادف ہے۔ڈرامے میں سماجی زندگی کے جن پہلوؤں کی ترجمانی کی گئی ہے وہ عصری مسائل سے

تعلق رکھتے ہیں۔مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے آنند لہر نے مختلف کرداروں کی باہمی گفتگو اور چال چلن کے مظاہراتی روپ کا بڑی خوبی سے سہارا لیا ہے۔رشوت خوری اور اس سے پیدا شدہ مسائل کی نقاب کشائی اس ڈرامے کا مقصد ہے۔سماج میں بعض لوگ رشوت لیتے ہیں لیکن بے ایمانی نہیں کرتے جبکہ بعض رشوت کو پاپ سمجھتے ہیں لیکن بے ایمانی کرتے ہیں،لوگوں کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرتے ،ان کے کام وقت پر نہیں کرتے نیز اپنی بیوی بچوں کے حقوق ادا نہیں کرتے۔کچھ لوگ رشوت ضرور لیتے ہیں لیکن غریبوں اور بے سہاروں کا خیال رکھتے ہیں۔جبکہ بعض رشوت کے پیسوں سے شراب پیتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں، اپنے گھر کا خیال نہیں رکھتے۔آنند لہر نے اسی بنیاد پر اس ڈرامے کا نام ''تپسوی کون'' تجویز کیا ہے اور یہ فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا ہے کہ ان میں سے اصلی ''تپسوی'' کون ہے۔

یہ ڈراما کردار نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔شنکر، شیو، ناگپال اور دھرم پال اس ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں۔جن کے ذریعے آنند لہر نے سماج میں رہنے والے الگ الگ طرح کے لوگوں کی زندگی کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔شنکر، شو، ناگپال اور دھرم پال الگ الگ صفات کے مالک ہیں۔ان کی سوچ، اخلاق واطوار، رہن سہن اور مزاج الگ الگ ہے۔جو اپنے اپنے خاندانوں کے سربراہ ہیں۔لہر نے ڈرامے میں انہیں کرداروں کو مرکز بنا کر دیگر ضمنی کرداروں کے ساتھ باہمی گفتگو کے ذریعے کئی سماجی مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ڈرامے کا اصل موضوع رشوت خوری، بے ایمانی اور انسانی اخلاق ہے۔لیکن بہت سی جگہوں پر رومانی عنصر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

زیر نظر ڈرامے کے پہلے سین میں شنکر کو اپنی بیوی سریتا اور بیٹے سریش سے محو گفتگو دکھایا گیا ہے۔شنکر محکمہ پولیس میں ملازم ہے اور رشوت سے بے حد نفرت کرتا ہے۔دنیا سے بالکل غافل ہے ایمانداری سے کام کرتا ہے لیکن رشوت نہیں لیتا۔اس کی معمولی تنخواہ سے بیوی بچوں کے اخراجات پورے نہیں ہوتے۔جس کی وجہ سے اس کے بچے اس پر خفا ہو جاتے ہیں اور وہ نہیں چاہتے کہ شنکر کی ایمانداری کی وجہ سے انہیں غربت و لاچاری میں دن گزارنے پڑیں۔لیکن شنکر کسی بھی صورت میں رشوت نہیں لینا چاہتا۔وہ دنیا کو ایک فریب اور دھوکھا سمجھتا ہے اور کسی بھی طرح دنیاوی زندگی بسر کر کے اگلی زندگی میں سورگ حاصل کرنا چاہتا ہے۔جس کے لئے اس کا یقین ہے کہ دنیا میں انسان جتنے زیادہ دکھ تکلیف برداشت کرے گا آخرت میں اسے اتنی ہی راحت ملے گی۔وہ اپنی بیوی اور بچوں کو بھی یہی نصیحت کرتا ہے اور ایسی ہی زندگی گزارنے کو کہتا ہے جبکہ وہ یہ سب نہیں کرنا چاہتے۔وہ زندگی جینا چاہتے ہیں عیش و

عشرت کی۔ شنکر اپنے بچوں کے اخراجات ادا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے بچے اس سے بیزار ہو جاتے ہیں اور اپنے باپ کی ایمانداری کو اپنے لئے بوجھ تصور کرتے ہیں۔ جب وہ کوئی مانگ اپنے باپ کے سامنے رکھتے ہیں تو وہ انہیں ڈانٹ دیتا ہے اور سادگی سے دنیا کی چندروزہ زندگی گزارنے کو کہتا ہے۔ جس سے روز بروز اس کے گھر کا ماحول بگڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں ڈرامے سے شنکر اور اس کی بیوی سریتا کے چند مکالمات ملاحظہ کیجئے۔

''سریتا: کیا زندگی ہے میری اور میرے بچوں کی ایک تو خالی چائے اور پھلکے اور دوسرے آپ کے تھپڑ۔

(رمیش کے سسکنے کی آواز آتی ہے۔)

شنکر: جو کماتا ہوں تمہیں دے دیتا ہوں اور کیا چاہتے ہو۔

سریتا: مگر آپ کی کمائی سے ہمارا گزارا نہیں ہوتا اور بھی تو آپ کی محکمے میں لوگ کام کرتے ہیں۔

شنکر: ہاں، ہاں کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ رشوت کھاتے ہیں میں نہیں کھا سکتا۔'' [۱۴]

شنکر کسی بھی صورت میں رشوت لینے کے لئے تیار نہیں ہوتا اور اس کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی بیوی اور بچوں کی بدگمانیاں دن بدن بڑھنا شروع ہو جاتی ہیں۔ شنکر کا چھوٹا بھائی ''شو'' جو ایک معمولی ملازم ہے لیکن اس کی زندگی شنکر سے بالکل مختلف ہے۔ شیو رشوت لیتا ہے لیکن رشوت لینے کے باوجود لوگوں کے دل میں عزیز ہے۔ وہ رشوت لیتا ہے لیکن لوگوں کے کام صحیح وقت پر کرتا ہے اور صرف انہیں کاموں کے لیے پیسے لیتا ہے جو جائز ہیں۔ اس لیے لوگ اسے رشوت خور ضرور سمجھتے ہیں لیکن ایمان دار بھی سمجھتے ہیں کیونکہ وہ جس سے بھی پیسے لیتا ہے اس کا کام صحیح وقت پر ضرور کرتا ہے۔ رشوت کے پیسوں سے اپنی بیوی بچوں کے اخراجات پورا کرتا ہے۔ ان کی تعلیم کے تمام تر اخراجات پورے کرتا ہے۔ بیوی کو خاطر خواہ عزت دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ گھر میں بہت مہان بن جاتا ہے اور اس کے گھر کا ماحول بڑا پرسکون اور خوشگوار رہتا ہے۔ شیو کے گھر کے ماحول اور اس کی بیوی بچوں کو دیکھ کر شنکر کا خاندان رشک کرتا ہے اور اس کی بیوی بچے بھی چاہتے ہیں کہ ان کے گھر کا ماحول اور آمدنی بھی ایسی

ہو۔ڈرامے میں آنند لہر نے اس کشمکش کو شنکر اور سریش کی باہمی گفتگو کے ذریعے یوں پیش کیا ہے۔

”سریش: تو پیتا جی چچا کتنا مہان ہے۔اپنے بچوں سے کتنا پیار کرتا ہے جوان کے لئے پاپ کر رہا ہے گناہ رہا ہے۔

شنکر: مگر ایمانداری کی زندگی بھی بہترین زندگی ہے۔

سریش: پتا جی ،آپ کی ایمانداری ہم پر بوجھ بن چکی ہے۔

شنکر: ایمانداری کبھی بھی بوجھ نہیں بنتی۔

سریش: پتا جی ،ایمانداری، بے ایمانی میں بھی ہوتی ہے۔اب چچا کو ہی لیجئے ۔وہ ایماندار بے ایمان ہے ۔رشوت لیتا ہے۔مگر جس سے پیسہ لے گا اس کا کام ضرور کرے گا۔“۱۵

شنکر کی ایمانداری کی لوگ صفت کرتے ہیں ۔مگر اس کے گھر میں عجب کشمکش ہے۔ پہلا سین شنکر ،سریش اور سریتا کی اسی کشمکش پر ختم ہوتا ہے۔

ڈرامے کا دوسرا سین ”شو“ کے دفتر سے شروع ہوتا ہے جس میں مختلف ملازموں کی زندگی کو پیش کرنے کی گئی ہے۔جن میں شیو،مس ورما،کرشنا،اروڑہ اور ساما وغیرہ قابل ذکر ہیں۔جن کے ذریعے فنکار نے مختلف مسائل کے ساتھ ساتھ مختلف انسانی خصائل کو دکھایا ہے نیز مختلف کرداروں کے سہارے رشوت خوری ،ایمانداری ،بے ایمانی،طاقت کا بے جا استعمال،عہدے کا ناجائز فائدہ اور بے کس و مجبور کی مجبوری کا ناجائز فائدہ جیسے معاملات کی نقاب کشائی کی ہے۔

شو ایک ایسا کردار ہے جو خوب رشوت لیتا ہے لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ ایک تو وہ جائز کاموں کے لیے رشوت لیتا ہے دوسرا کام وقت پر کرتا ہے اور تیسرے رشوت کی رقم دفتر کے تمام ملازمین میں بانٹ کر کھاتا ہے۔اس ضمن میں ڈرامے سے یہ اقتباس دیکھیں۔

”شو: لیجئے جناب کاغذات۔

گوپی چند: لو جناب لیجئے اپنا بقایا۔

(شو گوپی چند کو کاغذات دیتا ہے اور گوپی چند اسے نوٹوں کا

بنڈل۔)

شو: شکریہ،شکریہ۔

گوپی چند: یہی تو تمہارا کمال ہے بھائی اس ہاتھ سے پیسے لیتے ہواور اس ہاتھ سے کام کرتے ہوتمہارے جیسا ایماندار شخص میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔

شو: کاہے کی ایمانداری جناب مجھے معلوم ہے کہ یہ رشوت ہےاور بے ایمانی ہے۔

گوپی چند: ایسا مت کہو بھائی تمہاری بے ایمانی میں بھی ایمانداری ہے۔تم ہمیشہ رشوت کا پیسہ بانٹ کر کھاتے ہواور جس کا کام کرتے ہو پیسےاسی سے کھاتے ہو۔''[۱۶]

رشوت کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ لہرنے اس سین میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں اور سرکاری دفاتر میں تعینات افسروں کے اپنے ماتحت ملازموں کے ساتھ رویے اور عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے بے کسوں اور مجبوروں کے استحصال کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے۔جس کے لیے ایک افسر''ساما''اوراس کے دفتر میں کام کرنے والی ایک بیوہ خاتون''کرشنا''کے کردار کو پیش کیا ہے۔کرشنا ایک غریب بیوہ خاتون ہے جسے دفتر میں کام کاج کرنے کے لیے شور کھ لیتا ہے تا کہ وہ اپنے بچوں کا پیٹ پال سکے۔کرشنا ادھیڑ عمر کی ایک خوبصورت خاتون ہے جس کی خوبصورتی ہر کسی کے لیے جاذب توجہ ہے۔جب''ساما''کرشنا کو دیکھتا ہے تو اس کے جسم کو خوب گھورتا ہے۔کرشنا کو دیکھ کر ساما کی نیت خراب ہو جاتی ہے اور وہ اسے پانے کے لیے اس پر رعب جماتا ہے اور دفتر سے نکالنے کی دھمکی دیتا ہے۔تا کہ وہ مجبور ہو کر اس کے بہکاوے میں آجائے۔کرشنا کی بے بسی اور ساما کے رویے کو آنند لہر نے زیرِنظر ڈرامے میں یوں پیش کیا ہے۔

''ساما: حصے کی دوسری بات ہے، یہ عورت کسی بھی صورت میں یہاں پر کام نہیں کرسکتی۔

شو: حضور یہ نہایت ہی ظلم ہوگا اور اس کے بچے تو بھوکے مر جائیں

گے۔

ساما: بچے نہ میں نے پیدا کیے ہیں اور نہ ہی مجھے سنبھالنے ہیں۔ مجھے تو صرف دفتر کی ایڈمنسٹریشن سنبھالنی ہے۔

اروڑہ: جناب ہم نے کبھی بھی جناب کے ساتھ دغا نہیں کیا۔

ساما: میری بیوی کو مرے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں اور پھر میں جوان ہوں کبھی سوچا تم نے۔''[17]

مندرجہ بالا اقتباس سے ایک افسر کی ذہنیت کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ کس طرح موقع دیکھ کر وہ ایک مجبور عورت کی بے بسی کا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے جو ہمارے سماج میں عام ہو چکا ہے۔

ڈرامے کے تیسرے سین کی شروعات شوا اور اس کی بیوی نرملا کی آپسی گفتگو سے ہوتی ہے۔ شیو رشوت کے پیسوں سے بیوی کے لیے ساڑی اور بچوں کے لئے رنگ برنگے پھل لاتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف شنکر خالی ہاتھ گھر لوٹتا ہے۔ غربت اور تنگدستی کا شکار ہو کر شنکر کا چھوٹا بیٹا رمیش پڑوسی کے آم چراتا ہے۔ شنکر یہ سن کر آگ بگولا ہو جاتا ہے اور رمیش کو جان سے مارنا چاہتا ہے کہ اس نے پاپ کیا ہے لیکن اسے اپنے گناہ کا احساس نہیں ہوتا کہ بیٹے کی ضروریات پوری نہ کرنے کی وجہ سے اس نے پاپ کیا ہے نیز بھوک میں تنگ آ کر چوری کی ہے۔ شنکر کی بیوی سریتا بچے پر غصہ بھی کرتی ہے لیکن اس کی محرومیوں اور بے بسی پر ترس بھی کھاتی ہے۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے کہ بچے نے مجبور ہو کر چوری کی ہے۔ ڈرامے سے یہ چند مکالمات اس ضمن میں پیش نظر ہیں۔

''شنکر: غصے میں آ کر قتل کیوں نہیں کیا اس نے، اس کو جان سے کیوں نہیں مارا۔

سریتا: کیا کر رہے ہیں آپ کو شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔

شنکر: دکھ کی بات یہ ہے کہ تم اس کی وکالت کرتی ہو۔ اس کی چوری کی اور بے ایمانی کی۔

سریتا: بیٹا چور ہو یا پولیس انسپکٹر ماں کو جنم دیتے ہوئے تکلیف ایک طرح ہی کی ہوتی ہے۔ اور پھر رمیش کے اندر بھی آم کھانے کی خواہش

ہے۔

شنکر: مگر چوری کرنا پاپ ہے۔

(اتنے میں سریش وہاں پر آتا ہے۔)

سریش: پتا جی یہ چوری رمیش نے آپ کی ایمانداری کی وجہ سے کی ہے اور اگر آپ ایماندار ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ درختوں پر آم نہیں لگیں گے۔''۱۸

سریتا اور سریش رمیش کی چوری کا ذمہ دار شنکر کو ٹھہراتے ہیں کیونکہ وہ محرومی کا شکار ہو کر ان خصلتوں میں مبتلا ہوا ہے۔ جبکہ دوسری طرف شو کے بچے ہیں جنہیں وہ تمام آسائشیں میسر کرواتا ہے اور وہ برے کام کرنے کے بجائے اپنے مستقبل کو سنوارنے میں مصروف ہیں۔ شنکر رشوت نہیں لیتا لیکن بیوی بچوں کے حقوق بھی ادا نہیں کر سکتا۔ اپنے گھر کا ماحول خوشگوار نہیں بنا سکتا۔ جبکہ شو رشوت ضرور لیتا ہے لیکن بیوی بچوں کے حقوق ادا کرتا ہے، سکون کی زندگی جیتا ہے۔ عجیب کشمکش ہے کوئی پاپ کر کے خوش ہے اور کوئی ایماندار ہونے کے باوجود بے چین اور ذلیل وخوار۔ شنکر اپنی بیوی کو وقت نہیں دے سکتا۔ اس کی خوبصورتی اور اس کی جوانی کا لطف لینے سے بھی قاصر رہتا ہے۔ جب کی شو اور نرملا زندگی کا بھرپور لطف لیتے ہیں۔ ڈرامے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''شو اور نرملا گہری نیند سو جاتے ہیں۔ شنکر بستر پر بیٹھا ہے اور سریتا اس کے ساتھ لیٹی ہے سریتا نہایت ہی خوبصورت ہے۔ سریتا شنکر کو ہاتھ لگا کر ہلاتی ہے۔

شنکر: تنگ مت کرو۔

سریتا: کیوں زندگی بیت رہی ہے۔۔۔۔۔

شنکر: یہ دنیا ایک فریب ایک جھوٹ ہے۔

سریتا: مگر میرا جسم سچ ہے۔ اس کے اندر سلگتی ہوئی جوانی کی آگ سچ ہے۔''۱۹

مندرجہ بالا مکالموں سے میاں بیوی کی زندگی کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے نیز آنند لہر کی باریک بینی اور انسانی

رشتوں کی قدر و قیمت پر ان کی گہری نظر کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ڈرامے کے چوتھے سین میں ناگپال کی زندگی کو دیکھایا گیا ہے۔ناگپال جو ایک سرکاری ملازم ہے۔طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا ہے۔ناگپال کا کردار ان لوگوں کی ترجمانی کرتا ہے جو رشوت خور، کام چور، ظالم، بے ایمان اور شرابی ہیں۔ناگپال لوگوں سے خوب رشوت لیتا ہے اور ہر جائز اور ناجائز کام کے لیے رشوت بٹورتا ہے لیکن کسی کا کام بھی وقت پر نہیں کرتا۔جس کی وجہ سے لوگ اسے بے ایمان کہتے ہیں۔رشوت کے پیسوں سے جوا کھیلتا ہے، شراب پیتا ہے۔اسی وجہ سے ہر وقت ذہنی تناؤ کا شکار رہتا ہے۔شراب زیادہ پینے سے بداخلاق ہو جاتا ہے اور اسے اپنی بیوی کے حقوق اور رشتوں کے تقدس کا کوئی امتیاز نہیں رہتا۔اس کی بیوی شانتی ایک خوش اخلاق عورت اور فرماں بردار بیوی ہے۔جس کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے تنگ کرتا ہے۔دفتر کے ملازمین اور لوگوں کی نگاہ میں بالکل گر جاتا ہے اور اسے بات کرنے کا سلیقہ بالکل نہیں آتا۔آنند لہر نے ایک بگڑے ہوئے بداخلاق اور غیر مہذب کردار کے طور پر ناگپال کو پیش کیا ہے۔جس کا اندازہ ان مکالموں سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

ناگپال: عورت مرد کی خواہش ہے اور جب تک میں چائے نہ پیئوں یہ چائے نہیں پی سکتی۔کیونکہ میں اس کا پتی ہوں۔

بھگتو: نہ جانے کب برے آدمی اچھے آدمیوں کی بھلائی کا غلط فائدہ اٹھانا چھوڑیں گے۔

ناگپال: (شانتی سے) اچھا تو گھر چل، میں تجھے سیدھا کروں گا۔۔۔۔

شانتی: چلیئے ایسا ہی سہی، مگر اب تو چائے پی لیجئے۔

ناگپال غصے میں چائے پیتا ہے۔

ناگپال: چل اب تو دفع ہو یہاں سے۔'' [۲۰]

مندجہ بالا مکالموں سے سماج میں عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی، مردوں کا عورتوں کے ساتھ رویہ اور سماج میں عورت کے مقام و مرتبے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ڈرامے کے پانچویں سین میں شنکر کے بڑے لڑکے سریش اور آشا کی محبت کو دکھایا گیا ہے۔سریش اور آشا ایک دوسرے کے ساتھ محوگفتگو ہیں۔وہ ایک دوسرے کو چاہتے

ہیں لیکن سریش کی غربت اور اس کے باپ کی ایمانداری ان کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے۔سریش آشا سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔سریش آشا کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

سریش کی آواز: آشا تم کتنی خوبصورت ہو کہ آنکھیں ہی نہیں سارا جسم
تمہیں دیکھنا چاہتا ہے۔اور اگر ہونٹ چاندنی کے بھی ہوں تب بھی
تجھے چوموں تو ں ضرور میلی ہو جائے گی۔''۲۱

سریش کے باپ شنکر کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی ہے وہ اسے بڑا پاپ سمجھتا ہے اور اپنے بیٹے کو ان کاموں سے بچنے کے لئے کہتا ہے لیکن اس سے ان کی محبت کا جذبہ باز نہیں آسکتا اور وہ حالات سے تنگ آ کر ایک دوسرے کو ملنے کے بجائے دور سے چاہنے اور دلوں میں محبت کے جذبہ کو برقرار رکھنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

چھٹے سین میں آنند لہر نے سریش اور آشا کی باہمی گفتگو کے ذریعے دو انسانوں کی محبت اور سماجی برائیوں اور طبقاتی کشمکش کی وجہ سے محبت میں ناکامی کو پیش کیا ہے۔ڈرامے کے ساتویں سین میں رمیش اور نرملا کی محبت کو بیان کرتے ہوئے ذات پات اور طبقاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔رمیش اور نرملا ہم جماعت ہیں جو ایک دوسرے کو چاہتے ہیں۔لیکن رمیش ایک غریب گھرانے کا ہے جبکہ نرملا ایک جج کی بیٹی ہے۔رمیش کے پاس کتابیں اور قلم خریدنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے اور وہ ایک اچھے قلم کی تمنا دل میں دبائے رکھتا ہے۔بالآخر اسے ایک گرا ہوا قلم مل جاتا ہے جو اتفاقاً نرملا کا ہوتا ہے۔جماعت میں تلاشی لینے پر رمیش کے بیگ سے نکل آتا ہے۔جس پر استاد کو نرملا کے ساتھ وفاداری دکھانے کا موقع مل جاتا ہے اور وہ نرملا اور اس کے باپ کو خوش کرنے کے لئے رمیش کی خوب پٹائی کرتا ہے۔رمیش جب گھر پہنچتا ہے تو اس کا باپ بھی اسے پیٹتا ہے اور برا بھلا کہتا ہے۔جس پر رمیش کا بڑا بھائی سریش اس کی چوری کی ذمہ داری باپ کے سر لگاتا ہے کہ اس کی ایمانداری کی وجہ سے رمیش کو چوری کرنی پڑی ہے۔اگر اس کی اوپر کی آمدنی ہوتی تو رمیش کو چوری کی نوبت نہ آتی۔سریش اور شنکر کے مکالموں کے ذریعے آنند لہر نے اس منظر کو یوں پیش کیا ہے۔

''سریش: پتا جی آپ اس لیے ایماندار ہیں کیونکہ آپ کو اپنی تعریف
چاہیے۔مگر پتا جی پیٹ کو روٹی چاہیے تعریف نہیں۔رمیش کو پین چاہئے
عزت نہیں رمیش عزت نہیں چاہتا۔

شنکر: مگر بیٹا رشوت لینا پاپ ہے۔

سریش: پتا جی چچا کتنا مہان ہے وہ بھی جانتا ہے کہ رشوت لینا پاپ ہے
مگر پھر بھی ایسا کرتا ہے وہ بچوں کے سورگ کے لیے خود نرک میں جانا
جاتا ہے۔"۲۲

پورے ڈرامے میں ہر جگہ لہر نے بے ایمان اور ایماندار، رشوت خور اور رشوت سے نفرت کرنے والے کرداروں کی آپسی کشمکش دکھائی ہے۔شیو رشوت لے کر اپنی اولاد کو سکھ دینا چاہتا ہے، ان کا مستقبل بنانا چاہتا ہے، لوگوں کے کام کر کے ان سے دعائیں لینا چاہتا ہے۔جبکہ شنکر دنیا سے مکتی چاہتا ہے۔دنیا کو ایک فریب خانہ سمجھتا ہے اور دنیا کی ہر چیز کو فناہ سمجھتا ہے۔دنیا میں عیش وعشرت نہیں چاہتا اور نہ ہی اپنے بچوں کو دنیا کی آسائش دینا چاہتا ہے۔یہاں آنند لہر نے یہ فیصلہ ناظرین وقارئین پر چھوڑا ہے کہ وہ ان دونوں میں سے کس کو صحیح اور کس کو غلط قرار دیتے ہیں۔رشوت نہ لینا ایک اچھی بات ہے لیکن اولاد کے حقوق پورے نہ کرنا بری بات ہے۔جبکہ دوسری طرف رشوت لینا گناہ ہے لیکن اپنے بچوں کے حقوق ادا کرنا تاکہ وہ اچھی زندگی گزار سکیں اور سماج میں کسی کے کام آسکیں یہ بھی ایک اچھی بات ہے۔تپسوی کون کے آٹھویں سین کی شروعات دھرم پال اور اس کی بیوی رادھا اور ان کے بیٹے انوج اور شرد کی آپسی گفتگو سے ہوتی ہے۔اس سین میں دھرم پال کے روپ میں ایک دیانتدار، ایماندار، بے باک اور نڈر انسان کو پیش کیا ہے جو یہ بتانا چاہتا ہے کہ اگر انسان غلطی کرتا ہے تو اسے اپنی غلطی تسلیم کرنی چاہیے اور غلطی کی سزا بھگتنی چاہیے۔اس سے انسان کا کتھارسس ہو جاتا ہے۔اس کے نزدیک معاف کر دینا بہت بڑا جرم ہے۔آنند لہر نے دھرم پال کے روپ میں عدالتوں میں ہونے والی ناانصافیوں کو اجاگر کیا ہے کہ ہمارا عدلیہ نظام اس قدر گر چکا ہے کہ سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دیا جاتا ہے۔جس سے سچ دب جاتا ہے اور مجرم آزاد ضرور ہو جاتے ہیں لیکن اس سے ان کے دل کو اطمینان نہیں ملتا۔وہ تمام عمر اپنے آپ کو گناہ گار سمجھتے رہتے ہیں۔جس کو لہر نے یوں بیان کیا ہے۔

"دھرم پال: معاف کرنا سب سے بڑا گناہ ہے اور معافی مانگنا اس
سے بھی بڑا پاپ۔

رادھا: یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔

دھرم پال: بات تو یہ ہے کہ سزا بھگتنے سے انسان کا من ہلکا ہو جاتا ہے

بلکہ یوں کہا جائے کہ پاپ ختم ہو جاتا ہے۔مگر معاف کرنے سے اتنی
بڑی سزا ملتی ہے کہ انسان کا جینا مشکل ہو جاتا ہے۔''۲۳؎

اس کے ساتھ ساتھ آنند لہر نے ہمارے سماج میں بسنے والے ایسے کئی لوگوں کے چہروں سے بھی نقاب ہٹایا ہے جو مختلف سرکاری اداروں میں تعینات ہیں۔ یہ لوگ اگر چہ رشوت نہیں لیتے لیکن ان کی نا اہلی سے اس طرح کے کئی ایسے فیصلے ہوتے ہیں جن سے بہت بڑی نا انصافیاں ہوتی ہیں۔آنند لہر نے عدالتوں میں تعینات ججوں کا ذکر بھی کیا ہے۔وہ خود چونکہ ایک بہت بڑے وکیل تھے اور عدالت میں مختلف قسم کے مقدمات کی پیروی کرتے تھے اس لئے عدالتوں میں ہونے والی نا انصافیوں سے وہ خوب واقف تھے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عدالتوں میں ہونے والی نا انصافیوں اور ججوں کی رشوت خوری کو بھی اجاگر کیا ہے۔اس ضمن میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

''دھرم پال: کیونکہ ایمانداری کا مطلب صرف رشوت کھانا نہ ہے۔ بلکہ
کام کی ایمانداری،سوچ کی ایمانداری۔ایک ڈاکٹر اگر بیماری کو نہ سمجھے
اور پھر بھی علاج کرے تو یہ بے ایمانی ہے۔ چاہے علاج مفت میں ہی
کیوں نہ کیا جائے۔اسی طرح جو جج انصاف نہیں کر سکتا ہے اسے فیصلہ
بھی نہیں کرنا چاہیے۔''۲۴؎

یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ سماج میں بے ایمانی کرنے والے لوگ طرح طرح کے حربے استعمال کر کے غریب عوام کو لوٹتے ہیں،انہیں دھوکھا دیتے ہیں۔جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس میں ڈاکٹروں اور ججوں کا ذکر کیا گیا ہے۔اب ہمارے سماج میں بے شمار ایسے ڈاکٹر ہیں جو اپنی لاعلمی کی وجہ سے لوگوں کے علاج کرنے کے بجائے ان کو غلط دوا دے کر کئی بیماریوں میں مبتلا کر رہے ہیں۔یہی مسلہ عدالتوں میں براجمان بہت سارے ججوں کا بھی ہے۔جنہیں قانون کا صحیح شعور نہیں ہوتا اور ان کی اس لاعلمی کا شکار کئی بے گناہ لوگ ہو جاتے ہیں۔اسی طرح بعض لوگ بے باک اور ایماندار ہوتے ہیں،ایمانداری ان کا اصول ہوتا ہے۔جبکہ بعض صرف اپنی بزدلی اور بے جرأتی کی وجہ سے ایماندار بنے بیٹھے ہیں۔انہیں اپنی بے ایمانی اور گناہ کا احساس نہیں ہوتا لیکن دوسرے پر ہر وقت تنقید کرتے ہیں۔ جوان لڑکیاں جنہیں ایک مرد کا پیار،محبت اور ساتھ چاہیے ہوتا ہے انہیں اس بندھن میں بندھنے کے بجائے دھرم،مذہب وملت،رنگ ونسل اور ذات پات کی بنیاد پر پابندیاں لگا کر ان کی زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔جس

سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ لوگ اپنی انا کی تسکین کے لئے دوسروں کے حقوق دبا دیتے ہیں۔

دسویں سین میں سماج کے ایسے لوگوں کو پیش کیا گیا ہے جو بری عادتوں کی وجہ سے جسمانی توانائی کم ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی صلاحیتوں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ عادتیں ان کے اذہان کو کند کر دیتی ہیں اور یہ لوگ اخلاقی پستی، ذلت ورسوائی اور بے چینی کا شکار ہوجاتے ہیں۔جن لوگوں کے اندر جنسیاتی ہوس جنم لے لیتی ہے وہ اس قدر اس کا شکار ہوتے ہیں کہ جسمانی طاقت کھو جانے پر بھی اس ذلالت سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔اسی ضمن میں یہ مکالمہ دیکھئے۔

''ہوس تو تیرے دل میں اب بھی قائم ہے گو جسم کی طاقت چلی گئی۔'' ۲۵

دراصل بدکاریوں کی عادت جب حد سے بڑھ جائے تو آخری عمر میں یہ انسان کو ذلیل وخوار کر دیتی ہے۔ انسان کے پاس دولت، شہرت، عزت کچھ بھی نہیں رہنے دیتی۔ یہی حال ناگپال کا ہوتا ہے۔ جو رشوت لیتا ہے، جوا کھیلتا ہے اور اتنی شراب پیتا ہے کہ مال و دولت ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی صلاحتوں اور اخلاقی قدروں سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ یہ مکالمے ملاحظہ کیجئے جن میں آنند لہر نے ناگپال کی زندگی کی منظر کشی بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔

''ناگپال: پیٹ میں سخت درد ہے۔ پیسے ختم ہو گئے ہیں۔تنخواہ ملنے کو ابھی پندرہ دن باقی ہیں۔اگر شراب نہ پیئوں گا تو مر جاؤں گا۔

شانتی: مگر میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔صبح سے بھوکی بیٹھی ہوں۔

ناگپال: (شانتی کے پیر پکڑ کر) کچھ کرو شانتی کچھ کرو۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔

(ناگپال یہ کہہ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔شانتی چاروں طرف دیکھتی ہے۔ سامنے اپنے گھر کے دروازے کے باہر مہادیو پچاس کا نوٹ اپنے ہاتھ میں لئے کھڑا ہے۔'' ۲۶

مندرجہ بالا اقتباس میں جہاں ایک مرد کی بے بسی، بے حسی اور بدکاری عیاں ہوتی ہے وہیں ایک عورت کی

فرماں برداری، احساس اور درد کا احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح ایک پھوہڑ اور بد اخلاق پتی کے لیے اپنا جسم تک فروخت کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ شانتی اپنے پتی کے لیے شراب خریدنے کے لئے ۵۰ روپیہ مہادیو سے لیتی ہے۔ جس کے عوض اسے مہادیو سے اپنا جسم نوچوانا پڑتا ہے۔ یہاں عورت کے ایثار و قربانی کا جذبہ بھی کھل کر سامنے آتا ہے وہیں سماج میں ایک بے بس اور مجبور عورت کی بے بسی اور مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے درندے بھی کھل کر سامنے آتے ہیں۔ شانتی اپنا جسم بیچ کر مہادیو سے ۵۰ روپیہ لیتی ہے جس کی منظر کشی آنند لہر نے یوں کی ہے۔

''ناگپال: اگر میں مر گیا تو تم بیوہ ہو جاؤ گی اور ہندو دھرم کے مطابق بیوہ کو نہ تو اس دنیا میں چین ہے اور نہ ہی اگلی دنیا میں۔

(یہ سن کر شانتی دوڑ کر جاتی ہے اور مہادیو سے پچاس کا نوٹ چھین لیتی ہے۔ اس کے بعد مہادیو اور شانتی مکان کے اندر چلے جاتے ہیں۔ مہادیو شانتی کے بدن کے اوپر کود پڑتا ہے۔ اس کے جسم کو کاٹتا ہے اور
شانتی تڑپنا شروع کر دیتی ہے۔)

مہادیو: پچاس روپے دیے ہیں۔ کاٹوں گا تیرے بدن کو نوچوں گا۔

شانتی: رحم کرو، رحم کرو۔

مہادیو: تم نے مجھ پہ رحم کیا تھا۔ کتنے برسوں سے میں تجھے اشارے کر رہا ہوں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔ اور آج بھی تم تب آئی ہو جب تجھے اپنے پتی کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ شانتی کے چیخنے کی آواز آتی ہے۔ پھر مہادیو نے شانتی کے پیچھے زور سے لات ماری اور شانتی اٹھ کر چلی گئی۔'' ۲۷

بارہویں سین میں وہ تمام جذبہ سمٹ آتا ہے جس کے لیے دو خاندانوں کے آپسی کشمکش کو دیکھایا گیا ہے جن کی نمائندگی شنکر اور شو کرتے ہیں۔ شنکر جو اپنی بیوی اور اولاد کی ذمہ داریوں کو نبھانے سے بالکل قاصر رہتا ہے اور اس

کے برعکس شو یہ تمام بخوبی نبھاتا ہے۔جس کے نتیجے میں شنکر کی بیوی پریشانی، تنگدستی، محرومی اور مایوسی کی زندگی بسر کرتی ہے۔اپنے پتی کے پیار سے محروم رہتی ہے۔جبکہ اس کے دولڑکے سریش اور رمیش زندگی کی تلخیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے نتیجتاً رمیش چوری کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور سریش بیماری میں مبتلا ہوجاتا ہے۔شنکر اس کا علاج نہیں کروا پاتا اور وہ بالآخر تڑپ تڑپ کر اکیلا ہسپتال میں جان دے دیتا ہے۔

ڈرامہ اپنی انتہا کو اس وقت پہنچتا ہے جب رامو اور سریش زمانے کی بے راہ روی، تنگدستی ولاچاری کی وجہ سے ہسپتال میں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتے ہیں اور کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہوتا۔راموں کا درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو اس کی آہ وبکا سن کر سریش برداشت نہیں کرسکتا اور وہ اس کے پیٹ میں چاقو مار کر اسے قتل کر دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کا بھی انتقال ہوجاتا ہے یہاں حالات وزمانے کی ستم ظریفی عروج پر نظر آتی ہے۔

ڈرامے کے تیرھویں اور آخری سین میں شو ایک حادثے کا شکار ہوجاتا ہے اس کے تعلیم یافتہ بچے اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔شو کا ایک بچہ ڈاکٹر اور دوسرا انجینئر بن جاتا ہے۔وہ لوگوں کے ساتھ اچھا رویہ اختیار کرتے ہیں۔اس کا بچہ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر کے عہدے پر فائز ہوتا ہے وہ بڑی نیک نیتی اور محنت سے لوگوں کا علاج کرتا ہے، ان کی خدمت کرتا ہے۔جس سے لوگ شو پر نہایت خوش ہوتے ہیں اور اس کے بچوں پر بھی۔یہاں ڈرامہ نگار کا مقصد واضح ہوجاتا ہے۔ایک شخص اگرچہ رشوت لیتا ہے لیکن اپنے بچوں کو ڈاکٹر اور انجینئر بنانے میں کامیاب ہوجاتا ہے جبکہ دوسرے کی لاپروائی کی وجہ سے اس کے بچے چور اور ڈاکو بن جاتے ہیں۔ان دونوں کا ڈرامے میں تقابل کیا گیا ہے اور اسی بنیاد پر آنند لہر نے اس ڈرامے کا نام ''تپسوی کون'' رکھا ہے کہ آخر ان دونوں میں سے کس کی تپسیا قبول ہوگی۔لہر نے خود ڈرامے میں کھل کر یہ فیصلہ واضح نہیں کیا بحرحال سماج کے مختلف کرداروں کو اپنے ناظرین کے سامنے ڈرامے کی وساطت سے رکھا ہے۔جس میں یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کے ان میں سے آخر کس کی تپسیا قبول ہوسکتی ہے۔ڈرامے کا اختتام یوں کیا ہے کہ ڈرامہ کتاب سے ختم ہونے کے ساتھ ہی ساتھ قاری کے ذہن میں چلنا شروع ہوجاتا ہے اور قارئین کو اس پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

''سرحدیں'' ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں کل تین مختصر ڈرامے شامل کیے گئے ہیں۔جن میں سرحدیں، پل اور زندگی شامل ہیں۔لہر نے سرحد کے قریب زندگی گزاری تھی اور وہ سرحدوں پر ہونے والے ظلم و ستم اور قرب وجوار میں رہنے والے لوگوں کے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔یہی وجہ ہے کہ لہر کے ہاں سرحدوں کو

مرکزیت حاصل ہے۔لہر نے سرحد کوسب سے بڑی لعنت قرار دیا ہے۔اس موضوع پر انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کا ناول ’’سرحدوں کے بیچ‘‘ اسی موضوع پر محیط ہے ۔جبکہ ایک افسانوی مجموعہ ’’سرحد کے اس پار‘‘ بھی اسی مناسبت سے ہے۔زیرنظر مجموعے’’سرحدیں‘‘میں شامل دوڈرامے’’سرحدیں‘‘اور’’پل‘‘ بھی سرحداوراس کے وجود سے پیدا شدہ حالات اورسرحدوں کےآس پاس بسنے والےلوگوں کے مسائل اوران کی مشکلات کی عکاسی کرتے ہیں۔آنندلہرایک صاف ذہن انسان تھے۔وہ مذہب وملت،رنگ ونسل،طبقاتی کشمکش اورعلاقائی بندشوں کے بالکل خلاف تھے۔سرحدی حصار میں بندکرکےلوگوں کے جذبات واحساسات کاقتل کرنے والے سیاسی چہروں سے بہت بیزار تھے۔یہی وجہ ہے کہ اپنی مختلف تخلیقات میں مختلف اصناف کے ذریعے ان چیزوں کی بھرپور مذمت کرتے نظر آتے ہیں۔زیربحث ڈرامائی مجموعے پر بحث کرتے ہوئے فراغ روہوی لکھتے ہیں۔

> ’’لعنتوں میں سب سے بدترین لعنت سرحدیں ہیں۔صدحیف!انسان نے خوداس لعنت کا طوق اپنے گلے میں ڈال رکھا ہے۔سرحدیں نہ صرف زمینی امتیاز کا سبب بنیں بلکہ انسانیت کی تفریق کی ذمہ دار بھی!سرحدوں نے زمینوں کومنقسم کرکےان پر بسنے والے انسانوں کو بھی تقسیم کردیاہے نیز انسانوں کے درمیان نہ ختم ہونے والی خلیج پیدا کر دی ہے۔محبت اور رواداری کے بجائے نفرتوں کوجنم دیاہے اورامن و امان کی جگہ وسوسوں،دہشتوں،تباہیوں اور بربادیوں کی فضا پیدا کی ہے۔‘‘۲۸

زیرنظرڈراموں کا مجموعہ ۲۰۰۶ءمیں گلستان پبلیکیشنز کلکتہ سے شائع ہوا۔اس کا دیباچہ شبیراحمد نے لکھاہے۔ اس میں شامل تین ڈرامے ریڈیائی ڈرامے ہیں۔ریڈیائی ڈراموں کے اپنے تقاضے ہوا کرتے ہیں۔یہاں ہمیں کچھ نظرنہیں آتاہے۔نہ اسٹیج،نہ کردار،نہ لباس،نہ میک اپ س اورنہ رنگ وروشنی۔یہاں صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں۔موسیقی کی آوازیں،مکالموں کی آوازیں۔یہاں فنکارخودمختار ہوتاہےاورقلم اس کا ہتھیار ہوتاہے۔

فنکاراپنےقلم سے کرداروں کے اوصاف گنواتا ہے،منظرکشی کرتا ہےاورمکالموں میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ریڈیوکے ذریعے نشرکیا جانے والا ادب نشریاتی ادب کہلاتا ہے۔اردومیں نشریاتی ادب میں ریڈیوڈرامے کو

اہم مقام حاصل ہے۔ریڈیوڈرامے میں آواز کے ذریعے ساری کیفیات وپس منظر کوپیش کیا جاتا ہے۔ڈرامہ ریڈیو کی اہم ترین صنف ہے ۔اردو کے کئی ڈرامے ریڈیو سے نشر کیے گئے جومختلف سماجی و سیاسی موضوعات پر محیط ہیں۔ریڈیائی ڈراموں کے لئے اسکرپٹ سب سے لازمی چیز ہے۔فنکارکوریڈیائی تکنیک پر دسترس ہونا ضروری ہے۔اردو کےکئی ڈرامہ نگاروں نے زندگی کی حقیقتوں کوریڈیائی ڈراموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔آنندلہر کے زیر بحث مجموعے کے تینوں ڈرامے کئی بار ریڈیوکشمیر سے نشر ہوچکے ہیں۔وہ خودبھی ریڈیوکشمیر سے منسلک رہے۔اسی لیےان کی تخلیقات وقتاً فوقتاً ریڈیو سےنشر ہوتی رہیں۔

اس مجموعے میں شامل پہلا ڈراما ’’سرحدیں‘‘ ہے جوکہ ۲۷صفحات پر مشتمل ہے۔موہن جوکہ سپاہی ہےاور سریتاایک خوبصورت لڑکی ،اس ڈرامے کے مرکزی کردار ہیں۔دیگر چھوٹے چھوٹے کردار وقتاً فوقتاً اپنا رول ادا کرتے ہیں۔اس ڈرامے میں لہر نے ملک کوتقسیم کرنے والی اس لکیر کا ذکر کیا ہے جس نے انسانی رشتوں میں دراڑیں پیدا کردیں۔جس نے نہ صرف انسانوں کے درمیان ایک وقتی خلا پیدا کیا بلکہ کبھی نہ ختم ہونے والی خلا پیدا کرکے جذبات واحساسات کاقتل کردیا۔خونی رشتے بکھر گئے، بھائی سے بھائی جدا ہوگئے، بہنوں کے بندھن ٹوٹ گئے ،نفرتوں نے جنم لے لیا،مشترکہ تہذیب بکھر گئی۔ ہر طرف تباہی و بربادی کی فضا پیدا ہوگئی ،امن وسکون لٹ گیا۔لوگ ہتھیاروں اور بارودوں کی شکل میں انسانی تباہی کے ذرائع تلاش کرنے لگے۔اس ڈرامے پرتبصرہ کرتے ہوئےشبیراحمد سرحدوں کےمتعلق یوں لکھتے ہیں۔

> ’’آخرکب تک سرحدیں انسانی رشتوں میں دراڑ پیدا کرتی رہیں گی؟ کیاوہ دن نہیں آئے گا کہ جب انسان تمام نفرتوں کو بھلا کرآفاقی ضرورتوں کے تحت تمام سرحدوں کو پھلانگ جائے گا ؟ اس وقت سرحدیں تو ہوں گی ،لیکن انسانیت کو بانٹنے کے لئےنہیں،ان کے کرب رسائی کے لئےنہیں بلکہ انتظامیہ کی سہولتوں کے لیے ہوں گی، تا کہ انسانی زندگی اور بھی بہتر بنائی جاسکےاوراس کی روزافزوں ضرورتوں کی تکمیل کی جاسکے۔‘‘۲۹

آنندلہرنے ایک فوجی کومرکزی کردار بنا کراس کی زندگی کوپیش کرکے سرحدوں پرطنز کیا ہے۔سپاہی جس بھی

ملک کا ہو۔ وہ رشتوں ناطوں میں ضرور بندھا ہوتا ہے۔ اس کے گھر پر اس کا انتظار کوئی نہ کوئی ضرور کرتا ہے۔ اسے بھی ضرورت ہوتی ہے رشتوں کو نبھانے کی، پیار اور محبت کرنے کی۔ لیکن اسے حکم کے تحت چلنا ہوتا ہے۔ اس کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں ہوتا۔ حکم ملنے پر اسے سب کچھ نہ چاہتے ہوئے بھی بھولنا پڑتا ہے۔ ڈرامے سے یہ مکالمے ملاحظہ کیجئے جس میں ایک سپاہی کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔

''پیٹر: مجھے ابھی جانا ہے۔

میری: مگر کیوں؟

پیٹر: دیش پر دشمنوں نے حملہ کر دیا ہے اور ریڈیو پر اس کا اعلان بھی ہو گیا ہے۔

میری: مگر بچوں کا انتظار تو کر لو۔

پیٹر: نہیں جنگ شروع ہوگئی ہے توپیں چل رہی ہیں اور ان کی آواز میں بچوں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔''[۳۰]

انسان جب سپاہی بنتا ہے تو پھر اسے دشمنی کرنا، لڑنا سیکھایا جاتا ہے۔ اسے رشتوں کو بھول کر لڑائی لڑنی ہوتی ہے، حکم کے تحت چلنا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حکم کے بنا فوجی اپنی جان بھی نہیں بچا سکتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کام سے جان جانے کا خطرہ ہے کرنا پڑتا ہے۔ جس کی ایک خوبصورت مثال ڈرامے سے ملاحظہ کریں۔

''چندو: فوجی تیز چل

فوجی: سنتے ہی تیز چلنا شروع کر دیتا ہے، چندو ہنستا ہے۔

چندو: انسان چلتا ہے مگر فوجی پریڈ کرتا ہے۔

(چلتے چلتے ایک گڑھا آتا ہے اور فوجی اس میں گر جاتا ہے۔

ایک بچہ: مگر یہ دائیں کیوں نہیں مڑا۔

چندو: کیونکہ فوجی کاشن کیے بغیر دائیں یا بائیں نہیں مڑ سکتا۔''[۳۱]

اس ڈرامے میں آنند لہر نے موہن اور سریتا کی محبت کا خاکہ بھی بڑی خوبصورتی سے کھینچا ہے۔ وہ آپس میں بے پناہ محبت کرتے ہیں لیکن نفرتیں انہیں ایسا نہیں کرنے دیتیں۔ نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان جہاں

بھی ہوں جس ملک میں ہوں ان کے دکھ درد، خوشی غمی اور پیار محبت ایک طرح کا ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے بنا اپنے آپ کو نامکمل سمجھتے ہیں۔ پھر یہ سرحدیں کیوں ضروری ہیں۔ آنند لہر انسانی عقل پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کو اللہ نے آزاد پیدا کیا۔ اس نے زمین کی کوئی تخصیص، کوئی حدود متعین کر کے انسان کے انسان کے درمیان نفرت پیدا نہیں کی۔ لیکن انسان نے خود سرحدوں کو جنم دیا۔ سرحدوں کا وجود دراصل کئی بیماریوں کی جڑ ہے۔ سرحدیں نفرتیں، دشمنی، فساد اور بربادی کی بنیاد ہیں۔ جب سرحدیں قائم ہو جائیں تو تباہی و بربادی لازمی ہو جاتی ہے۔ جنگ اور اس کے نتائج کو پیش کرتے ہوئے لہر لکھتے ہیں۔

''سپاہی: نفرت کی فصل بیجو، دوسروں کو مارو، انسانوں کا لہو پیو، یہ مت سوچو کہ یہ دشمن کے علاوہ انسان بھی ہیں، کسی کا بھائی بھی ہے، بیٹا بھی ہے خاوند بھی ہے۔۔۔۔

دوسرا شخص: مگر کیوں تم کیوں ان کا خون بہانا چاہتے ہو؟

فوجی: اس لئے کہ جنگ یہ سیکھاتی ہے اور جنگ ضروری ہے انسان کے قتل کے لیے۔

ایک بوڑھی: ٹھیک کہتے ہو بھائی جنگ کے لئے سرحدیں ضروری ہیں۔ ۳۲؎

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ بربادی کا دوسرا نام ہے۔ جنگ میں رنگ و نسل اور قوم و ملت کو دیکھے بغیر، انسانی رشتوں کو پہچانے بغیر اور جنگ کے نتائج پر غور و ہوز کئے بغیر قتل و غارت ہوتا ہے۔ یہ سب اس لئے ہوتا ہے کیونکہ سرحدوں کو قائم رکھنا ہے۔ آنند لہر اصل میں ان تمام حادثات و مشکلات کی ذمہ دار سرحدوں کو ٹھہراتے ہیں۔ جو انسان نے خود اپنی تباہی کے لیے قائم کی ہیں۔

ڈرامے میں تصادم اور کشمکش اس وقت عروج پر پہنچتی ہے جب دونوں ملکوں کے سپاہی آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ جنگ شروع ہوتی ہے کئی بے گناہوں کا قتل ہوتا ہے۔ سپاہی آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ رشتوں ناطوں کو بھول کر لاشوں کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے سپاہی ایک دوسرے کی تباہی کے منصوبے بنا رہے ہوتے ہیں لیکن قدرتی بھونچال سے زمین کھسکنے سے ایک دوسرے کی سرحدوں میں چلے جاتے ہیں۔ جس سے دونوں ملکوں

کے سپاہی مایوسی اور ناکامی کا شکار نظر آتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ قدرت کے آگے سرحدیں بے بنیاد ہیں۔ یہ کسی بھی قدرتی آفت کا مقابلہ نہیں کرسکتی بلکہ انسانیت کے لیے انسان کی خود ساختہ ایک گندی حرکت ہے جس کی وجہ سے جنگ ہوتی ہیں۔ جو نفرت پیدا کرتی ہیں اور انسان کو اصل سے منقطع کر دیتی ہیں۔

ڈرامے کا اختتام آنند لہر نے موہن کی اس پوٹلی پر کیا ہے جو پورے ڈرامے میں تجسس و جستجو کے لیے مرکز بنی رہتی ہے اور آخر میں جب سریتا اسے کھولتی ہے تو تب بھید آشکار ہوتا ہے کہ اس پوٹلی میں سریتا کے لیے تحفے کے بجائے حریف ملک کے سپاہیوں کی ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں اور ساتھ میں پیٹر نامی ایک سپاہی کی بیوی کا خط ہے۔ جس میں وہ اپنے پتی کی منتظر دکھائی گئی ہے۔ جو شادی کے فوراً بعد اسے سہاگ رات سے پہلے ہی چھوڑ کر جنگ میں چلا جاتا ہے۔ جب یہ دردناک واقعہ سریتا دیکھتی ہے تو اس کا دل دہل جاتا ہے اور وہ اپنی چوڑیاں توڑ کر موہن کو چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ آخر میں لہر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سرحدوں کے پہرے کے لیے لاکھوں سپاہیوں کے بچے یتیم ہو جاتے ہیں، ماؤں کی گودیں خالی ہو جاتی ہیں اور کئی نوبیاہی دلہنوں کے سہاگ کے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہمارا سیاسی نظام ایسا ہے کہ ان تمام نتائج کی پرواہ کیے بغیر سرحدوں کے قیام اور جنگ و بربادی کے سامان مہیا کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

اس مجموعے میں شامل دوسرا ڈرامہ ''پل'' ہے۔ ۲۵ صفحات پر مشتمل یہ ایک دلچسپ ڈرامہ ہے۔ گوپی اور نرمل کہانی کے مرکزی کردار ہیں۔ جن کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ان کے ساتھ چھوٹے بڑے کئی ضمنی کردار بھی ہیں جو کہانی کو انجام تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ دراصل اس ڈرامے کا موضوع بھی سرحد ہی ہے جہاں لہر نے ایک دریا کو سرحد بنا کر پیش کیا ہے۔ جس کے دونوں طرف بستیاں آباد ہیں۔ دونوں طرف کے لوگوں کو آرزوئیں، امنگیں اور خواہشیں ایک دوسرے سے ملنے کے لئے تڑپاتی ہیں اور وہ خطرات کے باوجود دریا کو پار کر کے ایک دوسرے سے ملنے کے لیے جاتے ہیں۔ جس سے انہیں جانی و مالی نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ڈرامے کی شروعات نرمل اور گوپی کے مکالموں سے ہوتی ہے جو سرحد کے آر پار رہتے ہیں۔ ان کے اندر ایک دوسرے کے لئے تڑپ ہے، لگاؤ ہے، محبت ہے لیکن دریا ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ ایک طرف گوپی رہتی ہے اور دوسری طرف نرمل۔ ایک دن خطرات کی پرواہ کیے بغیر گوپی دریا کے اس پار نرمل سے ملنے چلی جاتی ہے۔ جس سے اس پر طرح طرح کے الزامات لگتے ہیں۔ سماج میں اسے ذلت کی زندگی گزارنی پڑتی ہے جو ایک سماجی برائی

ہے۔اگر غلطی مرد کرے پھر بھی بدنامی عورت کی ہوتی ہے۔اس کے بعد مختلف کرداروں کے ذریعے آنند لہر نے ان کے ساتھ دریا کی وجہ سے ہونے والے حادثات کو پیش کیا ہے۔ڈرامے سے یہ مکالمے ملاحظہ کریں۔

''شخص ایک: مہاراج بالکل ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے بخار تھا اور میرا بیٹا
میرے لیے اس دریا کے پار دوائی لینے کے لئے گیا اور جب وہ واپس
لوٹ رہا تھا تو اس دریا میں آئے سیلاب میں بہہ کر مر گیا۔
شخص دو: مہاراج میرا بچہ اسکول گیا جب واپس آنے لگا تو اس کے بیچ
میں پہنچا تو تیز ہو گیا۔میرے بچے کو بہا کر لے گیا۔''۳۳

اس وبال سے لوگ طرح طرح کے حادثات کا شکار ہوتے ہیں اور بالآخر وہ یہ طے کرتے ہیں کہ اس سے بچنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔تب ایک سادھو یہ مشورہ دیتا ہے کہ دریا پر پل تعمیر کر کے حادثات سے بچا جا سکتا ہے۔تمام لوگ اس مشورے کو تسلیم کرتے ہیں اور پل بنانے کا مصمم ارادہ کر کے پل کی تعمیر شروع کرتے ہیں اس دوران انہیں طرح طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔معصوموں کی عصمتیں لٹتی ہیں، بے گناہوں کے قتل ہوتے ہیں اور گھر بار لٹ جاتے ہیں۔لیکن وہ لوگ ان تمام چیزوں کو برداشت کرتے ہوئے پل تعمیر کر کے دو بستیوں کے بیچ خلا کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو کہ مصیبتوں کی جڑ ہے۔اس ضمن میں ڈرامے سے یہ اقتباس پیش نظر ہے۔

''گردھاری: اس وقت عزت بے عزتی کی بات چھوڑ و صرف پل بناؤ
اور پل بنانے میں مصروف رہو۔
بوڑھی: مر جاؤ تم سب مر جاؤ۔
شخص ایک۔ کیا ہو، دادی ماں بولو تو سہی۔
بوڑھی۔ تم سب لوگ پل بنانے میں مصروف ہو اور ساتھ کے گاؤں
والے تمہارے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔
لڑکی۔ نرمل۔۔۔۔اونرمل
نرمل جو کہ پل بنانے میں مصروف ہے زور سے آواز دیتا ہے۔
نرمل۔ کیا ہوا

لڑکی۔ میری عزت لٹ گئی ہے۔

نرمل۔ چلو کوئی بات نہیں کیونکہ پل کی تعمیر کے لیے یہ سب قربانیاں دینا ضروری ہے۔''۳۴

یہ سب برداشت کرنے کے باوجود لوگ پل کی تعمیر میں مصروف رہتے ہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات صاف عیاں ہوتی ہے کہ سرحدیں لوگوں کے جذبات واحساسات کا قتل کرتی ہیں اور سرحدوں کے قرب وجوار میں رہنے والے لوگوں کو ایک دوسرے سے جڑنے کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ وہ اپنے درمیاں حائل اس لعنت کو ختم کرنے کے لئے ہر وقت بے چین رہتے ہیں۔ مندرجہ بالا مکالمات سے اس بات کا اندازہ بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ سرحدوں کے قریب بسنے والے لوگ سرحدوں کو ختم کرنے کے لئے اپنی معصوم بچیوں کی عصمت ریزی ہوتی ہوئی برداشت کر سکتے ہیں، اپنا گھر بار لٹا سکتے ہیں، اپنے عزیز واقارب کی قربانیاں دے سکتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا کرنے والی اس لکیر کو کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ تمام لوگ وقتی طور پر ہر طرح کی قربانیاں دے کر دو بستیوں کو آپس میں جوڑنے کے لیے پل تعمیر کرنے میں بالآخر کامیاب ہو جاتے ہیں۔ جس پر جشن منایا جاتا ہے اور ڈراما اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ اس ضمن میں ڈرامے سے یہ اقتباس دیکھیں۔

''لوگ لگاتار کئی مہینے محنت کرتے ہیں۔ دن رات وہ سب لوگ ایک کرتے ہیں۔ آخر ایک دن پل بن جاتا ہے۔ بس وہ سب کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں پھر وہاں پر ڈھول بجنا شروع ہوتا ہے اور لوگ آگ جلا کر ناچنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہاں پر ہولی کا تہوار منایا جاتا ہے۔''۳۵

دراصل اس ڈرامے میں آنند لہر نے دریا اور پل کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ دریا استعارہ ہے دونوں ملکوں کے درمیان قائم کی گئی سرحد کا، بالخصوص ہندستان اور پاکستان کے درمیان سرحد کا۔ اور دریا کی وجہ سے ہونے والے نقصانات وحادثات وہ ہیں جو سرحد کے قریب رہنے والے لوگوں کو سرحدوں کی وجہ سے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ پل ایک علامت ہے دو ملکوں کو آپس میں جوڑنے کی۔ دونوں ملکوں کے عوام چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سرحدی کشیدگی ختم کی جائے۔ ڈرامے کا اختتام آنند لہر نے بڑے خوبصورت انداز میں یوں کیا ہے۔

''ایک شخص دوڑتا ہوا آتا ہے

شخص ایک۔ ارے رک جاؤ۔ میں کہتا ہوں رک جاؤ۔ مت ناچو۔

عورت۔ کیوں

شخص ا۔ کیونکہ دریا نے راستہ بدل لیا ہے۔'' ۳۶

لوگ طرح طرح کے حادثات کا شکار ہونے کے بعد اپنی جان و مال کی قربانی دے کر پل تعمیر کرتے ہیں اور ابھی جشن منانے میں مصروف ہوتے ہیں کہ دریا اپنا راستہ بدل لیتا ہے اور یوں ان کی تمنائیں، امنگیں اور خواہشیں پھر سے ادھوری رہ جاتی ہیں۔ یہاں ڈرامہ نگار نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ عوام سرحدوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں ان کے خاتمے کی تدبیریں سوچتے ہیں، ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ہر بار کوئی نئی مصیبت درپیش آجاتی ہے جس کی وجہ سے ان کی تمنائیں اور آرزوئیں ادھوری رہ جاتی ہیں۔

ڈراما ''پل'' کا موضوع اگرچہ کوئی نیا موضوع نہیں ہے تاہم لہر نے اس موضوع کو بڑی خوبصورتی سے خوبصورت مکالموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ ایک غلطی ڈرامے میں کوفت کا باعث بنتی ہے کہ ڈرامے کے مرکزی کردار گوپی اور نرمل کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیا ہے۔ ڈرامے میں الگ الگ جگہوں پر ان کی جنس تبدیل کی گئی ہے کہیں پر دونوں کو مونث دکھایا گیا ہے جبکہ بعض مقامات پر گوپی کو مونث اور نرمل کو مذکر بتایا گیا ہے۔ جبکہ بعض پر اس کے الٹ دکھایا گیا ہے۔ جو قاری کے لیے پریشانی کا سبب بنتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈرامے سے یہ چند مکالمے ملاحظہ کیجیے جن سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔

نرمل۔ (زور سے آواز لگا کر) ہاں ۔۔۔۔ بولو کیا کہنا چاہتی ہو؟

گوپی۔ آج اسکول نہیں گئی۔ ۳۷

مندرجہ بالا مکالمے سے ظاہر ہوتا ہے کہ نرمل اور گوپی مونث کردار ہیں جبکہ دوسرے مقام پر یہ مکالمے ملاحظہ کیجیے جس میں گوپی کا کردار مذکر دکھایا گیا ہے۔

''گوپی۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں نرمل آخر مجھے بھی کیا ہو گیا تھا۔'' ۳۸

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر گوپی کو مونث اور نرمل کو مذکر دکھایا گیا ہے۔

''میلا چل رہا ہے۔کہیں کبڈی ہورہی ہے۔کہیں دوسرے کھیل۔نرمل
جگہ جگہ گھوم رہا ہے اور لگا تار میلے پر نظر جما کر بیٹھا ہے۔دور سے ایک
گانے کی آواز آتی ہے۔گوپی سپیروں کی بستی میں کھڑی ہے۔''۳۹

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ ان کرداروں کو برتنے میں ڈراما نگار سے چونک ضرور ہوئی ہے تاہم اس کا یہ مقصد ہر گز نہیں ہوسکتا کہ آنند لہر کو ان رموز سے آشنائی نہ تھی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ لہر نے عجلت میں کام انجام دیا ہو۔جس کی وجہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہو۔اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ان کی زندگی بڑی مصروف تھی۔ایک نامور وکیل ہونے کے ناطے ان کی مصروفیات سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔بہرحال مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو آنند لہر ایک اچھا ڈراما پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

زیر بحث مجموعے میں شامل تیسرا ڈرامہ ''زندگی'' کے عنوان سے ہے۔جس میں ہریش اور دھرم چند دو بڑے کردار ہیں۔جن کے سہارے کہانی آگے بڑھتی ہے۔دراصل اس ڈرامے میں لہر نے انسانی رشتوں کی اہمیت اوران کے تقدس کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ہریش اور دھرم چند مرکزی کردار ہیں۔

ہریش جو کہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز ہے اور ہریش اسی کے دفتر میں چپراسی کا کام کرتا ہے۔دیگر ضمنی کرداروں میں سدھا،ٹنکو،کمو،پدما،کملا،حمید،گلشن،گوپی،شیلا،گل ،شیر اور نلنی ہیں۔آنند لہر نے دو کرداروں کو موضوع بنا کر ان کا نفسیاتی مطالعہ کر کے سماج میں بسنے والے دو الگ الگ طبقوں کی زندگی کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔آنند لہر نے زیر نظر ڈرامے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ رشتوں کی اہمیت کیا ہے نیز کس طرح رشتوں کے تقدس کو برقرار رکھا جاتا ہے اور ایک خوشگوار زندگی کیسے گزاری جاسکتی ہے۔سریش ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو رشتوں کی اہمیت نہیں جانتے۔ان کے نزدیک رشتے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔وہ رشتوں کو دولت اور شہرت کے توازن میں تولنا چاہتے ہیں۔جس کی بدولت رسوائی اور بے چینی کا شکار ہوتے ہیں۔

ڈرامے کا کردار ہریش جو کہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز ضرور ہوتا ہے لیکن ایک بداخلاق،بدتمیز اور دولت وشہرت کا بھوکا انسان ہونے کی وجہ سے پرسکون زندگی نہیں گزار سکتا۔اسے ہر طرف سے رسوائی وذلت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔عہدہ اور دولت ہونے کے باوجود سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ہریش بدتمیز ہونے کے ساتھ ساتھ بے جرأت انسان بھی ہے۔جو اپنے ماتحتوں سے برا سلوک کرتا ہے،انہیں ڈانٹتا ہے،ہر وقت ان کی بے عزتی کرتا

ہے۔جس کو آنند لہر نے ڈرامے میں یوں پیش کیا ہے۔

''ہریش۔ اچھا سیدھا کھڑا ہو جا۔

دھرم چند۔ جناب میں بالکل سیدھا کھڑا ہوں۔

ہریش۔ جا اب جلدی جا۔

دھرم چند۔ ٹھیک ہے حضور۔

ہریش۔ جا دفع ہو جا۔(دروازہ بند ہونے کی آواز آتی ہے۔)''[۴۰]

ایک غیر مہذب، بد اخلاق، بدتمیز اور اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھانے والے افسر کا کردار مندرجہ بالا مکالموں سے واضح ہو جاتا ہے۔اپنے ماتحت کام کرنے والے ملازموں کے ساتھ بے رحمی اور قطع تعلقی سے پیش آتا ہے لیکن اپنی بے غیرتی اور بے جرأتی کی وجہ سے اپنے سے بڑے عہدے والوں کا غلام بن کر رہتا ہے۔اپنے ایک افسر کی بیوی کی سہیلی کے سامنے کس طرح جھکتا ہے ان مکالموں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

''آواز۔ میں ڈویژنل کمشنر کی بیوی کی سہیلی بول رہی ہوں۔

ہریش۔ بولئے۔بولئے میڈم خادم حاضر ہے کھڑا ہو گیا ہے۔''[۴۱]

یہاں آنند لہر نے ایک آفیسر کے عہدے اور اپنے ماتحت ملازموں کے ساتھ اس کے رویے کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی واضح کی ہے کہ بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے بعد لوگوں کے دلوں میں احساس اور ہمدردی باقی نہیں رہتی۔ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں جبکہ خود ان کی اپنے خاندان میں کوئی عزت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ رشتوں کے تقدس کو بھول جاتے ہیں۔دولت و شہرت کی تگ و دو میں رہتے ہیں لیکن بعد میں بے چینی اور رسوائی کے سوا ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔رشتوں ناطوں کے لئے عام انسان کے بجائے بڑے لوگوں کو ترجیح دیتے ہیں۔جس سے ان کی اپنی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔یہی مسئلہ ہریش کا بھی ہے۔جو ایک بڑے خاندان کی عورت سدھا سے شادی کرتا ہے۔سدھا ایک ماڈرن عورت ہے۔جسے خاوند کو عزت دینا اس کی فرماں برداری کرنا بالکل نہیں آتا۔اسے دولت پر غرور ہے اور اپنے ماں باپ کے عہدے کی وجہ سے پتی کو نیچا دکھاتی ہے۔سدھا گفتگو کے آداب سے بالکل نابلد ہے۔ڈرامے سے یہ مکالمے پیش خدمت ہیں۔

''سدھا۔ آج کلب میں کتوں کی پارٹی ہے اور مجھے ضرور جانا ہے۔

ہریش۔ میں چاہتا تھا۔

سدھا۔ ناٹی بوائے میں جو کہتی ہوں وہی کریں۔

ہریش۔ مگر کیوں۔

سدھا۔جہنم میں گئے تم اور پھر ایک بات اچھی طرح سن لو میرے ماں

باپ نے تمہارے جیسے کئی آفیسر لگائے ہیں۔''۴۲؎

بیوی کے ساتھ ساتھ ہریش کا لڑکا بھی اس کی عزت نہیں کرتا اورنہایت بدتمیزی سے پیش آتا ہے۔ ہریش کی اپنے گھر میں پھوٹی کوڑی کے برابر عزت نہیں رہتی۔جس کی وجہ سے وہ بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔اس کا لڑکا ٹنکو اس سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے۔

''ٹنکو۔ مجھے ابھی اس وقت دس ہزار روپے چاہیے۔

ہریش۔ مگر

ٹنکو۔ اگر مگر کیا لگا رکھی ہے میں نے تجھ سے مانگے

سدھا۔ یہ اس کمینے خاندان کے ہیں جہاں دس ہزار روپے ایک بہت

بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔''۴۳؎

بڑے لوگوں کے گھروں میں انسان سے زیادہ پیسوں کی قدر ہوتی ہے۔جس کی وجہ سے وہ رشتوں کی اہمیت کو بھول جاتے ہیں۔دولت،شہرت اور پیسہ ہونے کے باوجود سکون حاصل نہیں کر پاتے۔کیونکہ سکون اورعزت پیسوں سے خریدی نہیں جاسکتی۔

اس کے برعکس دوسرا کردار دھرم پال کا ہے جو چپراسی ہے لیکن ایک سلجھا ہوا با اخلاق،ملنسار اور حساس انسان ہے۔دولت سے زیادہ رشتوں کو اہمیت دیتا ہے۔اپنے چھوٹے سے گھر اور معمولی آمدنی سے چین وسکون کی زندگی گزارتا ہے۔اس معمولی عہدے پر اس کے ماں باپ، بیوی، بچوں کو ناز ہے اور وہ دھرم پال کی عزت کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے عہدے کی بھی عزت کرتے ہیں۔کیونکہ یہی ان کی روزی روٹی کا ذریعہ ہے۔دھرم پال اپنے مہذب خاندان میں محدود خواہشات کے ساتھ دولت وشہرت سے بے نیاز چین وسکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔گھر کے تمام افراد ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔جو حاصل ہے اسی پر صبر وشکر کر کے خوشحال زندگی گزارتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو آنند لہر نے انسانی زندگی کے اہم موضوع کو پیش کر کے انسان کو اپنی حقیقت سے آشنا کرانے کی کوشش کی ہے۔ نیز آج کی مغربی تہذیب پر طنز کرتے ہوئے اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے کا پیغام دیا ہے۔آج کے دور میں انسان دولت وشہرت کی تلاش میں رشتوں کا تقدس بھولتا جا رہا ہے۔اپنی تہذیب سے نا آشنا ہوتا جا رہا ہے۔زیرِنظر ڈرامہ سماجی اصلاح کے لیے عمدہ شاہکار ہے۔

**پلاٹ**

ڈرامے میں واقعات کی عملی پیشکش ہوتی ہے۔ان کا باہمی اور بامعنی رابطہ پلاٹ کہلاتا ہے۔کسی بھی قصے میں پیش آنے والے واقعات کی زمانی ترتیب اوران واقیات کے درمیان رابطہ وتعلق پلاٹ کہلاتا ہے۔ پلاٹ میں واقعات کے اسباب وعلل کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے واقعات کے سلسلے کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔اچھے پلاٹ کی خصوصیت ہوتی ہے کہ اس میں واقعات کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ واقعات فطری انداز میں آگے بڑھیں اوران سے دلچسپی میں اضافہ ہو۔ڈرامے میں داستان اور ناول کے بجائے وقت کم ہوتا ہے۔اس لئے ڈرامے کے پلاٹ کے لیے ضروری ہے کہ ایجاز واختصار پر خصوصی توجہ دی جائے۔

جہاں تک آنند لہر کے ڈراموں میں پلاٹ کا تعلق ہے تو بعض ایسے ڈرامے ہیں جن میں آنند لہر نے پلاٹ کی ترتیب وتنظیم میں بڑی مہارت سے کام لیا ہے جبکہ دیگر ڈراموں میں بھی انہوں نے واقعات کی ترتیب کا خیال رکھا ہے لیکن اس طرح کا نہیں جیسا کہ بڑے ڈراما نگار کے ہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔آنند لہر بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے لیکن انہوں نے کچھ مسائل کو ابھارنے کے لئے اردو ڈرامے کا سہارا بھی لیا ہے۔بعض موضوعات ایسے ہیں جن کو اجاگر کرنے کے لیے انہوں نے ایک ہی خیال کو ایک ہی کہانی کے ذریعے ناول، افسانہ اور ڈرامہ تینوں میں پیش کیا ہے۔ان کے کردار بھی لگ بھگ ایک ہی جیسے ہیں۔جیسا کہ ناول ’’سرحدوں کے بیچ‘‘ ہو یا افسانہ ’’سرحد کے اس پار‘‘ یا پھر ڈرامہ ’’سرحدیں‘‘ ان تینوں کی کہانی اور لگ بھگ کردار بھی ایک جیسے ہیں۔ایک کو پڑھنے کے بعد جب دوسری تصنیف انسان پڑھتا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ یہ کہانی ہو بہو پڑھی جا چکی ہے۔ان کا پہلا ڈرامائی مجموعہ ’’نران‘‘ ہے۔جس میں انہوں نے مختلف سماجی مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے چھ مختلف ڈرامے لکھے ہیں۔ان میں اگرچہ چھوٹے چھوٹے واقعات کی ترتیب اور باہمی ربط کا خیال رکھا گیا ہے تاہم پلاٹ کے لیے بعض مشاہیران ادب نے جو لوازمات بتائے ہیں ان پر یہ ڈرامے کھرے نہیں اترتے۔ان مختصر ڈراموں میں افسانے جیسا پلاٹ

دکھائی ضرور دیتا ہے تاہم فن ڈرامہ نگاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے نقطہ عروج وزوال، انجام وغیرہ جیسی چیزیں خال خال ہی ملتی ہیں۔

نروان کے بعد ڈرامائی ادب میں ان کی دوسری تخلیق ڈرامہ ''تپسوی کون'' ہے۔ یہ ایک مکمل ڈرامہ ہے۔ جو اسٹیج کے لوازم مہیا کرنے میں ایک اچھی کوشش ہے۔اس ڈرامے میں لہر نے واقعات کو منطقی ترتیب اور تسلسل سے پیش کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ قصے میں کشمکش اور تصادم پیدا کرنے نیز آغاز اور انجام اچھے طریقے سے دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس ڈرامے کا پلاٹ مربوط ہے۔ تمام تر واقعات کو فطری انداز میں پیش کرتے ہوئے آنند لہر نے فنی مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

''سرحدیں'' ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے ،ریڈیائی ڈراموں کے چونکہ تقاضے اپنے ہوتے ہیں۔ یہاں عمل کے بجائے ریڈیو پر ڈراموں کو بیان کیا جاتا ہے۔ یہاں اسٹیج کرداروں کی حرکات وسکنات اور رنگ و روشنی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ ''سرحدیں'' میں آنند لہر نے تین مختصر ڈراموں میں مختلف واقعات کو ربط و تسلسل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

## کردارنگاری

ڈرامے کا تعلق چونکہ عمل سے ہے اور عمل کرداروں کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ لہذا کردار ڈرامے کا لازمی جز ہیں۔ ڈرامے میں پیش کیے جانے والے واقعات کی عملی انجام دہی کے لیے کرداروں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کردار سماج کے مختلف طبقات کی عکاسی کرتے ہیں۔ لہذا ان کی پیشکش میں ان کے سماجی پس منظر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ جہاں تک آنند لہر کے ڈراموں میں کرداروں کا سوال ہے تو آنند لہر نے مختلف سماجی طبقات سے کرداروں کا انتخاب کر کے ان کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے ڈراموں کے تمام تر کردار فطری معلوم ہوتے ہیں۔ لہر کرداروں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔ مختلف طرح کے کرداروں کی پیشکش میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ڈرامہ ''تیاگ'' میں ایک کردار سادھو کا ہے۔ جو ایک مذہبی رہنما کا کردار ہے۔ یہ کردار انسان کے دوغلے پن کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ سادھو لوگوں کو پاپ سے بچنے کا درس دیتا ہے اور لوگوں کے پاپ اسے دکھائی بھی دیتے ہیں لیکن وہ خود ان گناہوں میں ملوث ہوتا ہے اور اسے اپنے گناہوں کا احساس نہیں ہوتا۔ اس کردار کو آنند لہر نے برے کردار کے طور پر استعمال کیا ہے۔

''نروان'' کے تمام ڈراموں میں آنند لہر نے کرداروں کے نام استعمال نہیں کئے بلکہ ناموں کے بجائے کردار، دوسرا کردار، تیسرا کردار، آواز، دوسری آواز، تیسری آواز، عورت، مرد اور مجمع باز وغیرہ جیسے ناموں سے پکارا ہے۔جن کی باہمی گفتگو کے ذریعے کہانی آگے بڑھتی ہے۔ یہ تمام کردار آپس میں محو گفتگو بتائے گئے ہیں۔ڈراما ''تپسوی کون'' میں لہر نے کردار نگاری کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔اس ڈرامے کے تمام کردار مختلف سماجی طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں۔تمام تر کردار فطری معلوم ہوتے ہیں۔

اس ڈرامے کا ایک کردار'' ساما'' ہے۔جو ایک ظالم اور جابر افسر کا کردار ہے۔رشوت لیتا ہے اور اپنے ماتحتوں سے برا سلوک کرتا ہے۔ ڈرامے میں شروع سے آخر تک اس کے رویے میں کوئی تبدیلی دیکھنے کو نہیں ملتی۔دیگر کرداروں میں شنکر، شیو اور دھرم پال کے کردار اہم ہیں۔شنکر ایک ایسا کردار ہے جو محکمہ پولیس کا ملازم ہونے کے باوجود رشوت نہیں لیتا لیکن اپنے بچوں اور بیوی کے حقوق ادا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ان کی بہتری کے لیے کوئی بھی تدبیر نہیں سوچتا۔ڈرامے میں شروع سے آخر تک بالکل جامد نظر آتا ہے۔اپنی بہتری کے لیے کوئی کوشش کرتا نظر نہیں آتا۔یہاں تک کہ جب اس کا بیٹا سریش ہسپتال میں بیماری سے لاچار و بے بس ہو جاتا ہے اس کے علاج کے لئے کوئی کوشش کرتا نظر نہیں آتا۔وقت اور حالات کے ساتھ بدلنے کا ہنر اسے بالکل نہیں آتا جو ایک اچھے کردار کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ ایک بے جان کردار ہے جو ڈرامے میں شروع سے آخر تک بالکل جامد نظر آتا ہے۔جبکہ'' شو'' کا کردار ایک متحرک کردار ہے۔جو وقت کے ساتھ اپنے آپ کو تبدیل کرنا جانتا ہے۔کسی بھی پریشانی یا مصیبت کے آنے پر اس کا حل تلاش کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ برے وقت میں غریبوں اور بے سہاروں کا سہارا بنتا ہے۔وقت اور حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنا جانتا ہے۔اس کے علاوہ اس ڈرامے کا ایک اور اہم کردار'' ناگپال'' ہے۔جو رشوت خوری، بے ایمانی، شراب نوشی اور بداخلاقی کے لئے مشہور ہے۔خوب رشوت لیتا ہے اور رشوت کے پیسوں سے جوا کھیلتا ہے اور شراب پیتا ہے۔اپنی بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا اور اس کے ساتھ برے سلوک سے پیش آتا ہے۔اپنی ان بری خصلتوں کی وجہ سے وہ دن بدن بد سے بدتر ہوتا جاتا ہے۔بالآخر نشے کی حالت میں وہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔جب شراب خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے باقی نہیں رہتے تو وہ اپنی بیوی کے پاؤں پکڑ لیتا ہے کہ اسے کہیں سے شراب لا کر دے۔جس کے لئے اس کی بیوی بے بس و مجبور ہو کر اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہے۔ڈرامے سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں ناگپال کی بے بسی کو دکھایا گیا ہے۔

''ناگپال۔ شانتی

شانتی۔ بولئے راجہ جی۔

ناگپال۔ پیٹ میں سخت درد ہے۔ پیسے ختم ہوگئے ہیں۔تنخواہ کو ابھی پندرہ دن باقی ہیں۔اگر شراب نہ پیوں گا تو مرجاؤں گا۔

شانتی۔ مگر میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔صبح سے بھوکی بیٹھی ہوں۔

ناگپال۔ (شانتی کے پیر پکڑ کر) کچھ کرو شام تھی کچھ کرو۔ورنہ میں مر جاؤں گا۔

(ناگپال یہ کہہ کر رونا شروع کردیتا ہے۔شانتی چاروں طرف دیکھتی ہے سامنے اپنے گھر کے دروازے کے باہر مہادیوا اپنے ہاتھ میں پچاس کا نوٹ اپنے ہاتھ میں لئے کھڑا ہے۔''۴۴

''تپسوی کون'' میں شانتی اور سریتا دو زنانہ کردار ہیں۔ جو فرماں بردار، صابر اور وفا شعار بیوی کی نمائندگی کرتے ہیں۔خاوند کے ظلم وعتاب، بے رخی اور حقوق تلفی کے باوجود ان کی ضروریات کا خیال رکھتی ہیں اور ان سے محبت کرتی ہیں۔شانتی اپنے بے بس اور شرابی پتی ناگپال کے لیے شراب خریدنے کے لئے اپنا جسم بیچنے پر مجبور ہوتی ہے۔وہیں دوسری طرف سریتا اس لیے کھانا نہیں کھاتی کیونکہ اس کے خاوند نے بچے سے ناراضگی کی وجہ سے کھانا نہیں کھایا۔مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو ''تپسوی کون'' میں آنند لہر نے کرداروں کے انتخاب اور پیشکش میں فنی مہارت دکھائی ہے۔اس کے علاوہ جہاں تک ڈرامائی مجموعے ''سرحدیں'' میں کردار نگاری کا تعلق ہے تو آنند لہر نے اس مجموعے میں شامل تین مختصر ڈراموں میں حالات و واقعات کے پیش نظر چھوٹے بڑے کئی کرداروں کا استعمال کیا ہے۔اس مجموعہ میں شامل سبھی ڈراموں میں ڈراما نگار نے کرداروں کا تعارف شروع میں پیش کیا ہے۔ڈراما'' سرحدیں'' کے مرکزی کردار موہن اور پیٹر ہیں جو دو الگ ملکوں کے سپاہیوں کی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پیٹر ایک حساس دل انسان ہے۔ جو رشتوں ناطوں کی قدر جانتا ہے اور امن وسکون چاہتا ہے۔لیکن چونکہ سپاہی ہے اور مرضی کے مطابق نہیں بلکہ حکم کے مطابق زندگی جینی پڑتی ہے اس لیے جنگ کے مقام پر حکم ملنے پر اپنی بیوی کو چھوڑ کر

جنگ میں چلا جاتا ہے اور سہاگ رات منانے کا حسین خواب دل میں لیے زندگی کی جنگ ہار جاتا ہے۔ پیٹر کا کردار ایک وفادار اور بہادر سپاہی کا کردار ہے جو وطن کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ جبکہ موہن دوسرے ملک کا سپاہی ہے جو اپنی بیوی سے یہ وعدہ کر کے جنگ میں جاتا ہے کہ وہ جنگ جیت کر اس کے لیے تحفے لائے گا۔ لیکن جب واپس آتا ہے تو اس کی پوٹلی سے انسان کی ہڈیاں اور دشمن ملک کے خاکے نکلتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر اس کی بیوی بھاگ جاتی ہے۔ سریتا اور میری اس ڈرامے میں شامل دو فراق زدہ عورتوں کے کردار ہیں۔ جو جنگ نہیں بلکہ امن و سکون چاہتی ہیں اور اپنے پتی کا پیار چاہتی ہیں لیکن ایک کا پتی جنگ کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ دوسری کی جوانی فراق میں بیت جاتی ہے۔ سریتا ایک رحم دل عورت کا کردار ہے۔ جو اپنے پتی کو رحم کرنے اور محبت و بھائی چارے کا پیغام دیتی ہے اور جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کے پتی نے سپاہیوں کا قتل کیا ہے تو وہ اسے چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔

ڈرامہ ''پل'' میں گوپی اور نرمل بڑے کردار ہیں۔ جن کے ارد گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ ان کے علاوہ کئی چھوٹے چھوٹے کردار ہیں جو مختصر وقت کے لئے ڈرامے میں نمودار ہوتے ہیں اور اپنا اپنا فرض انجام دے کر غائب ہو جاتے ہیں۔ گوپی ایک خوبصورت کردار ہے جو نرمل سے پیار کرتا ہے اور پیار میں ایثار و قربانی کا جذبہ رکھتا ہے۔ کئی مشکلات در پیش آنے کے باوجود وہ نرمل کے ساتھ کھڑا رہنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ دریا میں طغیانی آنے کے باوجود وہ جان کی پرواہ کیے بغیر نرمل سے ملنے چلا جاتا ہے۔ گوپی حالات کا مقابلہ کرنا جانتا ہے۔ حالات کے ساتھ بدلنا جانتا ہے بلکہ حالات کے سامنے جھکنا نہیں۔ گوپی کا کردار ایک متحرک کردار ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ نرمل کا کردار بھی ایک متحرک کردار ہے۔ لیکن گوپی اور نرمل کے کردار کو برتنے میں ایک غلطی ڈرامہ نگار سے ضرور ہوئی ہے وہ یہ کہ ان دونوں کرداروں کو آپس میں خلط ملط کر دیا ہے۔ جس سے ان کی جنس کی تخصیص نہیں ہو سکتی۔ ڈرامے میں الگ الگ مقامات پر دونوں کی جنس تبدیل کر دی گئی ہے۔ کہیں گوپی کو مرد اور نرمل کو عورت اور کہیں نرمل کو مرد اور گوپی کو عورت دکھایا گیا ہے۔ جبکہ ایک دو مقامات پر دونوں کو عورت کے کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ جو قاری کے لئے الجھن کا باعث بنتا ہے۔

''زندگی'' آنند لہر کا آخری ڈرامہ ہے۔ جس میں مختلف سماجی واقعات کو پیش کرنے کی غرض سے آنند لہر نے ہریش، دھرم چند، کملا، حمید، شرما، گلشن، گوپی، سدھا اور ٹنکو وغیرہ جیسے کرداروں کا استعمال کیا ہے۔ ہریش اور دھرم چند بڑے کردار ہیں۔ ہریش جو کہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز ہوتا ہے۔ نہایت بدتمیز، بداخلاق اور ظالم انسان کا

کردار ہے۔طاقت کا بے جا استعمال کرتا ہے۔اپنے ماتحت کام کرنے والے ملازموں کے ساتھ غلط سلوک کرتا ہے۔آنند لہر نے اس کردار کا نفسیاتی پہلو پیش کیا ہے۔زبان بھی بالکل اس کے رویے،اخلاق اور عادات کے مطابق استعمال کی ہے۔ہریش کا کردار ان لوگوں کی نمائندگی کرتا ہے جو عہدہ ،شہرت اور دولت ہونے کے باوجود سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔کیونکہ وہ رشتوں کے بجائے دولت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ہریش کے کردار کو لہر نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ برتا ہے۔اس کے افعال کے مطابق زبان کا بھی استعمال کیا ہے۔مثال کے طور پر ہریش کے یہ چند مکالمے ڈرامے سے ملاحظہ کیجیے۔

''ہریش۔ اچھا جا اب جلدی جا۔

دھرم چند۔ ٹھیک ہے حضور

ہریش۔جا دفع ہو جا۔(دروازہ بند ہونے کی آواز آتی ہے۔)''۴۵؎

اس ڈرامے میں ایک اور کردار ''ٹنکو'' کا ہے۔جو ایک نافرمان اور بدتمیز بیٹے کا کردار ہے۔جسے اپنے باپ کی عزت و آبرو اور رشتے کی اہمیت کی کوئی قدر نہیں۔اپنے باپ سے نازیبا الفاظ میں گفتگو کرتا ہے۔ٹنکو کا کردار ماڈرن دور کی اولاد کی ترجمانی کرتا ہے۔جو عیش وعشرت کے پجاری ہیں۔رشتوں کی اہمیت نہیں جانتے۔یہ مکالمے دیکھیے۔جن میں ٹنکو کو اپنے باپ ہریش سے محو گفتگو دکھایا گیا ہے۔

''ٹنکو۔ مجھے ابھی اس وقت دس ہزار روپے چاہیے۔

ہریش۔ مگر

ٹنکو۔ اگر مگر کیا لگا رکھی ہے میں نے تجھ سے مانگے

سدھا۔ یہ اس کمینے خاندان کے ہیں جہاں دس ہزار روپے ایک بہت

بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔''۴۶؎

ٹنکو کا کردار مغربی تہذیب اور دور حاضر کی اولاد کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔آج کے دور میں لوگ رشتوں سے زیادہ مال و دولت اور عہدے کو اہمیت دیتے ہیں۔رشتوں کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔بچے ماں باپ کی قدر نہیں کرتے۔اسی مناسبت سے آنند لہر نے ٹنکو کا کردار استعمال کیا ہے اور اس کے لئے آنند لہر نے کرداروں کے نام بھی جدید دور اور مغربی تہذیب کے مطابق رکھے ہیں۔جیسے ٹنکو، کمو اور رنکی وغیرہ۔مجموعی طور سے دیکھا جائے تو آنند

لہر اپنے ڈراموں میں بہترین کردار پیش کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔کردار نگاری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ گفتگوان کے حسب حال ہو۔آنند لہر نے ڈراموں میں اس چیز کا خاص خیال رکھا ہے۔جو کردار مذہبی رہنما کے طور پر استعمال کیے ہیں ان کے مکالمے نہایت سنجیدہ اور سلجھے ہوئے ہیں۔جبکہ دوسرے کرداروں کے لئے اسی طرح کی زبان استعمال کی ہے۔جوان کی ذہانت،شخصیت اور کارناموں کے بالکل مطابق ہو۔اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آنند لہر کردار نگاری کے فن سے بخوبی واقف تھے۔

## مکالمہ

مکالمہ ڈرامے کا لازمی جز ہے۔مکالمہ قصے کو آگے بڑھانے اور حرکت و عمل کو قوت بخشتا ہے۔خیالات و جذبات کی ترسیل مکالموں کے ذریعے ہوتی ہے۔جسم کی حرکات وسکنات اور چہرے کے تاثرات کسی حد تک جذبہ و خیال کی ترسیل کر سکتے ہیں لیکن کرداروں کی نفسیات ان کے تہذیبی وسماجی پس منظر، عادات واطوار اور فکر واحساس سے مکالمے ہی واقف کراتے ہیں۔ڈرامے میں موقع ومحل کی مناسبت اور اختصار خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ڈرامے میں زیادہ تر مختصر مکالموں کو اہمیت دی جاتی ہے لیکن بعض اوقات موقع ومحل کی مناسبت سے طویل مکالمے بھی ادا کیے جاتے ہیں۔آنند لہر نے اپنے ڈراموں میں موقع ومحل کی مناسبت سے خوبصورت مکالوں کو پیش کیا ہے۔ان کے ڈراموں میں مکالمے کرداروں کے مزاج اور فطرت کے مطابق ہیں۔جس طرح کا کردار ہو اس سے اسی طرح کے مکالمے ادا کروائے جائیں۔مطلب ایسا نہ ہو کے ایک عالم سے جاہل اور جاہل سے عالم کے مکالمے ادا کروائے جائیں جو ایک عیب ہے۔لہر نے ڈراموں میں ان چیزوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ان کے مکالمے کرداروں کی فطرت کے مطابق ہیں۔جو کہ کرداروں کے خاندانی پس منظر،ان کی تعلیم و تربیت،احساس،ہمدردی اور نفسیات کو بخوبی واضح کرتے ہیں۔

آنند لہر نے زیادہ تر مختصر اور خوبصورت مکالموں کا استعمال کیا ہے۔کہیں پر بھی بے جا طوالت نظر نہیں آتی۔بعض جگہوں پر ضرورت کے مطابق طویل مکالمے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جو کہ نہ کے برابر ہیں۔چند مکالمے بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔

”آواز۔ وعدے تو صدیوں تک ساتھ رہنے کے تھے مگر لمحوں میں بچھڑ گئے۔

آواز۔ منزل کے قریب پہنچ کر لوگوں نے راستے بدل دیے۔

دوسرا بچہ۔ آنکھوں کے اندر خون دیکھنے کی خواہش خون پیدا کرتا ہے۔

تیسرا بچہ۔ ہاتھوں کو پھول مسلنے کے لئے مجبور کون کر رہا ہے۔

آواز۔ جنگ انسان کو وحشت کا سبق پڑھاتی ہے۔

شنکر۔ مگر ایمانداری کی زندگی بھی بہترین زندگی ہے۔

سریش۔ پتا جی آپ کی ایمانداری ہم پر بوجھ بن چکی ہے۔

شنکر۔ چل پرے ہٹ تجھے کھانے کے بدلے زہر ملنا چاہئے۔ چوری کرتا ہے شرم نہیں آتی۔

سریتا۔ مگر میرا جسم سچ ہے۔ اس کے اندر سلگتی ہوئی جوانی کی آگ سچ ہے۔

پٹیل۔ دوست جھوٹ کے ذریعے خوبصورت زندگی کٹ رہی تھی۔

موہن۔ سپاہی بننے کے بعد انسان انسان نہیں رہتا۔

ہریش۔ بولیے، بولیے میڈم۔ خادم حاضر ہے کھڑا ہو گیا ہے۔

سدھا۔ جہنم میں گئے تم اور ایک بات اچھی طرح سن لو میرے ماں باپ نے تمہارے جیسے کئی آفیسر لگائے ہیں۔

کمو۔ کیونکہ مجھے راستے میں بوائے فرینڈ کو بھی لینا ہے۔

مندرجہ بالا مکالمات پڑھ کر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آنند لہر مکالمہ نگاری کے فن پر بھی دسترس رکھتے تھے اور انہوں نے ڈراموں میں موقع و محل کی مناسبت سے مختلف کرداروں سے خوبصورت مکالمے ادا کروا کے مکالمہ نگاری کا حق ادا کیا ہے۔

## تصادم اور کشمکش

کشمکش ڈرامے کا لازمی جز ہے۔ قصے میں دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے کہانی میں کشمکش کا ہونا ضروری ہے۔ حالات کے مختلف پہلوؤں میں کشمکش ظاہر کر کے ڈراما نگار کہانی میں دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ کبھی کبھی حالات میں

پیچیدگی پیدا کر کے ڈرامہ نگار ناظرین وقارئین کو خود ان کا حل تلاش کرنے کے لئے اکساتا ہے اور وہ اپنے طور پر ان کا حل تلاش کر لیتے ہیں۔لیکن جب نتیجہ ناظرین کی توقعات کی مطابق نکلتا ہے تو انہیں نہ صرف خوشگوار حیرت ہوتی ہے بلکہ وہ ڈرامے کے تخلیقی عمل میں اپنے آپ کو شریک سمجھ کر ایک ذہنی مسرت اور اطمینان حاصل کرتے ہیں۔آنند لہر نے ڈراموں میں مختلف حالات کے مابین تصادم اور کشمکش پیدا کر کے ناظرین کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔انہوں نے مختلف ڈراموں میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور طبقاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔پہلے ڈرامے تیاگ میں دو طبقوں کے درمیان کشمکش دکھائی ہے۔ایک جو اپنے آپ کو پرہیز گار، متقی اور نیک سمجھتے ہیں اور دوسروں کو پاپی و بدکار سمجھ کر ان سے نفرت کرتے ہیں، لیکن تپسیا میں مشغول بھی رہتے ہیں۔دوسرے جو کہ تپسیا کم کرتے ہیں لیکن ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے کام آتے ہیں اور بالآخر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو محبت کرتے ہیں وہ کامیاب ہوتے ہیں اور جو صرف تپسیا کر کے نیک بننا چاہتے ہیں وہ رسوا ہو جاتے ہیں۔اور نتیجہ ناظرین کے توقعات کے برعکس نکلتا ہے۔

اسی طرح ڈراما ''کھیل'' میں انسانی زندگی کی کشمکش کو پیش کیا گیا ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی ایک کھیل ہے۔انسان کو یہ معلوم ہونے کے باوجود کے اس کی زندگی عارضی ہے وہ ہر لمحہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔یہاں ہر کوئی ایک دوسرے کو دھوکہ دیتا ہے۔کوئی کسی کا نہیں اور یہ دنیا ایک کھیل ہے۔یہاں ہر کوئی یہ کھیل اپنے طریقے سے کھیلتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ڈرامہ سپاہی کی واپسی میں دو سپاہیوں کی زندگی دکھائی گئی ہے جو دو ملکوں کے ہیں۔ایک اپنی بیوی کو خالی پوٹلی دکھا کر جنگ میں چلا جاتا ہے اور یہ دعا کرتا ہے کہ واپسی پر اس کے لیے تحفے لائے گا۔خالی پوٹلی پورے ڈرامے میں ناظرین کے لیے دلچسپی کا باعث بنی رہتی ہے۔جبکہ دوسرا شادی کے فوراً بعد سہاگ رات سے پہلے جنگ میں چلا جاتا ہے اور اپنی بیوی سے وعدہ کرتا ہے کہ جلد لوٹ کر سہاگ رات کے حسین سپنے پورے کرے گا۔یہ دونوں ڈرامے میں ناظرین کی دلچسپی بنائے رکھتے ہیں۔لیکن ڈرامے کا انجام بالکل برعکس ہوتا ہے۔پہلا جنگ میں مارا جاتا ہے اور دوسرا جنگ سے لوٹنے پر پوٹلی میں تحفے کے بجائے دشمن ملک کے فوجیوں کی ہڈیاں اور خاک لاتا ہے۔

ڈرامہ ''تپسوی کون'' میں دو بھائیوں کے درمیان کشمکش دکھائی گئی ہے۔ایک رشوت نہیں لیتا جبکہ دوسرا خوب رشوت لیتا ہے۔جہاں شنکر رشوت نہ لے کر اپنے آپ کو پرہیز گار، متقی تسلیم کرتا ہے اور جنت میں جانے کا متمنی ہے

لیکن دنیاوی زندگی اچھی طرح سے گزارنے اور بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہیں دوسری طرف شورشوت ضرور لیتا ہے لیکن ہر کسی کے کام آتا ہے، دوسروں کے تئیں احساس وہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے اور اپنی بیوی بچوں کے حقوق اچھی طرح سے ادا کرتا ہے۔ دنیاوی زندگی عیش وعشرت سے گزارتا ہے۔ پورے ڈرامے میں ان دونوں کے مابین کشمکش دکھائی گئی ہے کہ ان میں سے اصل تپسوی کون ہے۔

ڈرامہ ''پل'' میں دوملکوں کے درمیان تصادم کو دکھایا گیا ہے۔ جس کے عوام ایک دوسرے سے تعلقات استوار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سیاسی رسہ کشی کی وجہ سے وہ آپسی تعلقات بہتر نہیں بنا سکتے۔ دونوں ملکوں کو آپس میں جوڑنے کے لئے پل بنایا جاتا ہے۔ جو دونوں ملکوں کو آپس میں جوڑنے کا ایک استعارہ ہے۔ دونوں ملکوں کے عوام کے درمیان ایک دوسرے سے جڑنے کی کشمکش جاری رہتی ہے اور وہ پل تعمیر کر کے اس مقصد کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر جب پل کی تعمیر مکمل ہوتی ہے تو دریا اپنا راستہ بدل لیتا ہے۔ اسی طرح آخری ڈراما ''زندگی'' میں انہوں نے طبقاتی کشمکش کو پیش کیا ہے۔ اس میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقہ کے مابین کشمکش کو پیش کرتے ہوئے رشتوں کی اہمیت کو دکھایا گیا ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھنے والے لوگ کس طرح مال ودولت اور شہرت ہونے کے باوجود زندگی میں رسوائی و بے چینی کا شکار ہوتے ہیں۔ جبکہ معمولی مال ودولت اور محدود خواہشات کے ساتھ لوگ پرسکون زندگی کی خوبصورت بہاریں دیکھتے ہیں۔ تمام تر ڈراموں میں آنند لہر نے مختلف حالات کے درمیان خوبصورت کشمکش پیدا کر کے ناظرین کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ جن میں سے بعض ڈراموں میں نتیجہ ناظرین کی توقعات کے مطابق نکل کر انہیں محظوظ کرتا ہے جبکہ بعض ڈراموں میں نتیجہ برعکس ہونے پر ناظرین کی حیرت کا سبب بنتا ہے جو کہ سبق آموز ہوتا ہے۔

### نقطۂ عروج

نقطہ عروج ڈرامے کی اہم ترین منزل ہے۔ یہ قصے کا سب سے اہم اور نازک موڑ ہوتا ہے۔ یہاں قصہ عروج پر ہوتا ہے اور ایسے واقعات سامنے آنے لگتے ہیں جن سے کسی ایک فریق کی کامیابی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں دیکھنے والوں کی بیتابی بڑھ جاتی ہے اور وہ قصے میں زیادہ دلچسپی اور توجہ ظاہر کرتے ہوئے دیکھنے لگتے ہیں کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ آنند لہر کے بعض ڈراموں میں نقطہ عروج ہمیں واضح انداز میں دیکھنے کو ملتا ہے جیسا کہ ڈراما ''تیاگ'' کو لے لیجئے۔ تیاگ کا قصہ اس وقت نقطہ عروج کو پہنچتا ہے جب برکھا اور ساون کو اپنے گناہوں کا

احساس ہوتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ تیاگ ہی جیون کی حقیقت ہے۔ تب وہ سادھو کے پاؤں پکڑ کر معافی طلب کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں۔ جبکہ ڈرامہ ''کھیل'' کا قصہ اس وقت نقطہ عروج کو پہنچتا ہے جب مجمع باز اپنا تھیلا لوگوں کو دکھاتا ہے۔ مجمع باز کا تھیلا پوری کہانی میں تجسّس اور دلچسپی کا مرکز بنا رہتا ہے۔ مجمع باز کا تھیلا خالی نکلتا ہے۔ لوگ اسے دھوکے باز کہتے ہیں۔ جب اسے اس کا سبب پوچھتے ہیں تب وہ بتاتا ہے کہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ یہ صرف لوگوں کو جوڑنے کا کھیل تھا۔

ڈرامہ ''گناہ گار'' میں ہر شخص ایک دوسرے کو گنہگار سمجھتا ہے اور اپنے گناہوں کا احساس انہیں نہیں ہوتا۔ بالآخر ڈراما اس وقت عروج کو پہنچا ہے جب ایک لڑکی کہتی ہے کہ یہاں سب گنہگار ہیں، چور ہیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کی جیب کاٹ رہا ہے۔

ڈرامہ ''تپسوی کون'' میں دو طبقوں رشوت خور اور ایماندار کے درمیان کشمکش کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایماندار اور دوسرا بے ایمان۔ ایک رشوت نہ لے کر اپنے آپ کو ایماندار سمجھتا ہے لیکن بیوی بچوں کے حقوق ادا نہیں کر سکتا اور پرسکون زندگی گزارنے سے محروم رہ جاتا ہے۔ جبکہ دوسرا رشوت لیتا ہے لیکن ایک خوشگوار زندگی گزارنے اور اپنی اولاد کو اچھے مقام پر پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ڈرامے کی کشمکش اس وقت عروج کو پہنچتی ہے جب شنکر اپنی ایمانداری کی وجہ سے اپنے بچے کا علاج نہیں کروا سکتا اور وہ زندگی کی جنگ ہار جاتا ہے۔ جبکہ شور رشوت کے پیسوں سے اپنے بچے کو انجینئر اور ڈاکٹر بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ڈرامہ ''زندگی'' میں ایک اعلیٰ افسر اور اس کے ماتحت کام کرنے والے ایک معمولی ملازم کی زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ اس ڈرامے کی کہانی اس وقت عروج کو پہنچتی ہے جب اعلیٰ افسر مال و دولت، عہدہ، شہرت اور زندگی کی تمام تر آسائشیں ہونے کے باوجود چین و سکون کی زندگی بسر نہیں کر سکتا اور اس کی بیوی اور بچے اس سے بدسلوکی سے پیش آتے ہیں۔ آخر میں اس کی زندگی اجیرن بن کر رہ جاتی ہے۔ جبکہ اس کے ماتحت کام کرنے والا ایک معمولی ملازم امن و سکون کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنے خاندان میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

## اسلوب و بیان

ڈرامہ کرداروں کی باہمی گفتگو کے سہارے آگے بڑھتا ہے اور یہ گفتگو مکالمہ کہلاتی ہے۔ ظاہر ہے مکالمے کسی نہ کسی زبان میں ہوتے ہیں۔ ڈرامے کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کی زبان سادہ، عام فہم اور روزمرہ کی

زبان ہو۔زبان کا دارومدار ڈرامے کے موضوع پر بھی ہوتا ہے۔آنندلہر نے ڈراموں میں بالکل سادہ اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔انہوں نے ہمارے سماج سے جڑے چھوٹے چھوٹے مسائل کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے ڈراموں کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے تمام ڈراموں میں روزمرہ اور بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔جس کی وجہ سے عام انسان بھی ان کے ڈراموں سے لطف اندوز ہوسکتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو آنندلہر نے ایک ایسے دور میں اردو ڈرامے کی طرف توجہ دی جب ڈراما بے اعتنائی کا شکار ہو چکا تھا۔ایسی صورتحال میں اردو ڈرامے کو منظر عام پر لانا قابل ستائش ہے۔آنندلہر نے سنجیدگی کے ساتھ اردو ڈرامے کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔اگر چہ انہوں نے زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں جن کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی جو اسٹیج ڈراموں کے حصے میں آئی تاہم ریڈیو کے لئے انہوں نے مختلف سماجی مسائل پر ڈرامے تخلیق کئے جو وقتاً فوقتاً ریڈیو سرینگر اور جموں سے نشر ہوئے۔ان کے یہ ڈرامے سماجی اصلاح کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں جن میں سماجی برائیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ڈراما ''تپسوی کون'' ان کا واحد ڈراما ہے جو ڈرامے کے فنی لوازمات پر کھرا اترتا ہے اور اس میں اسٹیج کے لوازمات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔اگر چہ اردو ڈراما نگاری کے میدان میں آنندلہر کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر سکے تاہم مختلف موضوعات پر لکھے گئے ان کے ان ڈراموں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

## حوالہ جات


۱ آنند لہر، نروان، جے کے بک ہاؤس جموں، ۱۹۸۸، ص۔ ۹

۲ ایضاً، ص۔ ۱۱

۳ ایضاً، ص۔ ۱۶

۴ ایضاً، ص۔ ۲۰

۵ ایضاً، ص۔ ۲۱

۶ ایضاً، ص۔ ۲۷

۷ ایضاً، ص۔ ۴۴

۸ ایضاً، ص۔ ۵۹

۹ ایضاً، ص۔ ۷۳

۱۰ ایضاً، ص۔ ۷۴

۱۱ ایضاً، ص۔ ۷۹

۱۲ ایضاً، ص۔ ۸۵

۱۳ آنند لہر، تپسوی کون، انیس آفسیٹ پرنٹرز نئی دہلی، ۱۹۹۴، ص۔ ۸۵

۱۴ ایضاً، ص۔ ۵

۱۵ ایضاً، ص۔ ۶

۱۶ ایضاً، ص۔ ۱۱

۱۷ ایضاً، ص۔ ۱۴

۱۸ ایضاً، ص۔ ۱۶

۱۹ ایضاً، ص۔ ۲۰

۲۰ ایضاً، ص۔ ۲۲

۲۱ ایضاً، ص۔ ۲۷

۲۲ ایضاً،ص۔۴۶

۲۳ ایضاً،ص۔۵۲

۲۴ ایضاً،ص۔۵۴

۲۵ ایضاً،ص۔۶۴

۲۶ ایضاً،ص۔۶۷

۲۷ ایضاً،ص۔۶۸

۲۸ آنند لہر،سرحدیں،گلستان پبلی کیشنز کلکتہ،۲۰۰۶،سرورق

۲۹ ایضاً،ص۔۱۱

۳۰ ایضاً،ص۔۳۸

۳۱ ایضاً،ص۔۴۶

۳۲ ایضاً،ص۔۳۲

۳۳ ایضاً،ص۔۶۱

۳۴ ایضاً،ص۔۷۷

۳۵ ایضاً،ص۔۷۸

۳۶ ایضاً،ص۔۷۹

۳۷ ایضاً،ص۔۵۶

۳۸ ایضاً،ص۔۶۳

۳۹ ایضاً،ص۔۶۴

۴۰ ایضاً،ص۔۸۴

۴۱ ایضاً،ص۔۸۳

۴۲ ایضاً،ص۔۱۲۴

۴۳ ایضاً،ص۔۱۲۵

۴۴ آنند لہر، تپسوی کون، انیس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی ۔۱۹۹۴،ص۔۶۷

۴۵ آنند لہر، سرحدیں، گلستان پبلی کیشنز کلکتہ، ۲۰۰۶،ص۔۸۴

۴۶ ایضاً،ص۔۱۲۵

۴۷ آنند لہر، تپسوی کون، انیس آفسٹ پرنٹرز نئی دہلی، ۱۹۹۴،ص۔۷۹

# اختتامیہ

جموں وکشمیر کی سرزمین شروع سے ہی علم و ادب کا گہوارا رہی ہے۔اس سرزمین نے کئی شاعروں، ادیبوں،مفکروں اور صوفیائے اکرام کو جنم دیا ہے۔مختلف ادوار میں یہاں مختلف زبانوں کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔یہاں اردو زبان کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ڈوگرہ عہد سے قبل ریاست میں فارسی زبان وادب کا چلن تھا۔۱۸۴۶ء میں برطانوی مفادات کے پیش نظر مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کو خریدااوراس طرح ڈوگرہ عہد کا قیام عمل میں آیا۔سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ڈوگرہ حکمرانوں نے پنجاب، دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات استوار کیے۔مقامی لوگوں کا تجارت کی غرض سے دیگر ریاستوں میں آنا جانا ہوا جہاں انہیں اردو سیکھنے کا موقع ملا۔اس کے علاوہ بیرون ریاست سے آنے والے سیاحوں سے بھی اردو سیکھنے کا موقع ملا۔ڈوگرہ عہد کے بعد جموں وکشمیر میں اردو زبان کی ترویج وترقی کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔۱۸۷۹ء میں اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا۔جس سے اردو زبان کو مزید پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔اس سے قبل جموں وکشمیر کے قلم کار فارسی کے علاوہ مقامی زبانوں میں ادب تخلیق کر کے اپنی صلاحتوں کا مظاہرہ کر چکے تھے۔لہذا اردو کو بھی ان قلم کاروں نے ہاتھوں ہاتھ لیااور اردو ادب میں بھی طبع آزمائی کرنی شروع کی۔جموں وکشمیر کے قلم کاروں نے لگ بھگ اردو کی تمام تر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔جہاں تک فکشن کا مسلہ ہے تو بیسویں صدی کے شروع میں اردو افسانے کی ابتدا ہوئی۔محمد دین فوق کی تخلیقات میں افسانے کے ابتدائی نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس کے بعد ریاست کے مختلف خطوں سے تعلق رکھنے والے تخلیق کاروں نے افسانے، ناول اور ڈرامے تخلیق کر کے اردو ادب میں اضافہ کیا اور اپنی ایک الگ شناخت قائم کی۔اس کے بعد یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا اور کئی فکشن نگاروں نے اعلیٰ فن پارے تخلیق کر کے اردو ادب میں اضافہ کیا۔عصر حاضر میں بھی اردو فکشن کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی جا

رہی ہے جس سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جموں وکشمیر میں اردو فکشن کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو فکشن سے تعلق رکھنے والے روشن ستاروں میں ایک اہم نام آنند لہر کا بھی ہے۔آنند لہر ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار، شاعر، سماجی کارکن اور مشہور و معروف وکیل تھے۔آنند لہر کے آباؤ اجداد پونچھ کے سرحدی گاؤں سٹھیڑا میں آباد تھے۔جہاں سے ۱۹۴۷ء میں حالات کے پیش نظر انھوں نے ہجرت کر کے پونچھ کے محلّہ سرائے میں مستقل سکونت اختیار کی۔آنند لہر کی پیدائش اسی محلے میں ۲ جولائی ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔آنند لہر کا اصل نام شیام سندر تھا۔آنند ان کی ذات ہے جبکہ لہر ان کا قلمی نام تھا۔پرائمری اسکول پونچھ سے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز کیا۔اس کے بعد مڈل اسکول پونچھ سے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔مزید تعلیم کے لئے گورنمنٹ ہائر اسکینڈری اسکول پونچھ میں داخلہ لیا۔جہاں سے بارہویں جماعت کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔۱۹۷۲ء میں ڈگری کالج پونچھ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے کشمیر یونی ورسٹی کا رخ کیا۔جہاں سے ۱۹۷۵ء میں ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کرنے کے فوراً بعد انھوں نے جموں ہائی کورٹ میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔اپنی قابلیت و استعداد کی بنا پر بہت جلد کامیابی کی بلندیوں کو چھوا اور ان کا شمار ریاست کے مشہور و معروف وکلا میں ہونے لگا۔اپنے پیشے سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔تمام عمر اسی پیشے سے منسلک رہے۔عمر کے آخری دو تین سال صحت کی خرابی کی وجہ سے پیشے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی سرگرمیوں کو بھی خیر آباد کہنا پڑا۔لیکن ۱۹۷۲ء سے ۲۰۱۶ء تک وہ وکالت کے فرائض بخوبی انجام دینے کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات بھی بڑی دلجمی سے انجام دیتے رہے۔اس کے علاوہ مختلف ادبی انجمنوں کی سرپرستی بھی انھیں حاصل رہی۔

آنند لہر خوش اخلاق، ملنسار اور انسان دوست شخصیت کے مالک تھے۔ہر کسی سے خندہ پیشانی سے پیش آنا ان کا شیوہ تھا۔ان کے چہرے پر ہر وقت خوشی و شادمانی کے اثرات نمایاں رہتے تھے۔نہایت شریف اور سادہ مزاج انسان تھے۔غریب پروری، مذہبی رواداری، عاجزی و انکساری، انسانی ہمدردی اور ادب دوستی ان کی اعلیٰ صفات شخصیت میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔آنند لہر تقریباً چار دہائیوں تک اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی خدمات بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔۲۲ جون ۲۰۱۶ء کو آنند لہر سپریم کورٹ آف انڈیا میں ایک مقدمہ کی سماعت کر رہے تھے کہ اچانک ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ڈھائی سال تک اس مرض سے لڑنے کے

بعد ٦ دسمبر ۲۰۱۸ءکو اردو ادب کی یہ شمع ہمیشہ کے لئے گل ہوگئی۔

آنند لہر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ انہوں نے ۱۹۷۲ء میں ''پتھر کے آنسو'' کے نام سے پہلا افسانہ لکھ کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ افسانہ گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ کے میگزین میں شائع ہوا اور اس پر ان کی کافی حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے بعد ان کے افسانے مختلف رسائل و جرائد میں تواتر سے شائع ہونے لگے۔ آنند لہر کے کل پانچ افسانوی مجموعے ہیں۔ شروع شروع میں انہوں نے روایتی طرز پر لکھنا شروع کیا۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے میں شامل تمام تر افسانے حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جن میں آنند لہر نے مختلف سماجی مسائل کو سادہ اسلوب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد جدیدیت کی پیروی کرتے ہوئے آنند لہر نے علامتی اور تجریدی طرز پر لکھنا شروع کیا۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' تجریدی اور علامتی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کے تمام تر افسانے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے لکھے گئے ہیں۔ جن میں انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان افسانوں میں آنند لہر نے علامتوں کا برمحل استعمال کیا ہے۔ دراصل یہ وہ دور تھا جب جموں وکشمیر کے حالات ناگفتہ بہ تھے۔ حالات کے پیش نظر لوگوں کو محصور کر دیا گیا تھا، ان کی زبانیں مقفل کر دی گئیں تھیں۔ ایسے میں کسی بھی حساس مسئلے کا برمحل اظہار خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس دور کے افسانہ نگاروں کو جدیدیت کی پیروی کے علاوہ حالات کے پیش نظر علامتی افسانوں کا سہارا لینا پڑا۔ ''انحراف'' کے بعد آنند لہر نے پھر سے حقیقت پسندی کی طرف رخ کیا اور جدیدیت کے حصار سے نکل کر حقیقت پسندی کو اپنا موضوع بنایا۔

آنند لہر کے افسانوں کے مطالعے سے لگتا ہے کہ وہ افسانے کے فنی رموز سے خوب واقف تھے۔ اپنے ارد گرد کے ماحول پر ان کی گہری نظر تھی۔ سماج سے جڑے سنجیدہ مسائل اور فکر انگیز حالات کو انہوں نے نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ آنند لہر ایک صاف ذہن انسان تھے۔ وہ مشترکہ تہذیب کے دلدادہ اور امن وسکون کے حامی تھے۔ انہوں نے سیاسی اور سماجی موضوعات کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔ لہر نے سماج میں بھیڑیا صفت انسانوں کے چہروں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ آنند لہر حالات کا ماتم نہیں کرتے بلکہ ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ انہوں نے مذہبی تفرکات، ذات پات، رشوت، سرحدوں کے وجود، اخلاقی قدروں کی گراوٹ اور خواتین کے مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے۔ ان کے افسانے بہت مختصر ہیں لیکن مختصر ہوتے ہوئے بھی زندگی پر محیط ہیں۔ انہوں نے

سادہ اسلوب میں سنجیدہ مسائل اور فکر انگیز خیالات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔آنند لہر کی کہانیوں میں اختصار، مقصدیت، معنویت اور غیر معمولی گہرائی و وسعت پائی جاتی ہے۔ان کے افسانوں کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انہیں افسانے کے فن پر عبور حاصل تھا۔لہر نے افسانوں میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، منظر نگاری، جذبات نگاری اور وحدت تاثر کا خاص خیال رکھا ہے۔ان کے افسانے فنی معیار پر کھرے اترتے ہیں۔جس کی تائد اردو ادب کے بلند پایہ محققین، ناقدین اور ادبا نے بھی کی ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ ''آنند لہر کی افسانہ نگاری پر کسی شک کی گنجائش نہیں۔''اس بات کی مزید تصدیق جگن ناتھ آزاد، فدا کشتواڑی، ڈاکٹر پریمی رومانی، ڈاکٹر محمد ایوب خان، نامی انصاری، انور کمال حسینی، نصرت چودھری اور پروفیسر ظہور الدین کی آرا سے ہوتی ہے۔آنند لہر ایک حساس افسانہ نگار تھے۔سماج سے جڑے چھوٹے چھوٹے مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔انہوں نے اپنے افسانوں میں عام انسان کو موضوع بنایا ہے۔پریم چند کی طرح ان کی کہانیوں کا ہیرو بھی ایک عام انسان ہوتا ہے۔ان کے افسانوں میں دوڑتی، ابھرتی اور سسکتی زندگی کو دیکھ کر عام انسان کو لگتا ہے کہ یہ ہم سب کی کہانی ہے۔ان کا اسلوب سادہ اور دلکش ہے۔لہر نے تلخ سے تلخ اظہار برائے راست کر دیا ہے۔لہر چونکہ پیشے سے وکیل تھے اس لئے تجزیاتی ذہن رکھتے تھے۔مدلل طریقۂ اظہار پر قدرت رکھتے تھے۔کم لفظوں میں مکمل بات کہنے کا ہنر انہیں خوب آتا تھا۔لہر کے افسانے بہت مختصر ہیں لیکن زندگی اور سماج کی کڑوی سچائیوں کو انہوں نے بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔

آنند لہر نے اپنی ادبی صلاحتوں کو صرف اردو افسانے تک محدود نہیں رکھا۔انہوں نے اردو ناول میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔آنند لہر نے کل پانچ ناول لکھے ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر ادبی دنیا میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔آنند لہر نے اپنے ناولوں کے لئے بہت ہی اہم موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کشمیر کی درد بھری داستان کو پیش کرتا ہے۔یہ ایک دلچسپ ناول ہے جس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کے کشمیر کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے وادئ کشمیر سے کشمیری پنڈتوں کی ہجرت کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔ناول نگار نے نصف صدی پر پھیلی ہوئی سرزمین کشمیر کی درد بھری کہانی کو بڑی ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔آنند لہر نے جہاں ایک طرف کشمیر کی خوبصورتی و رعنائی، اخوت و بھائی چارے اور امن و امان کے دور کا ذکر کیا ہے وہیں دوسری طرف ۱۹۴۷ء کے بعد کشیدہ حالات، مشترکہ تہذیب کے بکھراؤ، سیاسی بدحالی، مذہبی تفرکات، ظلم و جبر اور کشت و خون کے

دور کا بیانیہ بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ناول ''سرحدں کے بیچ'' سرحدوں کے آس پاس بسنے والے لوگوں کی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔آنند لہر کا تعلق چونکہ سرحدی علاقے سے تھا انہوں نے سرحدی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔لہر سرحدوں کے بالکل خلاف تھے۔انہوں نے افسانہ،ناول اور ڈراما تینوں اصناف کے ذریعے سرحدوں کے مسائل کو پیش کرنے اور ان کے وجود کے خلاف صدا بلند کرنے کی بھر پور سعی کی ہے۔زیر بحث ناول کا موضوع ہند و پاک کے درمیان کی سرحد کے دونوں طرف کے گاؤں کی انسانی صورت حال ہے جو نہ صرف دردناک ہے بلکہ یہ سرحدیں انسانیت کی بنیادی قدروں کو پامال کرنے کا سبب بھی بن گئی ہیں۔

''مجھ سے کہا ہوتا'' ایک دلچسپ ناول ہے جو امریکہ کے ہاتھوں عراق کی تباہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ناول میں آنند لہر نے جنگ کے نتائج،طاقت کے بے جا استعمال،انسانی رشتوں کے زوال اور کئی انسانی مسائل کا احاطہ کیا ہے جو آفاقی نوعیت کے ہیں۔یہ ناول انسانی رشتوں کے زوال،دوملکوں کی آپسی رنجش اور نسلی امتیازات کا بیانیہ ہے۔عصر حاضر کی انسانی زندگی اور مسائل پر آنند لہر کی گہری نظر تھی۔دور حاضر میں انسانی قدریں پامال ہو رہی ہیں،سماجی رشتے دم توڑ رہے ہیں۔ناول ''یہی سچ ہے'' انہیں مسائل کی ترجمانی کرتا ہے۔جس میں ناول نگار نے بدلتے وقت و حالات،بے رحم ماحول کی سنگینی،ذات کا درد و کرب،خود غرضی اور استحصال کو اپنی فنی صلاحتوں کے ذریعے بروئے کار لایا ہے۔محبت میں ناکامی،رنگ و نسل،مذہبی تفرکات اور ذات پات جیسے مسائل سے ہمارا سماج ہمیشہ دو چار رہا ہے۔جس کی عکاسی کرنے کے لئے آنند لہر نے ناول ''نامدیو'' کی تخلیق کا کرب جھیلا۔مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو آنند لہر نے معاصر سماج کے بہت ہی اہم مسائل کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ان کے ناولوں کے مطالعے سے لگتا ہے کہ وہ ناول نگاری کے فن پر عمدہ دسترس رکھتے تھے۔جتنے اہم موضوعات کا انہوں نے انتخاب کیا ہے اتنے ہی اہم طریقے سے انہیں بیان کرنے میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ناول کے فنی لوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے سنجیدہ مسائل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کے ناول اردو ناول نگاری کے باب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔افسانہ اور ناول میں طبع آزمائی کرنے کے ساتھ ساتھ اردو ڈراما کے میدان میں بھی ان کی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔آنند لہر نے زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے لکھے ہیں۔سماج سے جڑے چھوٹے چھوٹے مسائل کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ ڈرامے ریڈیو اسٹیشن سرینگر اور جموں سے نشر کئے گئے۔آنند لہر نے رشوت خوری،ذات پات،دنیا کی بے ثباتی،سرحدوں کا درد و کرب اور اخلاقی

قدروں کی گراوٹ جیسے موضوعات کو اپنے ڈراموں کا موضوع بنایا ہے۔

مجموعی اعتبار سے آنند لہر کی خدمات کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انہیں اردو زبان وادب سے بے پناہ محبت تھی ۔یہی وجہ کہ انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود تاحیات اردو ادب کی بے لوث خدمات انجام دیں۔فکشن ان کا خاص میدان تھا۔۱۹۷۲ء سے لے کر ۲۰۱۷ء تک مسلسل اردو فکشن کی آبیاری کرتے رہے۔اس کے بعد صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔آنند لہر کو بنیادی طور پر افسانہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔آنند لہر کی مجموعی تخلیقات کا جائزہ لینے کے بعد راقم کی ناقص رائے کے مطابق آنند لہر ناول نگار کی حیثیت سے بلند مقام رکھتے ہیں۔کیونکہ انہوں نے نہایت اہم اور سنجیدہ مسائل کو موضوع بنا کر ناول کے فنی لوازمات کو مدنظر رکھتے ہوئے عمدہ ناول تخلیق کئے ہیں۔بے شک ان کے بعض افسانے بھی فن پر کھرے اترتے ہیں اور اہم مسائل کو پیش کرتے ہیں لیکن بہت سارے ایسے افسانے بھی موجود ہیں جو جدت وندرت سے عاری نظر آتے ہیں اور روایتی کہانیوں کی طرح عام قصے معلوم ہوتے ہیں۔

ڈراما نگاری کا جہاں تک سوال ہے بلا شبہ انہوں نے اردو ڈرامے کے ذریعے بھی کئی سماجی مسائل کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی ہے تاہم ان کے ڈرامے اردو ڈرامے کے تمام تر فنی لوازمات کو پورا کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔''تپسوی کون'' ان کا واحد ڈراما ہے جو اسٹیج کے لوازمات مہیا کرنے کے مترادف نظر آتا ہے۔جبکہ دیگر تمام ریڈیائی ڈرامے ہیں جن کو وہ فوقیت حاصل نہیں ہوسکی جو اردو ادب کے دیگر مایہ ناز ڈراما نگاروں کے ڈراموں کو حاصل ہوئی۔بہر حال اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود آنند لہر نے تقریباً چار دہائیوں تک جس ذوق وشوق کے ساتھ اردو ادب کی خدمات انجام دیں ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔جموں وکشمیر میں اردو فکشن کی تاریخ آنند لہر کا نام لئے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔انہوں نے اردو افسانہ، ناول اور ڈراما تینوں اصناف میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔اردو ادب کے تئیں محبت، لگن اور جہد مسلسل نے انہیں منفرد مقام عطا کیا ہے۔آنند لہر ایک صاف ذہن انسان تھے۔اخوت ومحبت، احساس وہمدردی اور انسان دوستی ان کی شخصیت کی نمایاں خوبیاں ہیں جو ان کی تخلیقات میں بھی در آئیں ہیں۔

# کتابیات

# کتابیات

## آنند لہر کی تصانیف

| نمبر شمار | مصنف | نام کتاب | ناشر / مطبع | سنہ اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | آنند لہر | نروان | جے کے بک ہاوس ویر مرگ جموں توی | ۱۹۹۸ء |
| ۲ | آنند لہر | تپسوی کون | انیس آفسٹ پرنٹرز نئی دہلی | ۱۹۹۴ء |
| ۳ | آنند لہر | اگلی عید سے پہلے | مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں | ۱۹۹۷ء |
| ۴ | آنند لہر | سرحد کے اس پار | سیمانت پرکاش دریا گنج نئی دہلی | ۲۰۰۱ء |
| ۵ | آنند لہر | انحراف | ملک بک ڈپو ترکمان گیٹ نئی دہلی | ۲۰۰۲ء |
| ۶ | آنند لہر | سرحدوں کے بیچ | | ۲۰۰۲ء |
| ۷ | آنند لہر | کورٹ مارشل | مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں | ۲۰۰۵ء |
| ۸ | آنند لہر | مجھ سے کہا ہوتا | اردو بک سوسائٹی نئی دہلی | ۲۰۰۵ء |
| ۹ | آنند لہر | سرحدیں | گلستان پبلی کیشنز کلکتہ | ۲۰۰۶ء |
| ۱۰ | آنند لہر | یہی سچ ہے | اردو بک سوسائٹی نئی دہلی | ۲۰۰۸ء |
| ۱۱ | آنند لہر | بٹوارہ | اردو بک سوسائٹی نئی دہلی | ۲۰۰۹ء |
| ۱۲ | آنند لہر | آندولن | مانوی پرکاشن پنج ترتھی جموں | ۲۰۰۹ء |
| ۱۳ | آنند لہر | نامدیو | اوشن پبلی کیشنز نئی دہلی | ۲۰۱۲ء |
| ۱۴ | آنند لہر | سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے | روشن پرنٹرز نئی دہلی | ۲۰۱۵ء |

## دیگر امدادی کتب


| نمبر شمار | مصنف | نام کتاب | ناشر | سن اشاعت |
|---|---|---|---|---|
| ۱ | ابوالکلام قاسمی | ناول کا فن | ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ | ۱۹۹۲ء |
| ۲ | برج پریمی، ڈاکٹر | جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما | رچنا پبلی کیشنز جموں | ۱۹۹۲ء |
| ۳ | جان محمد آزاد | جموں و کشمیر کے اردو مصنفین | میکاف پرنٹرس، نئی دہلی | ۲۰۰۴ء |
| ۴ | حامدی کاشمیری | ریاست جموں کشمیر میں اردو ادب | گلشن پبلی کیشنز سری نگر | ۱۹۹۱ء |
| ۵ | خلیل الرحمٰن اعظمی | اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک | ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ | ۱۹۷۹ء |
| ۶ | دیپک بدکی | اردو کے غیر مسلم افسانہ نگار | میزان پبلی کیشنز، سرینگر | ۲۰۱۷ء |
| ۷ | رام بابو سکسینہ | تاریخ اردو ادب | ادارہ کتاب الشفاء | ۲۰۰۰ء |
| ۸ | سلیم اختر، ڈاکٹر | افسانہ، حقیقت سے علامت تک | اردو رائٹرس گلڈ۔ الہ آباد | ۱۹۸۰ء |
| ۹ | سہیل بخاری | اردو ناول نگاری | الحمرا پبلیشرز، دہلی | ۱۹۷۲ء |
| ۱۰ | شمس الرحمٰن فاروقی | افسانے کی حمایت میں | برٹی آرٹ پریس نئی دہلی | ۱۹۸۷ء |
| ۱۱ | شہاب عنایت ملک | نئے جائزے | رسا جاودانی میموریل سوسائٹی جموں | ۲۰۰۵ء |
| ۱۲ | صابر مرزا، ڈاکٹر | صوبہ جموں کے علاقائی ادب پر اردو کے ثرات | انجمن پہاڑی ترقیاتی ادب راجوری | ۲۰۰۵ء |
| ۱۳ | ظہور الدین | جدید اردو ڈراما | ادارہ فکر جدید، نئی دہلی | ۱۹۸۷ء |
| ۱۴ | عبدل قادر سروری | کشمیر میں اردو۔ جلد دوم | اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر | ۱۹۸۲ء |
| ۱۵ | علی حیدر ملک | افسانہ اور علامتی افسانہ | عاکف بک ڈپو مٹیا محل دہلی | ۱۹۹۹ء |

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| ۱۶ | عشرت رحمانی | اردو ڈراما کا ارتقاً | ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ | ۱۹۷۸ء |
| ۱۷ | فرحت شمیم | اقبال مجید فن فکشن فنکار | قاسمی کتب خانہ جموں، توی | ۲۰۱۱ء |
| ۱۸ | فرمان فتح پوری | اردو فکشن کی مختصر تاریخ | ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی | ۲۰۱۴ء |
| ۱۹ | قمر رئیس | پریم چند کے نمائندہ افسانے | تاج آفسٹ پریس الہ آباد | ۱۹۸۶ء |
| ۲۰ | قمر رئیس | تنقیدی تناظر | طبع اول علی گڑھ | ۱۹۷۸ء |
| ۲۱ | گوپی چند نارنگ | اردو افسانہ، روایت اور مسائل | ایجوکیشن پبلشنگ ہاؤس دہلی | ۱۹۸۱ء |
| ۲۲ | لیاقت علی | جموں وکشمیر میں اردو ادب | میزان پبلی کیشنز، سرینگر | ۲۰۱۶ء |
| ۲۳ | محی الدین زور | دبستان جموں وکشمیر میں اردو | گلشن پبلیشرز، سرینگر | ۲۰۱۲ء |
| ۲۴ | محمد صادق | ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ | اردو مجلس چتلی قبر دہلی | ۱۹۸۱ء |
| ۲۵ | مہناز انور | اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ | نامی پریس لکھنو | ۱۹۸۵ء |
| ۲۶ | نورالحسن نقوی | تاریخ ادب اردو | ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ | ۱۹۹۷ء |
| ۲۷ | وقار عظیم | فن افسانہ نگاری | آفاق بک ہاؤس علی گڑھ | ۱۹۶۹ء |
| ۲۸ | وقار عظیم | داستان سے افسانے تک | ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ | ۲۰۰۳ء |
| ۲۹ | وقار عظیم | نیا اردو افسانہ | ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ | ۱۹۸۲ء |
| ۳۰ | وقار عظیم | اردو ڈراما فن اور منزلیں | ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی | ۱۹۹۶ء |
| ۳۱ | وقار عظیم | اردو ڈراما تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ | الوقار پبلی کیشنز، لاہور | ۱۹۹۶ء |


## رسائل


سہ ماہی اسباق، پونہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۳ء

بازیافت، شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی، سرینگر دسمبر ۲۰۰۵ء

ماہنامہ، شیرازہ، اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سری نگر، شمارہ ۸،

تسلسل، شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی، جموں توی

**UNIVERSITY OF HYDERABAD**

**DEPARTMENT OF URDU**

**School of Humanities**

**with the financial assistance of IoE**

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

Two-day National Seminar on

**"Urdu Translation in Modern Era: Significance, Problems and Prospects"**

6th & 7th March 2023.

# CERTIFICATE

*This is to certify that Dr./ Mr./ Ms.* KHALID MEMOOD *of* University Of Hyderabad. *has presided/ attended as resource person/ participated/ presented a paper titled* Ikeesvien Sadi ke Urdu Adab main Trajam ki Ahmiyat O Afadiyat.

*in Tow-day National Seminar on* **Urdu Translation in Modern Era: Significance, Problems and Prospects** *held on 6th & 7th March 2023.*

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| **Dr. Mohd. Kashif**<br>Convener of the Seminar<br>Dept. of Urdu,<br>University of Hyderabad | **Dr. Nishath Ahmed**<br>Joint Convener<br>Dept. of Urdu,<br>University of Hyderabad | **Dr. A.R. Manzar**<br>Joint Convener<br>Dept. of Urdu<br>University of Hyderabad | **Prof. Syed Fazlullah**<br>Patron of the Seminar<br>Dept. of Urdu<br>University of Hyderabad | **Prof. Habeeb Nisar**<br>Head<br>Dept. of Urdu<br>University of Hyderabad |

REDMI NOTE 8 PRO
AI QUAD CAMERA
27/07/2023 14:04
CamScanner

# AZADI KA AMRIT MAHOTSAV

Collaboration with Student Welfare Department, Chief Warden Office and Department of Urdu, University of Hyderabad

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

## Two-day National Seminar on

## "Urdu Adab Mein Hindustani Anasir: 1947 Ke Baad"

## held on 9th & 10th February 2022.

# CERTIFICATE

*This is to certify that Dr./ Mr./ Ms.* KHALID MEMOOD *of* Phd Scholar University of Hyderabad. *has presided/ attended as resource person/ participated/ presented a paper titled* Anand Lehar K Novelon main Hindustani Tehzeeb

*in Tow-day National Seminar in URDU ADAB MEIN HINDUSTANI ANASIR 1947 KE BAAD held on 9th & 10th February 2022.*

**Dr. Arshia Jabeen**
Seminar Co-ordinator
Department of Urdu,
University of Hyderabad

**Dr. Mohd. Kashif**
Seminar Co Co-ordinator
Department of Urdu,
University of Hyderabad

**Prof. Syed Fazlullah Mukarram**
Head
Department of Urdu
University of Hyderabad

**Prof. G. Nagaraju**
Dean
Student Welfare
University of Hyderabad

CamScanner

کی دوائی ضروری ہے۔"

بٹوارہ، آنند لہر، اردو بک سوسائٹی، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۹، ص۔ ۱۶، ۱۷

لہر چونکہ سرحدی زندگی اور سرحد پر ہونے والے ظلم و جبر سے خوب واقف تھے اس لئے انہوں نے سرحد کے قرب و جوار میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کا نقشہ بڑے خوبصورت انداز سے کھینچا ہے۔ اس کے علاوہ لہر نے افسانہ "ہرا گن" میں عورت کے جذبۂ ایثار و قربانی، محبت و جفاکشی کو بیان کیا ہے۔ "ایک ہجرت" کے عنوان سے ایک اور دلچسپ افسانہ ہے، جس میں لہر نے مسئلہ کشمیر کو پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کا ایک اور افسانہ "یہ سرحدیں" بھی قاری کی دلچسپی کا باعث بنتا ہے، جس میں لہر نے عورت کی عظمت اور اس کے مقام کو بیان کیا ہے، نیز یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر مذہب عورت کی عزت و احترام کا درس دیتا ہے، لیکن عصر حاضر میں عورت کی عصمت و عظمت کا احترام کرنے کے بجائے ان کی آبرو کو پامال کیا جا رہا ہے اور ان کے احترام کے بجائے سرحدوں کا احترام کیا جا رہا ہے۔ افسانے سے یہ اقتباس دیکھیں:۔

"حضور عورت کی عزت بچانا بھگوان کا حکم ہے اور سرحد کی حفاظت کرنا انسان کا کام۔۔۔"

بٹوارہ، آنند لہر، اردو بک سوسائٹی، دریا گنج، نئی دہلی، ۲۰۰۹ ص۔ ۷۳

"سرِیشٹا نے بھی یہی لکھا ہے" آنند لہر کا پانچواں اور آخری افسانوی مجموعہ ہے۔ جو ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں آنند لہر نے مختلف سماجی مسائل کو پیش کرنے کے لئے ۳۷ مختصر افسانے لکھے ہیں۔ جس میں دہشت گردی، استحصال، بے جوڑ شادی، ٹوٹتے بکھرتے رشتے، غربت، بلاتکار، رشوت خوری، محبت میں ناکامی اور ناانصافی جیسے موضوعات کو فن کارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ لہر کبھی حالات کا ماتم نہیں کرتے۔ وہ اپنی کہانیوں میں حالات کو بدلنے کا درس دیتے ہیں۔ لہر چونکہ ایک مشہور وکیل تھے اس لئے انہیں اپنی بات کو مدلل بیان کرنے کا ہنر خوب آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ موضوعات کو مختصر اور مدلل پیش کرنے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ غیر ضروری تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے لہر نے اپنی کہانیوں میں پیش آنے والے واقعات کو منظم طریقے سے انجام دیا ہے۔ جس کی وجہ سے کہانی کا تسلسل برقرار رہتا ہے اور وہ قاری کی دلچسپی کا مرکز بنی ہے۔ لہر نے چونکہ عام سماجی مسائل کو موضوع بنایا ہے اس لئے ان کی کہانیوں کے کردار بھی عام انسان ہیں۔

مختصر افسانے میں مکالمے کی خاصی اہمیت ہے۔ آنند لہر کے افسانوں میں اگر مکالموں کی بات کی جائے تو افسانوں کے مطالعے سے لگتا ہے کہ وہ فن مکالمہ نگاری پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ لہر نے اپنی کہانیوں میں ڈھیلے ڈھالے اور طویل مکالموں سے گریز کرتے ہوئے ادبی چاشنی کے ساتھ مختصر اور کرداروں کی شخصیت کے عین مطابق مکالمے استعمال کئے ہیں۔ انہوں نے افسانوں کے لئے سلیس اور سادہ اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آنند لہر نے فن افسانہ نگاری کے فنی لوازمات کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف موضوعات پر افسانے لکھ کر اس میدان میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔

ناول اور افسانے کے علاوہ آنند لہر نے اردو ڈراما نگاری کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی ڈراما نگاری سے کیا تھا۔ "تپسوی کون" کے عنوان سے ایک طویل ڈراما لکھ کر ادبی دنیا میں قدم رکھا۔ اس کے بعد "نروان" کے عنوان سے ریڈیائی ڈراموں کا ایک مجموعہ منظر عام پر آیا۔ ڈراموں کا دوسرا مجموعہ "سرحدیں" ۲۰۰۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔ اس میں تین ڈرامے "سرحدیں"، "پل"، اور "زندگی" شامل ہیں۔ "آنندولن" آنند لہر کی آزاد نظموں کا مجموعہ ہے جو ۲۰۰۹ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ آنند لہر ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار، ڈراما نگار، شاعر اور وکیل تھے۔ طویل عرصے تک اردو ادب کی بے لوث خدمت کرنے کے بعد اردو ادب کا یہ درخشاں ستارہ ۶، دسمبر، ۲۰۱۸ء میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو
یونی ورسٹی آف حیدرآباد
ای میل: khalidmemood56@gmail.com

---

میگزین میں ''پتھر کے آنسو'' کے نام سے افسانہ لکھ کر اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا ۔اس کے بعد ۱۹۹۲ء میں ''تپسوی کون'' کے نام سے ایک طویل ڈراما لکھ کر ادب کی دنیا میں شہرت حاصل کی۔اس کے بعد زندگی کے آخری لمحات تک ان کا قلم روانی سے جاری رہا۔لہر کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' ۱۹۹۷ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔جس کی ادبی دنیا میں کافی پزیرائی ہوئی۔یہ ناول سرزمین کشمیر کی درد بھری داستان ہے جسے ناول نگار نے فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔زیر نظر ناول میں ناول نگار نے ہندستان کی آزادی سے لے کر ۱۹۹۰ء تک کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے وادی کشمیر سے پنڈتوں کی ہجرت کے سانحہ کو پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے چار مزید ناول زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر ادبی دنیا سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔جن میں ناول ''سرحدوں کے بیچ''، ''مجھ سے کہا ہوتا''، ''یہی سچ ہے'' اور ''نامدیو'' شامل ہیں۔ناول ''سرحدوں کے بیچ'' سرحدوں کے آس پاس بسنے والے لوگوں کے حالات و مشکلات کا بیانیہ ہے۔ان کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' ایک دلچسپ ناول ہے، جو امریکہ کے ہاتھوں ایراق کی تباہی کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں جنگ و جدل ،ہتھیاروں سے ہونے والی تباہ کاریاں ،طاقت کا بے جا استعمال، نسلی امتیازات، غریبوں کا استحصال اور انسانی کم ظرفی کو بڑی عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔''یہی سچ ہے'' آنند لہر کا چوتھا ناول ہے جس میں انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو پیش کرتے ہوئے کئی سماجی مسائل کا احاطہ کیا ہے۔''نامدیو'' ان کا آخری ناول ہے جس میں محبت کی پاکیزگی اور بے جوڑ شادی سے پیدا ہونے والے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔لہر کے تمام ناول فنی بالیدگی کی عمدہ مثال ہیں ۔ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ آنند لہر ایک عمدہ افسانہ نگار بھی تھے۔آنند لہر کا پہلا افسانوی مجموعہ ''سرحد کے اس پار'' کے نام سے ۲۰۰۱ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔جس میں کل ۱۴ افسانے شامل ہیں۔لہر کے زیادہ تر افسانوں کا موضوع بٹوارہ ہے۔لہر کا جنم چونکہ جموں و کشمیر کے سرحدی ضلع پونچھ ہوا تھا۔انہوں نے زندگی کا طویل عرصہ وہاں گزارا۔ملک تقسیم ہونے سے لوگوں پر کیا اثرات پڑے نیز سرحد کے قریب لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے ہیں، انہیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ تمام چیزیں لہر نے قریب سے دیکھی تھیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ملک کے تقسیم ہونے سے پیدا شدہ حالات کی عمدہ عکاسی کی ہے۔اس موضوع پر ان کے بیشتر افسانے اور ناول ہیں۔

لہر افسانہ نگاری کے فنی لوازمات سے خوب واقف تھے۔سادگی اور اختصار ان کی تخلیقات کا خاصہ ہے۔آنند لہر پیشے سے وکیل تھے یہی وجہ ہے کہ وہ تجزیاتی ذہن رکھتے تھے اور اپنی بات کو مدلل بیان کرنے کا ہنر جانتے تھے۔لہر نے زیادہ تر اصلاحی افسانے تخلیق کیے ہیں۔وہ کبھی حالات کا ماتم نہیں کرتے بلکہ انسان کو ان سے نپٹنے کا درس دیتے ہیں۔کم لفظوں میں اپنی بات کو مکمل کرنا خوب جانتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے زیادہ تر افسانے بہت مختصر ہیں۔لہر کے تمام تر افسانے اپنی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''انحراف'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں انہوں نے ۲۵ افسانے شامل کیے ہیں۔انحراف میں شامل زیادہ تر افسانے تجریدی ہیں۔جن میں افسانہ نگار نے علامتوں کا استعمال کیا ہے۔انحراف میں شامل افسانے بڑے غور و فکر کے بعد قاری کو سمجھ میں آتے ہیں۔

لہر کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''کورٹ مارشل'' کے نام سے شائع ہوا تھا۔۲۲ افسانوں پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ بڑا دلچسپ ہے۔ہر افسانے کا موضوع جدت طراز ہے۔جس میں لہر نے غربت، افلاس، سیاسی بدحالی، جنسی بے راہ روی، رشوت ستانی جیسے موضوعات پر ''سیاہی''، ''سنہرا کفن''، ''کھیر'' اور ''اب تھانہ چل پڑے گا'' جیسے افسانے لکھ کر اردو افسانہ نگاری کے باب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ان کی افسانہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے نامی انصاری لکھتے ہیں:

''آنند لہر پیشے سے وکیل ہیں۔اس لئے بھی ان کے افسانوں کے تانے بانے عموماً چست و درست ہوتے ہیں اور ان میں شاذ و نادر ہی کوئی بھول ہوتی ہے۔وہ ہر موضوع کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا دیتے ہیں۔ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ پامال موضوعات کو نہیں چھوتے بلکہ اپنے افسانوں کے لئے نئے نئے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں۔''

کورٹ مارشل، پیش لفظ ،نامی انصاری، مانوی پرکاش پنج تیرتھی ،جموں ۔۲۰۰۵ء، ص۔۱۲

لہر کا چوتھا افسانوی مجموعہ ۲۰۰۹ء میں ''بٹوارہ'' کے نام سے شائع ہوا۔جس میں کل ۳۴ افسانے شامل ہیں۔اس کا دیباچہ اشرف حسین نے لکھا ہے ۔بٹوارہ آنند لہر کا خوبصورت افسانہ ہے جس میں انہوں نے تقسیم ہند کے کرب ناک سانحہ کو فن کارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ملک تقسیم ہوا، خونی رشتے بکھر گئے، مائیں بچوں سے محروم ہو گئیں، نئی نویلی دلہنوں کے سہاگ لٹ گئے، بھائی اور بہن کا بندن ٹوٹ گیا۔وہ لوگ جنہیں بٹوارے کا شوق تھا ان کے ہاتھ آخرکار پچھتاوے کے سوا کچھ نہ آیا۔افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''صاحب میرا بچہ بیمار ہے۔''

''تو کیا کریں۔۔۔۔۔؟''

''صاحب سرحد سے دوائی منگوانی ہے۔اگر انسانیت کے ناطے ہو سکے۔''

اس طرف کے سپاہی نے دوسری طرف کے سپاہی کے ساتھ بات کی۔فقیر چند کی دوائی سپاہی نے اس طرف کے سپاہی کو دی مگر سائیں پھکوڑ زور سے ہنسا۔

''کیوں ہنستے ہو۔۔۔۔۔؟'' سائیں پھکوڑ سے ساتھ والے شخص نے پوچھا۔

''یہ راج دین اس وقت بٹوارے کے حق میں بڑے نعرے لگا رہا تھا۔کیا اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے بیٹے نے بیمار ہونا ہے اور فقیر چند

# آنند لہر حیات وخدمات

## خالد محمود

جموں وکشمیر کا سرحدی ضلع پونچھ زمانہ قدیم سے علم وادب کا گہوارہ رہا ہے۔اس سرزمین نے محمد دین فوق، کرشن چندر، چراغ حسن حسرت، ٹھاکر پونچھی ،بلراج بخشی ،شیخ محمد عبداللہ عرف پاپا میاں اور پرتپال سنگھ بیتاب جیسی شخصیات کو جنم دیا ہے، جواردوادب کے افق پر درخشاں ستارے بن کر چمکے۔اسی سرزمین نے اردوادب کے ایک اور مایہ ناز سپوت جسے ادبی دنیا آنند لہر کے نام سے جانتی ہے کو جنم دیا۔آنند لہر کا اصل نام شیام سندر تھا آنند ان کی ذات ہے جبکہ لہران کا قلمی نام ہے۔آنند لہر کی پیدائش ۲ جولائی ۱۹۵۲ء میں پونچھ کے ایک محلہ سرائے میں ہوا۔ان کے آباواجداد کا تعلق پونچھ کے ایک سرحدی گاؤں سٹیھڑا سے تھا جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے قبضے میں چلا گیا۔لہر کے آباواجداد نے حالات سے متاثر ہوکر وہاں سے ہجرت کر کے پونچھ شہر میں مستقل سکونت اختیار کی۔لہر کے والد کا نام بلراج آنند اور والدہ کا سمتری دیوی تھا۔آنند لہر کے کل دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔بڑے بھائی جن کا نام شیورتن آنند تھا نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری مکمل کی تھی لیکن بد قسمتی سے عالم شباب میں ۲۴ سال کی عمر میں ہی ان کا انتقال ہو گیا۔چھوٹے بھائی جن کا نام شتیل کمار آنند تھا وہ محکمہ مال میں تحصیلدار کے عہدے پر فائز رہے۔ریشمی نندہ اور ببلی ان کی دو بہنیں تھیں جن میں سے ببلی صرف دو سال کی عمر میں انتقال کر گئی۔لہر کی بیوی کا نام نیلم آنند ہے جن کے آباواجداد کا تعلق مہنڈر پونچھ سے تھا۔نیلم آنند ایک خوش اخلاق اور تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔انہوں نے کچھ عرصے تک بینک میں ملازمت کے فرائض انجام دیے لیکن بعد ازاں گھریلو مصروفیات کی وجہ سے ملازمت ترک کرنی پڑی اور ایک گریلو عورت کی زندگی بسر کرنا شروع کی۔آنند لہر کے والد چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اس لئے انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی۔آنند لہر نے اپنی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری اسکول پونچھ اور مڈل اسکول پونچھ سے حاصل کی۔بارھوں جماعت کا امتحان سائنس کے مضامین میں ہائراسکینڈری اسکول پونچھ سے پاس کیا۔۱۹۷۲ء میں ڈگری کالج پونچھ سے بی۔ایس۔سی کا امتحان پاس کیا۔اعلیٰ تعلیم کے لئے کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔جہاں سے انہوں نے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔ملازمت کا سلسلہ جموں ہائی کورٹ سے شروع ہوا۔آنند لہر ایماندار اور صاف ذہن کے انسان تھے۔بنیادی طور پر بڑے محنتی اور جفاکش تھے یہی وجہ ہے کہ بہت کم عرصے میں دہلی سپریم کورٹ میں بھی وکالت کے فرائض انجام دینے لگے اوران کا ریاست کے مشہور وکلا میں شمار ہونے لگا۔آنند لہر کے دو بیٹے تھے۔ان کے بڑے بیٹے اکشے کمار آنند نے جموں یونیورسٹی سے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی تھی اور جموں ہائی کورٹ میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا لیکن ۱۸ جنوری ۲۰۱۱ء کی شام کو وہ آنند لہر کو داغِ مفارقت دے کر دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔پسماندگان میں ان کا ایک بیٹا سدھارتھ آنند اور ایک بیٹی روہنی آنند ہے۔سدھارتھ آنند کے ساتھ احقر کو دو تین مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔آنند لہر کی شخصیت اور ان کے خاندانی حالات کے متعلق کچھ چیزیں دریافت کرنے کے لئے ان کے گھر جانا ہوا جہاں ان کے رویے کو دیکھ کر دل رنجیدہ ہوا وہیں اس بات کا بھی احساس ہوا کہ آنند لہر نے اردوادب کے جس ذخیرے کو خونِ جگر سے تخلیق کیا تھا اس کی اہمیت ان کی نظروں میں ایک پھوٹی کوڑی کے برابر بھی نہیں ہے۔

آنند لہر بڑے خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھے۔ہر کسی سے خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔چہرے پر ہر وقت مسرت وشادمانی کے آثار نمایاں رہتے تھے۔عاجزی وانکساری ان کا شیوہ تھا۔طالب علمی کے زمانے میں ان کو کئی طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان تمام کے باوجود انہوں نے اپنا مشن جاری رکھا۔۱۹۷۳ء میں ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد جموں ہائی کورٹ میں وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔

آنند لہر کو اردوادب سے گہری دلچسپی تھی۔طالب علمی کے زمانے سے ہی انہوں نے لکھنا شروع کر لیا تھا۔لہر جب گورنمنٹ ڈگری کالج پونچھ میں زیر تعلیم تھے تو اس وقت انہوں نے کالج میں ہونے والے مختلف پروگراموں میں سیکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔شروع میں غزلیں کہنی شروع کیں لیکن اس میدان میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کرسکے تو نثر کی طرف رخ کیا۔

آنند لہر اردوادب کے ایک بلند پایہ ناول نگار، افسانہ نگار اور ڈراما نگار تھے۔انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں اور آزاد نظموں کا ایک مجموعہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔لیکن شاعری کے میدان میں انہیں زیادہ پزیرائی حاصل نہ ہوسکی اس لئے انہوں نے اپنے جذبات کی عکاسی کرنے کے لئے نثر کا انتخاب کیا اور عمر بھر اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود بڑی جانفشانی سے اس چمن کی آبیاری کرتے رہے۔سپریم کورٹ کا ایک نامور وکیل ہونے کے ناطے ان کی مصروفیات سے کسی کو کوئی انکار نہیں تھا لیکن اردوادب سے ان کی گہری محبت کا نتیجہ تھا کہ ان تمام مصروفیات کے باوجود انہوں نے اردوادب کی بے لوث خدمت کی۔کالج کی

| | | |
|---|---|---|
| خالد محمود | آنند لہر حیات وخدمات | ۱۴۱ |
| محمد ارشد القادری | اقبال مجید کی ناول نگاری | ۱۴۴ |
| نور صبا | قرۃ العین حیدر کے ناولٹ ''چائے کے باغ'' کا تنقیدی تجزیہ | ۱۴۷ |
| مانو | علی باقر: حیات وخدمات | ۱۵۱ |
| مہناز کوثر | فدا راجوری کی کشمیری شاعری اور ان کی ادبی خدمات | ۱۵۴ |
| انعام اللہ | جگن ناتھ آزاد اقبالیات کے آئینے میں | ۱۵۶ |
| محمد صدیق | حضرت بابا غلام علی شاہ بادشاہؒ اور ان کے معاصر مشائخ سادات گیلانیہ پونچھ میں | ۱۵۹ |
| عبدالوحید خان | خواجہ احمد عباس کی کہانیوں میں مساوات کا درس | ۱۶۴ |
| ناہید سرور | سوشل ورک اور ایجزم (عمر پرستی) | ۱۶۸ |
| طارق احمد بٹ | کشمیری لوک ادب۔ دانشمندی کا خزینہ | ۱۷۲ |
| مشتاق احمد خان | عقیدتی کلام اور گلشن بدرنی بحیثیت عقیدتمند | ۱۷۵ |
| سوشیل کمار | ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی سوانحی خدمات: ایک جائزہ | ۱۷۶ |
| صوفی سمیرا | جدیدیت اور مابعد جدیدیت: انحراف وانجذاب کے مختلف دائرے | ۱۸۰ |
| عظمت حسین | دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی فارسی خدمات: ایک تعارفی مطالعہ | ۱۸۳ |
| ڈاکٹر عبدالمجید | گوجری ادب کا آغاز وارتقاء | ۱۸۵ |
| ڈاکٹر بشریٰ بانو | ترقی پسند ادبی تحریک | ۱۸۷ |
| صفی الرحمن | جیلہ ہاشمی کے ناولوں میں معاشرتی اقدار و کشمکش | ۱۹۱ |
| تہنیت فاطمہ | عبدالستار صدیقی بحیثیت مکتوب نگار | ۱۹۴ |
| اے۔آر۔منظر | اقبال مجید کے ناولوں کا عصری شعریات | ۱۹۷ |
| برکت علی لٹو | کشمیری مراثی میں فارسی عناصر کا ورود | ۱۹۹ |
| محمد اسلم | انور جلالپوری بحیثیت ترجمہ نگار | ۲۰۲ |
| ڈاکٹر پرشوتم پال سنگھ | منشی پریم چند اور منگل سوتر: ایک جائزہ | ۲۰۵ |
| ڈاکٹر رافیعہ اختر | جموں وکشمیر میں سفرنامے کی روایت | ۲۰۸ |

sabaqeurdu.com
ISSN-2321-1601
UGC.CARE.LISTED.MONTHLY JOURNAL

ستمبر ۲۰۲۲

سبق اردو
78

REDMI NOTE 8 PRO
AI QUAD CAMERA
27/07/2023 14:02
CamScanner

مشکلات کا نفسیاتی اظہار کیا ہے۔ان کے افسانے روایتی افسانوں کی روش سے ہٹ کر ہیں۔تخلیقات میں ایسا علامتی انداز اپنایا ہے جس کو سمجھنا عام قاری کے لئے دشوار ہے۔ان کے افسانے نقب زن، بدوشک کی موت، جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں، تلقارمس اور ڈرائنگ روم تجریدی افسانوں کی بہترین مثال ہیں۔

آصف اقبال ان کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''تلقارمس کا پورا نظام تجریدی ہے۔جو قاری کے لئے تفہیم کا مسلہ پیدا کرتا ہے۔چونکہ سریندر پرکاش کا اسلوب اور ان کی کہانی لکھنے کی تکنیک میں نیا پن اور انوکھا پن ہے اس لئے افسانے کا مجموعی تصور بھی انفرادی نقطۂ نگاہ سے توجہ کا طالب ہے۔''

جدید افسانہ، صفحہ۔۱۴۱

تجریدی افسانہ نگاروں میں ایک بڑا نام بلراج مین را کا ہے۔ بہت کم افسانے لکھ کر انہوں نے ادب میں بلند مقام حاصل کیا ہے۔سب سے زیادہ تجریدی افسانے انہوں نے لکھے ہیں۔کل ۱۳۷ افسانے لکھے جن میں سے ایک مہمل کہانی، مقتل، کمپوزیشن سریز اور پورٹریٹ ان بلیک اینڈ بلڈ ایسے افسانے ہیں جو مکمل طور پر تجریدی ہیں۔بلراج مین را نے اپنے افسانوں میں مشینی اور شہری زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ان کے افسانے پیچیدہ اور مبہم ہیں جن کو سمجھنا عام قاری کے بس کی بات نہیں۔انتہائی غور وفکر کے بعد قاری کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔

انور سجاد کا شمار جدید افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ۱۹۵۲ میں افسانہ نگاری کا سفر شروع کیا۔ پہلا مجموعہ ''چوراہا'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''استعارے'' ۱۹۷۰ اور ''آج'' ۱۹۸۲ میں شائع ہوئے۔علامت نگاری میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے اور گہرائی ان کے افسانوں کا وصف ہے۔ان کے افسانوں میں علامت نگاری کے ساتھ ساتھ تجریدیت بھی پائی جاتی ہے۔

غیاث احمد گدی جو ایک علامتی افسانہ نگار ہیں۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بابا لوگ'' ۱۹۶۹ میں شائع ہوا۔ دوسرا ''پرندہ پکڑنے والی گاڑی'' ۱۹۷۷ اور تیسرا ''سارا دن دھوپ'' ۱۹۸۵ میں چھپ کر ادبی دنیا سے داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔ان کے بہت سارے افسانے تجریدی انداز کے ہیں لیکن افسانوی مجموعہ پرندہ پکڑنے والی گاڑی کے بیشتر افسانے تجریدی ہیں۔ ڈوب جانے والا سورج ان کا بہترین تجریدی افسانہ ہے۔

اقبال متین کا شمار حیدر آباد کے مشہور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔اقبال ترقی پسند افسانہ نگار ہیں لیکن دور جدید میں لکھے گئے ان کے بعض افسانے تجریدی ہیں۔تجریدی افسانہ نگاروں میں کلام حیدری کا نام بھی قابل ذکر ہے۔انہوں نے ۱۹۵۵ میں ''بے نام کلیاں'' کے نام سے ایک افسانوی مجموعہ لکھ کر اردو افسانہ نگاروں کی صف میں اپنا نام درج کروایا۔ علامت نگاری، تجریدیت اور وجودیت جیسے رجحانات کا اثر ان کے افسانوں پر واضح نظر آتا ہے۔ان کے افسانے لا، اسیر، اور صفر تجریدی افسانوں کے زمرے میں آتے ہیں۔احمد ہمیش نے قدیم وجدید دونوں طرز کے افسانے لکھے ہیں۔ان کے بعض افسانوں میں علامت اور تجریدیت کے عناصر ملتے ہیں۔

خالدہ اصغر کا شمار اہم تجریدی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ''سواری'' ان کا نمائندہ تجریدی افسانہ ہے۔ بہت کم تجریدی افسانے لکھے لیکن جو لکھے وہ تجریدی رجحان کے بہترین نمونے ہیں۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے رشید امجد کا شمار مشہور افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔بیزار آدم کے بیٹے، ریت پر گرفت، سہ پہر کی خزاں، پت جڑ میں خود کلامی، عکس خیال اور کاغذ کی فصیل ان کے مشہور فسانوی مجموعے ہیں۔ان کے افسانوں میں علامت نگاری خوب پائی جاتی ہے۔ان کے افسانے یہ حوصلہ شکن صورتحال، ناسائی کی مٹھیوں وغیرہ تجریدی افسانے ہیں۔

انور خان کا تعلق ہندستان کے شہر ممبئی سے ہے۔۱۹۷۰ سے افسانے لکھنے شروع کئے۔انہوں نے بھی ''بھیڑیں اور کووں سے ڈھکا آسمان'' جیسے تجریدی افسانے لکھ کر اپنا نام تجریدی افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔

کرناٹک سے تعلق رکھنے والے اکرام بھاگ کا شمار اہم تجریدی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انہوں نے افسانوں میں شاعرانہ انداز استعال کیا ہے۔جا بجا استعاراتی انداز ملتا ہے،جس کی وجہ سے افسانے مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے تعلق سے آصف اقبال لکھتے ہیں۔

''اکرام بھاگ کے افسانے تجریدی اظہار پر مخمول ہوتے ہوئے اپنی اینٹی اسٹوری کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔ان کے افسانے موضوعی محور کے گرد گھومتے نہیں بلکہ ان کے یہاں موضوع کی روایتی بنت سے انحراف ملتا ہے۔''

جدید افسانہ، صفحہ ۱۹۵۔۹۶،

شیام سندر آنند لہر کا تعلق جموں وکشمیر سے ہے۔ آنند لہر مشہور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ مشہور ناول نگار اور ڈراما نگار بھی ہیں۔ان کے پانچ افسانوی مجموعے چھپ کر ادبی دنیا میں مقبول ہو چکے ہیں۔''انحراف'' ان کے تجریدی افسانوں کا مجموعہ ہے۔اس افسانوی مجموعے کے تمام تر افسانے تجریدیت کے بہترین نمونے ہیں۔

شوکت حیات جدید افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے بہت سارے علامتی افسانے لکھے ہیں جن میں تجریدی تکنیک بھی ملتی ہے۔اس کے علاوہ مرزا حامد بیگ، شفیق احمد شفق، حمید سہروردی اور قمر احسن وغیرہ نے بھی علامتی افسانے لکھے ہیں۔کسی بھی رجحان یا تحریک کے اثرات بالکل ختم نہیں ہوجاتے لیکن دور حاضر میں علامتی اور تجریدی افسانوں میں کمی ضرور آئی ہے اور اس وقت بھی کچھ افسانہ نگاروں کے ہاں علامتی کہانیاں مل جاتی ہیں۔عصر حاضر کے افسانہ نگار اپنے سماج سے جڑے تمام تر موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں۔

خالد محمود۔
ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدر آباد
khalidmemood56@gmail.com



AI QUAD CAMERA
27/07/2023 21:16
CamScanner

عصری آگہی، مضمون نیا افسانہ اور اس کے نقاد، صفحہ۔۶۴

۱۹۴۷ کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک نئی نسل نے روایتی افسانوں سے بغاوت کرتے ہوئے دوسروں کی راہ پر چلنے کے بجائے اپنی ایک الگ راہ نکالی اور اپنے ذاتی تجربے کو اہمیت دینے لگے۔ جس سے ادب میں تبدیلی رونما ہوئی اور اس طرح بدلتے ہوئے حالات و واقعات نے ایک نئے نظام اور نئی فکر کو جنم دیا جس کو افسانہ نگاروں نے افسانوں کا موضوع بنایا اس طرح اردو ادب میں تجریدیت کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔

تجریدیت کی تعریف میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لہذا اس بات کو نہ دھراتے ہوئے مختصر ذکر کرتا چلوں کہ اردو کی کئی لغات میں لفظ تجرید کے معنی برہنگی جبکہ تجریدی کے معنی پیچیدہ، خیال اور قیاس وغیرہ بتائے گئے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لئے لفظ abstract مستعمل ہے۔ جس کے معنی ذہنی یا خیالی کے ہیں اردو اور انگریزی کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ''تجرید'' یا ''تجریدیت'' کے لغوی معنی خیالی قیاسی یا برہنگی کے ہیں۔ کسی بھی فن کار کے ذہن میں ایسا خیال جس کو اس نے لفظوں کا جامہ پہنا کر ترتیب نہ دیا ہو تجرید یا تجریدیت کہلاتا ہے۔ اصطلاحی معنوں میں تجرید یا تجریدیت سے مراد کسی تخلیق کار کے ذہن میں پنپنے والے اس خیال سے ہے جس کو ابھی تحریر کی شکل نہ دی گئی ہو

جہاں تک اردو ادب میں تجریدیت کے آغاز کا تعلق ہے اور خاص کر میں اردو افسانے کی بات کروں گا۔ ۱۹۵۵ کے بعد جب اردو ادب میں جدیدیت کا دور شروع ہوا۔ ادیبوں نے کچھ نیا پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں ایسے کئی مغربی رجحانات جنہیں مغربی ادب میں جگہ مل چکی تھی اردو فن کاروں نے بھی برتنے کی کوشش کی۔ اس دور میں جو رجحانات اردو ادب میں آئے ان میں علامت نگاری، پیکریت، اظہاریت، اور سرریلزم وغیرہ کے ساتھ ساتھ تجریدی رجحان اہم تھا۔ اگرچہ تجریدیت کے نقوش ہمیں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور ممتاز شیریں وغیرہ کے ہاں مل جاتے ہیں لیکن اس رجحان کو باضابطہ صورت آزادی کے بعد نئی نسل کے کچھ افسانہ نگاروں نے دی۔ ۱۹۳۲ میں شائع ہونے والے مشہور افسانوی مجموعے ''انگارے'' میں بھی ہمیں کہیں نہ کہیں علامتی اور تجریدی افسانے کے نقوش ملتے ہیں۔ یہ دراصل روایتی افسانے کے خلاف پہلا قدم تھا۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ تجریدی اور علامتی افسانے میں واضح فرق ہے۔ دراصل تجرید تکنیک اور علامت نگاری ایک اسلوب ہے۔ جو الگ الگ دو رجحان ہیں اور اردو ادب میں ایک ساتھ آنے کی وجہ سے مشکوک ہوگئے ہیں۔ کچھ تجریدی افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں میں علامتوں کا استعمال کیا ہے لیکن اس سے ان دو رجحانات کو آپس میں خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں۔

''تجریدی افسانہ ہمارے افسانے کے اس سفر کی نشاندہی کرتا ہے جس کا رخ خارج سے داخل کی طرف ہے۔ یہ انسان کے ذہنی مسائل اس کے کرب اور حقیقت کے عرفان کی تلاش کا اظہار ہے۔ صرف فکر یا ذہنی سوچ کی سطح پر افسانہ علامتی ہو یا تجریدی اس میں لغوی معنی صرف ایک طرح کا اشارہ کر دیتے ہیں۔ باقی کام پڑھنے والے کی استعداد کا ہے۔''

اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ گوپی چند نارنگ، صفحہ ۱۰۲

تجریدی افسانے میں خارجی دنیا کے بجائے باطن پر توجہ دی جاتی ہے اس میں انسان کی داخلی اور نفسی کیفیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ تجریدیت اور علامتیت جدید افسانے کے بنیادی رجحان ہیں۔ جدید افسانہ نگاروں نے پلاٹ پر حملہ کر کے افسانے کی ترتیب کو بدل دیا۔ انور سجاد، بلراج مین را، سریندر پرکاش، احمد ہمیش، رشید احمد اور خالدہ اصغر وغیرہ نے پلاٹ کے بغیر افسانے لکھے۔ جس سے عام قاری الجھن کا شکار رہا۔

جہاں تک اردو میں تجریدی افسانے کے آغاز کا تعلق ہے تو یہ بات سچ ہے کہ مکمل طور پر اردو افسانہ نگاری میں تجریدیت کا آغاز ۱۹۶۰ کے بعد ہوتا ہے تاہم اس سے قبل کے افسانہ نگاروں کے افسانوں میں بھی تجریدی عناصر مل جاتے ہیں۔ تجریدیت کا رجحان ہمیں کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور ممتاز شیریں وغیرہ کی بعض کہانیوں میں مل جاتا ہے۔ لیکن اس رجحان کو باضابطہ صورت آزادی کے بعد نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے دی جن میں بلراج مین را، دیویندر راسر، سریندر پرکاش، انور سجاد، بلراج کومل، کمار پاشی، انتظار حسین، احمد ہمیش، انور عظیم اور قمر احسن کے نام قابل ذکر ہیں۔

انگارے میں روایت سے ہٹ کر افسانے لکھے گئے اس لئے اس افسانوی مجموعے میں بھی تجریدی نقوش مل جاتے ہیں۔ سعادت حسن منٹو جن کو جدید افسانوں کا نقش اول مانا جاتا ہے۔ ان کے کچھ افسانوں میں بھی تجریدی افسانوں کے نقوش ملتے ہیں۔ جمال آرا نظامی لکھتے ہیں کہ کرشن چندر، منٹو اور بیدی جیسا کوئی تجرید نگار نہیں گزرا۔ قرۃ العین حیدر جو کہ ترقی پسند تحریک کی اہم افسانہ نگار ہیں ان کے افسانے ''ایک مکالمہ'' اور ''یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے'' میں تجریدی عناصر مل جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ انور عظیم، جوگندر پال اور اقبال مجید کے افسانوں میں بھی تجریدی رنگ نظر آتا ہے۔

رتن سنگھ کے افسانوں میں جدید رجحانات پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں علامتوں کے ساتھ ساتھ تجریدی تکنیک کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے افسانے بابو، نقلی اور اصلی، جس تن لاگے، میلی گھڑی، زندگی سے دور، یو ماسٹر اور خدا انہیں آتا وغیرہ تجریدی افسانے ہیں۔

سریندر پرکاش کو اردو افسانہ نگاری میں بلند مقام حاصل ہے۔ تجریدی افسانہ نگاروں میں ان کا نام اہم ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے دوسرے آدمی کا ڈرائنگ رام، بازگوئی، برف پر مکالمہ، حاضر حال جاری وغیرہ ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں نئے تجربات کو برتا ہے۔ تجریدیت، ابہام اور علامت نگاری کو انہوں نے اپنی تخلیقات میں خوب برتا ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کے حالات و


REDMI NOTE 8 PRO
AI QUAD CAMERA
27/07/2023 21:16
CamScanner

# جدید اردو افسانہ اور تجریدیت

خالد محمود

اردو ادب میں افسانے کا آغاز انیسویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ دراصل کہانی سننا اور سنانا زمانہ قدیم سے ہی انسان کا محبوب مشغلہ رہا ہے۔ قصہ اور کہانی کا سلسلہ داستان سے شروع ہو کر آج افسانچے تک پہنچ چکا ہے۔ جوں جوں انسان نے ترقی کی منازل طے کیں اس کی مصروفیات دن بدن بڑھتی گئیں۔ زمانہ قدیم میں جہاں وقت گزاری کے ذریعے تلاش کیے جاتے تھے وہیں دور حاضر میں انسان اس تگ و دو میں ہے کہ مصروفیات کے اس عالم میں کس طرح سے وقت کا جائز استعمال کیا جائے۔ جوں جوں انسان تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوتا گیا اس کا یقین فوق فطری قصوں اور کہانیوں سے اٹھتا گیا اور وہ ادب میں ایسی چیزوں کا متلاشی ہوا جو حقیقی زندگی کی ترجمانی کر سکیں۔ وقت کی قدر و منزلت کے پیش نظر جب داستانیں اپنی اہمیت کھونے لگیں تو اسی کی کوکھ سے ناول نے جنم لیا اور اس طرح یہ سلسلہ ناول اور افسانے سے ہوتا ہوا افسانچے تک پہنچا۔

داستان ناول اور افسانے کے فن پہ چونکہ اردو ادب کے قد آور محقق اور نقاد سیر حاصل بحث کر چکے ہیں اس لئے زیادہ طوالت میں نہ جاتے ہوئے میں اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میرا مقصد چونکہ جدید افسانہ اور تجریدیت پر بحث کرنا ہے اس لئے میں یہ ذکر کرتا چلوں کہ اردو ادب میں مختصر افسانے کا آغاز انیسویں صدی کی ابتدا میں ہوا اور راشد الخیری نے ۱۹۰۳ء میں نصیر اور خدیجہ کے نام سے ایک افسانہ لکھ کر اس میدان میں پہل کی۔ بعض لوگ پریم چند کو پہلا افسانہ نگار تسلیم کرتے ہیں لیکن پریم چند نے چونکہ ۱۹۰۸ء میں اپنا پہلا افسانہ لکھا ہے اور اس سے پہلے راشد الخیری نصیر اور خدیجہ کے عنوان سے افسانہ لکھ چکے تھے اس لئے اردو افسانے کے میدان میں اولیت کا شرف انہیں ہی حاصل ہے۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند نے اس صنف کو بام عروج تک پہنچایا۔ اس کے بعد سجاد حیدر یلدرم نے کئی کامیاب افسانے لکھ کر اس صنف کو فروغ دیا

۔ان کے علاوہ بیدی، کرشن چندر، منٹو، عصمت چغتائی اور قراۃ العین حیدر جیسے فن کاروں نے افسانے کی پلکوں کو سنوارا۔ اسی دوران ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوتا ہے جس کے زیر اثر اردو افسانے کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں افسانوی مجموعہ ''انگارے'' شائع ہوا جسے بغاوت سمجھ کر ضبط کیا گیا۔ انگارے میں ادیبوں نے روایت سے بغاوت کرتے ہوئے افسانے لکھے۔ ترقی پسند تحریک کے دوران اردو افسانہ خوب پروان چڑا۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندستان آزاد ہوا تو

اس کے بعد ترقی پسند تحریک دم توڑنے لگی اور اسی کے ساتھ تقسیم ملک کا کرب ناک سانحہ بھی پیش آیا۔ جس سے لوگوں میں خوف و حراس، رنج و الم اور مایوسی کی ایک لہر پھیل گئی ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ خونی رشتے بکھر گئے۔ ایسے میں جہاں فن کاروں کو بہت سارے موضوعات ہاتھ لگ گئے وہیں ترقی پسند تحریک کے زیر اثر افسانے لکھنے والے ادیبوں کو محدود و متعین راہوں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس تحریک کے زیر اثر چونکہ ایک واضع مقصد کی حصولیابی کے لئے ادب تخلیق کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ ایسے میں فن کاروں کی ایک ایسی جماعت ابھر کر سامنے آئی جس نے روایت سے بغاوت کو اپنا مقصد سمجھا۔ نیا ذہن اور نئی فکر و سوچ رکھنے والی یہ نسل اپنی الگ راہ نکالنا چاہتی تھی۔ اسی نئی نسل نے اردو ادب میں جدیدیت کے لئے راہیں ہموار کیں اور ۱۹۵۵ء کے بعد نئے موضوعات پر نئی فکر کے ساتھ جدید افسانے لکھے جانے لگے اور ۱۹۶۰ء سے ان کی باقاعدہ اشاعت بھی ہونے لگی۔ جدیدیت نے اردو افسانے کو نئے موضوعات اور نئی فکر سے روشناس کروایا اور ایک نئی راہ دکھائی۔ جدیدیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری لکھتے ہیں۔

''جدیدیت دراصل ترقی پسند تحریک کی نفی کرتے ہوئے فرد کی داخلی کرب کا اظہار تھا۔ جس میں خارجیت سے داخلیت، افراد سے فرد، شور و غل سے خاموشی، بھیڑ سے تنہائی کی طرف سفر تھا۔''

جدیدیت اور اردو افسانہ، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، صفحہ۔۹

جدیدیت کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانوں میں روایت سے بغاوت کی گئی۔ روایتی افسانوں کی طرح اس میں اجزائے ترکیبی کو اہمیت نہ دی گئی۔ علامت نگاری، پیچیدہ پلاٹ، تجریدیت، اینٹی پلاٹ، شعور کی رو کی تکنیک، فلیش بیک تکنیک وغیرہ جدید افسانے کی اہم خصوصیات ہیں۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے جنگ، دہشت، لادینیت، اور ٹوٹتے بکھرتے رشتے اہم موضوع رہے ہیں۔ جدید افسانے میں روایتی افسانے کی طرح آغاز، عروج، انجام اور پلاٹ کو کوئی ترجیح نہیں دی گئی۔ جدید افسانہ نگاروں نے پلاٹ پر حملہ کرتے ہوئے افسانے کی ترتیب کو بدل دیا۔ جدید دور کے افسانوں کا ذکر کرتے ہوئے وہاب اشرفی یوں رقم طراز ہیں۔

''عصری حسیت کا بگل بج گیا، قدریں ریزہ ریزہ ہو گئیں، رشتہ داریاں پارہ پارہ ہو گئیں، اجتماعی تجربے اوندھے منہ گر گئے، انفرادی تجربے مہک اٹھے، افسانہ نگار اپنی ذات کی تلاش میں کولمبس بن گیا، ماجرا نے رخصت لے لی، تلازمے ایک بات سے دوسری بات تک پہنچنے کی سیڑھی بن گئے۔ اور جب یہ سب ہو چکا تو نئے افسانہ نگاری کی شناخت بھی ممکن ہو گئی۔''



AI QUAD CAMERA 27/07/2023 21:16
CamScanner

# سبق اردو

اگست ۲۰۲۲

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر : ڈاکٹر محمد سلیم | سرنامۂ سرورق : عادل منصوری | جلد : ۷ | شمارہ : ۸
موبائل: 9696486386 | سرورق : دانش الہ آبادی | Net Banking:SABAQ -E-URDU( MONTHLY)
واٹس ایپ: 9919142411 | کمپوزنگ : دانش الہ آبادی، اہل قلم | IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214
sabaqeurdu@gmail.com | مطبع: عظیم انڈیا پریس، گوپی گنج، بھدوہی | Bank of Baroda, Branch: Gopiganj
فی شمارہ: -/200، زرتعاون: -/1000 زرتعاون خاص: -/2000، اعزازی تعاون: -/5000 | Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کی سنوائی صرف ضلع س۔ر۔ن۔(بھدوہی) ہی کی عدالت میں ہوگی۔ ادارہ

چیف ایڈیٹر ڈاکٹر دانش الہ آبادی

| | | |
|---|---|---|
| پروفیسر زیبا محمود | کوئی مشکل فکر کامل کے لئے مشکل نہیں | ۵ |
| محمد سعود عالم | پیغام آفاقی بحیثیت ناول نگار | ۹ |
| عبدالحی | رسالہ شاعر اور اس کا افتخار یا افتخارِ 'شاعر' | ۱۳ |
| ڈاکٹر فیضان حسن ضیائی | شاہد جمیل کے دوہے | ۱۷ |
| نور افشاں پروین | اردو ناولوں میں دلت مسائل ('دویہ بانی' کے خصوصی حوالے سے) | ۲۱ |
| ڈاکٹر ساجد حسین انصاری | ادبی صحافت کا بے باک قلم کار.......ابرار رحمانی | ۲۴ |
| محمد شفیع وانی | کشمیری لوک شاعری میں احتجاج اور عورت | ۲۵ |
| ڈاکٹر حمیرہ جان | کشمیری صوفی شاعری؛ تاریخی پسِ منظر، فن اور اہمیت | ۲۹ |
| ڈاکٹر نصرت بشیر | لل دید: فکر اور فن | ۳۲ |
| محمد غفران برکاتی | قومی تعلیمی پالیسی 2020 اور مادری زبان میں تعلیم: مسائل و امکانات | ۳۵ |
| خالد محمود | جدید اردو افسانہ اور تجریدیت | ۳۸ |
| روشن پروین | مولانا ابوالکلام آزاد کا صحافتی سفر | ۴۱ |
| ڈاکٹر الف ناظم | اردو شاعری کی حضرت محل: ڈاکٹر سید شگفتہ غزل | ۴۳ |
| ثنا خان علیگ | شمس الرحمان فاروقی کی علمی و ادبی کاوشیں | ۴۴ |
| محمد رضا | ''لہو کے پھول'' تحریک آزادی کی دستاویز | ۴۷ |

sabaqeurdu.com
ISSN-2321-1601
UGC CARE LISTED MONTHLY JOURNAL

AUGUST 2022
اگست ۲۰۲۲

77

نومنتخب صدر جمہوریہ ہند محترمہ دروپدی مرمو اور وزیر اعظم شری مودی جی

اپنے پیغام میں وزیر اعظم مودی جی نے کہا کہ "پوری قوم نے مسز دروپدی مرمو کو بھارت کی صدر کے طور پر حلف لیتے ہوئے دیکھا۔ ان کا صدر کا عہدہ سنبھالنا بھارت خصوصاً غریبوں، محروموں اور پسماندہ طبقات کے لیے ایک تاریخی لمحہ ہے۔ میں ان کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتا ہوں۔"

SL. No.: 16371

# UNIVERSITY OF HYDERABAD

P.O. CENTRAL UNIVERSITY, HYDERABAD - 500 046 (INDIA)

EXAMS BRANCH

## PROVISIONAL CERTIFICATE CUM CONSOLIDATED GRADE TRANSCRIPT

Student Registration Number : 17HUHL16

This is to certify that KHALID MEMOOD son/daughter of KHADIM HUSSAIN/RESHAM BI has been declared qualified for the award of the degree of M.Phil. Urdu after having passed the prescribed courses as follows:

| Course No. | Title of the Course | Letter Grade Awarded | Credits | Month & Year of Passing |
|---|---|---|---|---|
| | **Semester : 1** | | | |
| UR701 | Research Methodology | B+ | 4.00 | Nov 2017 |
| UR702 | Practical Criticism | A | 4.00 | Nov 2017 |
| UR721 | Textual Criticism | B | 4.00 | Nov 2017 |
| | **Semester : 2** | | | |
| UR751 | Pre-Submission Seminar | B+ | 2.00 | Apr 2019 |
| UR752 | Supervisors Evaluation | A | 4.00 | Apr 2019 |
| UR753 | Ext.Examiners Evaluation | A | 4.00 | Apr 2019 |
| UR754 | Viva Voce Examination | A+ | 2.00 | Apr 2019 |

S : Supplementary I : Improvement R : Repeat

Cumulative Grade Point Average (CGPA) : 8.50 ( EIGHT POINT FIVE ZERO)

Division : First Division with Distinction Percentage : 81.25

Final result declared on : 30-Apr-2019

Date : 03-May-19

Hyderabad

Prepared By

Checked By

Controller of Examinations
University of Hyderabad

CONTROLLER OF EXAMINATIONS

REDMI NOTE 8 PRO
AI QUAD CAMERA
27/07/20

CamScanner

| | | | | |
|---|---|---|---|---|
| 22. | 12SIPD02 | Neikesonuo Rame | Indian Diaspora | UoH (Indian Diaspora) |
| 23. | 10SIPD02 | Subhadeep Kumar | Indian Diaspora | UoH (Indian Diaspora) |
| 24. | 10SRPR01 | Joby Mathew | Regional Studies | Mahatma Gandhi University (General Social Sciences) |
| 25. | 14HEPH01 | Krishanu Adhkari | English | EFLU (English) |

9/11/20

**Deputy Registrar**
**(Acad & Exams)**

To
All Students Concerned

Copy to:
1. Dean, School of Economics
2. Dean, School of Social Sciences
3. Dean, School of Humanities
4. Head, Department of English
5. Head, Department of Philosophy
6. Head, Department of Anthropology
7. Head, Department of Urdu
8. Head, Centre for Indian Diaspora
9. Head, CSSEIP
10. Head, Department of History
11. Head, Centre for Regional Studies
12. Academic Section (SO)
13. E-Governance (Cell)

REDMI NOTE 8 PRO
AI QUAD CAMERA
27/07/2023 14:07
CamScanner

HOD URDU
CDZT14687
11/11/2022

**UNIVERSITY OF HYDERABAD**
**P.O. Central University, Hyderabad-500046, India**

O/o the Controller of Examinations
Examinations Section

Ref.No.UH/Exam/CW/Ph.D/2022 726

Date: 09.11.2022

**OFFICE ORDER**

Sub: Request for exemption of Ph.D. coursework.
Ref: 1. Request received from the Schools-Reg.
2. UH/Exams/PHD/2022, dt. 13.10.2022
3. PVC approval dt. 09.11.2022

xxx

With reference to the requests received from the Schools as cited in the subject mentioned above, the following students are exempted from Ph.D. coursework with reference to (2) cited above and further recommendations of the DRC/RAC of the respective schools and approval of Competent Authority cited above. This is in view of the fact that they have already completed the required course work as per 2009/16 UGC Regulations during their M.Phil. course.

| **S.No** | **Enroll** | **Student** | **Subject** | **Name of the Institute (M.Phil awarded)** |
|---|---|---|---|---|
| 1. | 18HUPH06 | Khalid Memood | Urdu | UoH (Urdu) |
| 2. | 19HUPH12 | Javaid Ahmed | Urdu | UoH (Urdu) |
| 3. | 14SEPH07 | Aaula Dastageer | Economics | UoH (Economics) |
| 4. | 19SHPH02 | Chitran D | History | UoH (History) |
| 5. | 19HUPH02 | Riyaz Ahmad Najar | Urdu | UoH (Urdu) |
| 6. | 19HUPH01 | Gulzar Ahmad Magray | Urdu | UoH (Urdu) |
| 7. | 19HUPH10 | Gulnara Khatoon | Urdu | UoH (Urdu) |
| 8. | 16HEPH04 | Asima Baral | English | UoH (English) |
| 9. | 17SAPH04 | R Archana | Anthropology | UoH (Anthropology) |
| 10. | 15SIPH02 | Ghadage Tushar Madhukar | Social Exclusion & Inclusive Policy | UoH (Anthropology) |
| 11. | 16HEPH03 | Rameesa P M | English | Madurai Kamaraj University (English) |
| 12. | 21HEPH05 | Medi Chaitanya | Philosophy | UoH (Philosophy) |
| 13. | 14SHPH06 | Anand Damodaran | History | UoH (History) |
| 14. | 16SHPH05 | Saptarshi Deb | History | UoH (History) |
| 15. | 16SHPH08 | Ranjita Badaseth | History | UoH (History) |
| 16. | 18SHPH01 | Shameer T A | History | UoH (History) |
| 17. | 18SHPH02 | Neha Gautam | History | UoH (History) |
| 18. | 18SHPH05 | Mir Kamruzzaman Chowdhary | History | UoH (History) |
| 19. | 19SHPH06 | Kasala Jashwanth Prasad | History | UoH (History) |
| 20. | 16SIPD04 | Shazia Khan | Indian Diaspora | UoH (Indian Diaspora) |
| 21. | 11SIPD02 | Bidyalaxmi Devi Elangbam | Indian Diaspora | UoH (Indian Diaspora) |

Office

P.T.O

REDMI NOTE 8 PRO
AI QUAD CAMERA
27/07/2023 14:07
CamScanner

AS PER THE UNIVERSITY POLICY, ANTI-PLAGIARISM SCREENING IS NOT REQUIRED FOR THE REGIONAL LANGUAGES

Librarian
Indira Gandhi Memorial Library
UNIVERSITY OF HYDERABAD
Central University P.O.
HYDERABAD-500 046.

# *DECLARATION*

I **KHALID MEMOOD** hereby declare that this dissertation entitled **"ANAND LEHAR BA HASIYET FICTION NIGAR"** submitted by me under the guidance and supervision of **Dr,ARSHIA JABEEN,** is a bonafide research work which is also free from plagiarism and has not been submitted previously in part/full to this or any other University/Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodganga/INFLIBNET.

**Date_________________**

**Signature of theStudent**

***Khalid Mehmood***

**Reg. No. 18HUPH06**

Date: / /

# CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"ANAND LEHAR BA HASIYET FICTION NIGAR"** submitted by **KHALID MEMOOD** bearing Reg. No**. 18HUPH06** in partial fulfillment of the requirements for the award of Doctor of Philosophy in **URDU** in the School of Humanities is a bonafide work carried out by him under my supervision and guidance.

This thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part/full to this or any other University/Institution for the award of any degree or diploma.

**A. Papers published in the following journals.**

1. Jadeed Urdu Afasana aur Tajreediyet (Sabaq e Urdu –ISSN- 2321-1601)
2. Anand Lehar Hayat O Khidmat (Sabaq e Urdu –ISSN- 2321-1601)

**B. Papers presented in the following Conferences.**

1. "Anand Lehar ke Novelon Main Hindustani Tehzeeb " in Two-day National Seminar on "Urdu Adab Mein Hindustani Anasir,1947 Ke Baad" Conducted by Department of Urdu (HCU) on 9th – 10th February, 2022.
2. "Ikeesvien Sadi Ke Urdu Adab Mein Trajam Ki Ahmiyat O Afadiyat" in Two-day National Seminar on "Urdu Translation in Modern Era :Significance,Problems and Prospects" Conducted by Department of Urdu (HCU) on 6th& 7thMarch, 2023.

Further, the student was exempted from doing coursework (recommended by Doctoral Committee) on the basis of the following courses passed during his M.Phil program and the M.Phil degree was awarded.

| SL No. | Course Code | Title | Credits | Grade | Pass/Fail |
|---|---|---|---|---|---|
| 1 | UR 701 | Research Methodology | 4.00 | B+ | Pass |
| 2 | UR702 | Practical Criticism | 4.00 | A | Pass |
| 3 | UR721 | Textual Criticism | 4.00 | B | Pass |
| 4 | UR780 | Dissertation | 12.00 | B+ | Pass |

**Supervisor** **Head of the Department** **Dean School of Humanities**

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

# ANAND LEHAR BA HASIYET FICTON NIGAR

## Abstract

## For Doctor of Philosophy In Urdu

## By


KHALID MEMOOD

(ENROLMENT NO:18HUPH06)


SUPERVISOR


Dr.ARSHIA JABEEN

ASSOCIATE PROFESSOR,DEPARTMENT OF URDU

UNIVERSITY OF HYDERABAD


UNIVERSITY OF HYDERABAD
हैदराबाद विश्वविद्यालय


DEPARTMENT OF URDU ,SCHOOL OF HUMANITIES

UNIVERSITY OF HYDERABAD ,GACHI BOWLI

HYDERABAD,TELANGANA-500046


JULLY-2023